قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

www.urducouncil.nic.in

جنوری 2025 قیمت 25₹

یوم جمہوریہ مبارک

ماہنامہ اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچوں کا کتب خانہ

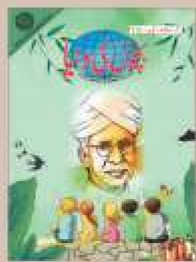

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے   سالانہ: 145 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِ تعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 A/C: ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
نئی دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:27، شمارہ:1، جنوری 2025

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالباری
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین : عبدالرشید اعظمی، شاداب شمیم

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
سالاسار امیجنگ سسٹمس
A-97، سیکٹر 58، نوئیڈا۔ 201301 (یو پی)

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/25 روپے سالانہ -/240 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ:110-7-22تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔ 500002
فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ
- ہماری بات 4

خطوط
- ربط و التفات قارئین کے خطوط 5

سمینار رپورٹ
- معاصر اردو ادب کا تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی منظرنامہ شہلا کلیم 7

ادب زاویے اور جہات
- اردو غزل میں نظام شمسی ای آر محمد عادل 14
- تنقید کی زبان شاہد وصی 19
- بہار کے اردو ناولوں میں شہری زندگی کی عکاسی محمد معراج عالم 22
- مخطوطہ شناسی اور ادبی تحقیق امتیاز احمد 25

زبان و تعلیم
- علم اللغات اور لفظ اصلیات گیان چند جین 29
- طلبا کی تعلیم پر گھر اور اسکول کے ماحول کا اثر شفاعت احمد 32

روشن مینار
- ہندوستانی ادب کے معمار مہاکوی سبرامنیم بھارتی طیب خرادی 35

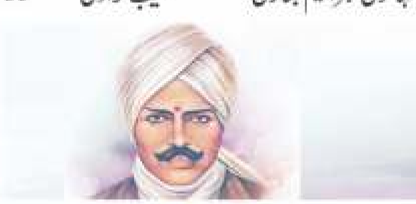

تمل ادبیات و اقدار
- اہل تمل میں غالب شناسی: کلام غالب کے تمل تراجم کے حوالے سے امان اللہ 37
- تمل ادب کا شاہکار 'ترو کرل' میں درس اخلاقیات عائشہ صدیقہ جے 41

شخصیات
- اعزاز افضل: دبستانِ بنگال کا منفرد شاعر شہاب ظفر اعظمی 44
- ڈپٹی نذیر احمد آثار و افکار محمد آدم 48

تہذیب و تاریخ
- قدیم ہندوستان کی دریافت اے ایل باشم ایس غلام سمنانی 53
- لکھنؤ کے عمارات و باغات مرزا جعفر حسین 56

خراجِ عقیدت
- عبدالغنی شیخ کے افسانوں میں لداخ کی تہذیب و معاشرت محمد شریف 58

فلم
- کے آصف کا فلمی سفر انارکلی سے مغل اعظم تک منتظر قائمی 62

نیا آسمان نئے ستارے
- جلال لکھنوی کی غیر مطبوعہ داستان بالا باختر ایک تعارف محمد سعید اختر 65

- اکبر الہ آبادی کی شاعری میں مشرق کا تصور امیر حسن 69

کتابوں کی دنیا
- تعارف و تبصرہ ادارہ 71

خبر نامہ
- اردو دنیا کی خبریں ادارہ 80

ہماری بات

یہ نہایت فخر اور مسرت کی بات ہے کہ 11 دسمبر کو تمل زبان کے ایک عظیم مصنف، شاعر، صحافی اور مجاہد آزادی کے یوم پیدائش کی مناسبت سے پورے ملک میں بھارتیہ بھاشا اُتسو منایا گیا اور ہندوستانی زبانوں کے تعلق سے مختلف لسانی اور ثقافتی پس منظر سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کے اہم تصورات و نظریات سامنے آئے۔ یہ بنیادی طور پر ہندوستانی زبانوں کا جشن تھا اور اس اُتسو کے ذریعے پورے ملک اور معاشرے میں زبانوں کے تعلق سے نہایت مثبت پیغام دیا گیا اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی کہ زبانوں کی علاقائی یا مذہبی سرحدیں نہیں ہوتیں اور نہ ہی زبان مجادلے کے لیے ہوتی ہے بلکہ یہ ترسیل اور مکالمے کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔

ہندوستان بنیادی طور پر زبانوں کا ملک ہے اور یہاں کی بیشتر زبانوں میں مشترکہ لسانی خصوصیات بھی ہیں اور یہی کثرت میں وحدت کی ایک خوبصورت علامت بھی۔ الگ الگ زبان اور کلچر کے باوجود ہندوستانیت ہر زبان کے خمیر میں شامل ہے اور یہی یہاں کی زبانوں کی روح ہے۔ اس بار زبانوں کا جشن منا کر حکومت نے زبانوں کے ذریعے مختلف قوموں کے درمیان اتحاد اور یکجہتی کا جو پیغام دیا ہے یقیناً یہ قابل ستائش قدم ہے۔ لسانی و تہذیبی تنوع ہی دراصل ہندوستان کی جامع شناخت ہے اور زبانوں کا یہی تنوع یہ احساس دلاتا ہے کہ 'گلہائے رنگارنگ سے ہے زینت چمن'۔

اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ہندوستان کی تمام بھاشاؤں میں ایک طرح کا بہناپا بھی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے لفظوں کا لین دین کرتے رہے ہیں اور اسی کے ذریعے ہندوستانی زبانوں کو توانائی، تقویت کے ساتھ ساتھ نئے الفاظ اور محاورات بھی ملتے رہے ہیں، اسی لیے ہمارے دانشوروں نے لسانی تعامل اور ترابط کے لیے ترجمے کا ایک وسیلہ اختیار کیا کیونکہ ترجمے کے ذریعے ہی زبانوں کی کھڑکیاں کھل سکتی ہیں اور ہم ایک دوسرے کے لسانی اور ثقافتی افکار و اقدار سے آگاہ بھی ہو سکتے ہیں۔

زبانوں کو کسی علاقے یا کسی مذہب میں محدود نہیں کیا جانا چاہیے، کیونکہ جو بڑی زبانیں ہوتی ہیں ان کا کوئی خاص علاقہ نہیں ہوتا، اور ایسی ہی زبانیں زندہ رہتی ہیں جو صرف چند محاورات و الفاظ میں اسیر نہ ہوں بلکہ اس میں مختلف قوموں کے تصورات اور جذبات کی عکاسی ہو۔ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مختلف زبانیں، بولیاں اور ثقافتیں ہیں، جب کہ بہت سے ممالک ایسے ہیں جہاں یک لسانی نظام رائج ہے، وہاں کسی طرح کا نہ تنوع ہے، نہ رنگارنگی، اس لیے انھیں زبانوں کا وہ لطف اور آنند نہیں مل پاتا جو ہندوستان جیسے کثیر لسانی ملک کے عوام کو ملتا رہا ہے۔ ہندوستان میں نہ صرف یہاں کی مٹی کی بھاشائیں ہیں بلکہ انگریزی، عربی، فارسی، فرانسیسی، روسی جیسی غیر ملکی زبانیں بھی ہیں۔ ہندوستان کی اپنی زبانیں اور بولیاں، ہمارے لسانی اور ثقافتی ورثے کو جہاں ثروت مند بناتی ہیں، وہیں دوسری زبانوں سے اخذ و اکتساب کرکے ہم اپنی زبان کے دائرے کو اور بھی وسعت عطا کرتے ہیں۔ اس لیے ہمیں بہت سارے ملکوں کی تہذیبوں اور ثقافتوں سے وحشت اور اجنبیت نہیں ہوتی، بلکہ ان تہذیبوں اور ثقافتوں سے ہم ایک طرح کا ربط پیدا کرتے ہیں اور مثبت قدروں کو اپنا بھی لیتے ہیں۔ ہماری ہندوستانی بھاشائیں دراصل انسانیت اساس ہیں کیونکہ یہاں لسانی اور ثقافتی اقدار و افکار پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، بھارتیہ بھاشا اُتسو اس کی ایک روشن مثال ہے، یہاں مادری زبان پر بھی خاص توجہ دی جاتی ہے کیونکہ اس کے ذریعے نہ صرف ہم اپنی تہذیبی جڑوں سے جڑتے ہیں بلکہ اپنی ثقافتی وراثت کو بھی محفوظ رکھتے ہیں اور یہی فطری زبان ثقافتی تشخص، سماج کی روایات، رسومات، تہذیب اور خاندانی افکار و اقدار سے بھی جوڑے رکھتی ہے کیونکہ اپنی زبان اور تہذیب سے علیحدگی دراصل موت کے مترادف ہے۔ اسی لیے بھارت سرکار نے اپنی قومی تعلیمی پالیسی NEP 2020 میں جہاں مادری زبان پر زور دیا ہے، وہیں کثیر لسانی معاشرے میں دوسری عالمی زبانوں کے علوم و فنون سے اپنی ثروت میں اضافے کی بھی بات کی ہے۔

شمس اقبال

ربط والتفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گزارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

☜ ماہنامہ 'اردو دنیا' نومبر 2024 ہدست ہوا۔ سرورق سے ہی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ دور سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے جو اب مصنوعی ذہانت کے گرد گردش کر رہا ہے۔ دوسری اہم زبانوں سے ہماری اپنی زبان میں علم و ادب کو منتقل کرنے کے لیے اصطلاح سازی اور اس کی تکنیک میں کمال وعبور حاصل ہونا ضروری ہے جہاں تک اردو کا تعلق ہے تو اصطلاح سازی میں حیدرآباد دکن تا شمال مشرق ومغرب میں کافی کچھ کام ہوا ہے خود قومی اردو کونسل دہلی نے اصطلاح سازی کی لگ بھگ دو درجن کتب تیار کروائیں جو بڑی عرق ریزی کا کام ہے۔ اب جہاں ہندوستان کی دیگر زبانوں میں ڈیجیٹلائزیشن پر عملاً کام ہو رہا ہے وہیں اردو زبان میں بھی اس عمل میں سرعت آگئی ہے۔ جن میں کئی ادارے مصروف ہیں ان میں NCPUL بھی پیش پیش ہے۔ یہ معاملات تو اداریہ کا پرتو ہیں۔ اس کے ماسوا اس شمارے کے مشمولات میں 15 شہ سرخیاں اور 24 ذیلی سرخیاں شامل ہیں اور ان کی آبیاری دو درجن سے زائد ادبا نے کی ہے۔ 'خطوط' کے ذیل میں ربط والتفات کے تحت پانچ مراسلے شامل ہیں۔ 'رپورٹ' کے تحت نہایت ہی دلنشین سہ روزہ ورکشاپ کی روداد درج کی گئی ہے اور یہ ورکشاپ متعلق ہے 'بچوں اور نوجوان قارئین کے لیے اردو میں تخلیقی سہ روزہ ورکشاپ'۔ ان میں دکھائے بزرگوں بچوں اور نوجوانوں میں جوش وخروش، اشتیاق و انہماک دیکھتے ہی بنتا ہے۔ 'ادب زاویے اور جہات' کے ذیل میں 5 مقالات دیے گئے ہیں۔ ان میں پہلا مضمون پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کا دیا ہوا ہے۔ انھوں نے ابتداءً یہ واضح کرنے کی کوششیں کی ہے کہ آن لائن دنیا میں انسانی اور عدد نگارش اشتراک اور برقی لین دین کی وجہ سے انسان اور مشین کے مابین فرق معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ ایسے ماحول میں ادب کا تخلیقی رویہ تقریباً ہر جہت سے تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ مضمون کی اساس تو یہی ہے پر اسے کئی ذیلی سرخیوں میں منقسم کیا گیا ہے جیسے سائبر پنک لٹریچر اور اس کے موضوعات، خصوصیات اور مصنفین اس لحاظ سے یہ مضمون غور وخوض سے پڑھنے کی دعوت دیتا ہے۔ دوسرا مضمون ڈاکٹر ریاض توحیدی کا لکھا ہوا ہے۔ اور عنوان ہے 'تخلیقی تنقید اور سریندر پرکاش کی سحر انگیز افسانہ نگاری' اس مضمون کی ابتدا میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک نقاد کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ آپ کے علم میں مزید اضافہ کرے۔ مزید یہ کہا گیا ہے کہ شعر میں شعریت اور افسانہ میں افسانویت ہونی چاہیے اور مزید یہ بھی کہا گیا ہے کہ سریندر پرکاش کے بیشتر افسانوں میں نفسی کشمکش کی فضا طاری ہے۔ تیسرا مضمون جناب نظام الحسن صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ انھوں نے رامپور میں تذکرہ نگاری کا اجمالی جائزہ لیا ہے۔ جناب دلشاد حسین اصلاحی نے اپنا مضمون بعنوان 'خاکہ نگاری کا ایک حوالہ آب حیات' پیش کیا ہے۔ مصنف کے مطابق اس کے بے شمار ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ خاکہ نگاری اردو ادب میں ناول، افسانہ اور اور انشائیہ نگاری کی طرح نثری تخلیقی صنف ہے۔ آب حیات میں پیش کردہ کئی شعرا کی تصاویر کے خدوخال خاکہ نگاری کے ضمن میں ابھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ آب حیات اور خاکہ نگاری سے متعلق مزید معلومات کے لیے اس مضمون کا ضرور مطالعہ کریں۔ ڈاکٹر شمیم احمد نے اپنا مضمون بعنوان 'برصغیر کی زبانوں میں اُردو کا شجرہ' پیش کیا ہے۔ بڑا ہی ادبی اور تحقیقی مضمون ہے۔ اس میں پہلے آٹھ بڑے لسانی خاندانوں کا شجرہ دیا گیا ہے۔ پھر ہند آریائی زبانیں بیان کی گئی ہیں اور پھر ہند آریائی زبانوں کا شجرہ دیا گیا ہے۔ 'زبان وتعلیم' کے ذیل میں تین اسباق دیے گئے ہیں۔ پہلا مضمون ڈاکٹر آفاق ندیم خان نے لکھا ہے اور بہت خوب لکھا ہے۔ عنوان ہے 'قومی درسیات کا خاکہ برائے اسکولی تعلیم 2023 کے رہنما خطوط' وہ پہلے پہل سمجھاتے ہیں کہ زبان کی تعلیم کا مقصد طلبہ کو

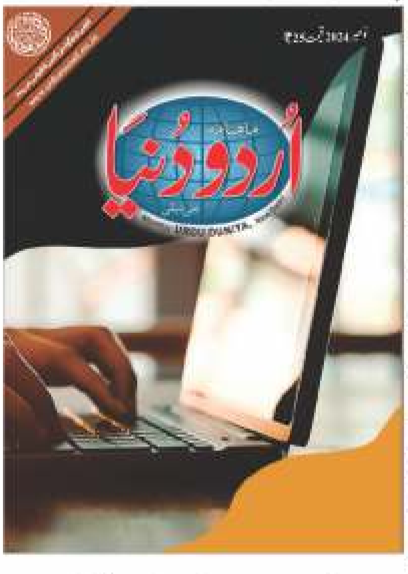

ہندوستان کے لسانی ورثے اور ثقافت یعنی تحریری اور زبانی ادب یعنی کہانیاں، نظمیں، گیت، ڈرامے، فلموں کے شراکتی مشغولیت کے ذریعے منہمک کرنے اور ان میں حصہ لینے کے قابل بنایا جائے۔ دوسرا مضمون پروفیسر عارفہ بشریٰ نے تحریر کیا ہے۔ عنوان ہے 'اُردو اساتذہ کی صلاحیت سازی' وہ اپنے اس اہم بیان سے ابتدا کرتی ہیں کہ طلبا و طالبات ملک اور قوم کی امانت ہیں۔ اس لیے اساتذہ کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ اپنے کام کو دیانت داری سے سرانجام دیں اور اسی اصول پر اس مقام کو قائم کیا گیا ہے۔ اس کڑی کا تیسرا اور آخری مضمون جناب محمد نورالاسلام صاحب نے لکھا ہے۔ عنوان رکھا ہے 'زبان کی تدریس میں تخلیق کا دائرہ عمل' انھوں نے سب سے پہلے تخلیق کی وضاحت کی ہے کہ تخلیق کا اطلاق انسان کی خودساختہ صلاحیتوں پر ہوتا ہے۔ اس کے دائرہ اثر میں گوناگوں صلاحیتیں مضمر ہیں جیسے ادب سائنس ٹکنالوجی، موسیقی، ڈرامہ، تجارت و حرفت اور معاشرت وغیرہ۔ اس مضمون کو انھوں نے مزید ذیلی سرخیوں میں ترتیب دیا ہے جیسے استبصار (Visualisation)، تصوراتی نظام کا قیام، مسائل کا حل، اشکال ستہ کی مشق، مزاحیہ عنصر، بلندخوانی وغیرہ۔ پڑھنے کے لائق اچھا مضمون ہے۔ 'آبیات' کے ذیل میں محض ایک مقالہ بعنوان 'پیاس کی بازگشت' جناب شیخ عقیل احمد نے لکھا ہے۔ انھوں نے اس بازگشت میں قدیم سنسکرت سے جدید اُردو تک کا ایک ادبی سفر طے کیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ اردو شاعری میں پانی کے تحفظ سمیت سماجی اور ماحولیاتی مسائل کو حل کرنے کی ایک بھرپور روایت رہی ہے اور اردو کے کئی مشہور شاعروں نے پانی کی اہمیت اور اس کے تحفظ کی ضرورت کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ اچھا مضمون ہے، ضرور پڑھیے۔ 'شخصیات' کے تحت چار مقالے دیے گئے ہیں۔ جو کسی نہ کسی شخصیت کے گرد گھومتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام تر توصیفی ہوں گے۔ بہرحال پہلا مضمون 'ظفر گورکھپوری کی شخصیت اور شاعری میں مٹی کی مہک' اس مضمون کو جناب اشتیاق سعید صاحب نے لکھا ہے۔ اولاً تو انھوں نے ظفر گورکھپوری کے بچپن کا ذکر کیا اور یہ بتایا کہ وہ ہندوستانی کلچر اور مزاج کے شاعر تھے اور یہ کہ ہندوستان کی مٹی ان کی شخصیت اور شاعری دونوں میں مہک رہی ہے۔ دوسرا مضمون بعنوان 'انور ندیم کے قلمی خاکے جلتے توے کی مسکراہٹ کے حوالے سے' اس مضمون کو جناب محمد اویس سنبھلی نے لکھا ہے۔ اولاً مصنف نے انور ندیم کا خاکہ کھینچا ہے اور کہا کہ انور ندیم کی نثر میں پھول کی مہک قوس وقزح کی دلکشی زبان کی مٹھاس اور لہجے اور فقروں کی کاٹ ملے گلی تحریر اچھی ہے اور مطالعہ میں مزہ دیتی ہے۔ ڈاکٹر محمد مستمر نے 'عزیز بانو داراب وفا' لکھا ہے۔ ڈاکٹر عزیز احمد خان نے 'خواجہ حسن ثانی نظامی کا اسلوب' پر قلم اٹھایا ہے۔ پر پڑھ کر دیکھ لیتے ہیں تو محض حالات زندگی سے تمام تر مضمون بھرا ہے۔ البتہ کہیں کہیں کچھ کچھ تصوف کے بارے میں لکھا ہے۔ 'یادرفتگان' کے تحت دو مضامین دیے ہوئے ہیں۔ 'ریاض الرحمٰن شروانی حیات و خدمات' پروفیسر محمد سلیم قدوائی کی تحریر ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ریاض الرحمٰن شروانی 1924 کو پیدا ہوئے اور 2019 کو وفات پاگئے۔ وہ شمالی ہند کے معروف گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر تعلیم و تربیت کا ذکر ہے۔ وہ ایک صحافی اور تبصرہ نگار تھے۔ 'چھوٹا کشمیر کا قدآور شاعر رسا جاودانی' پروفیسر شہاب عنایت ملک کی تحریر ہے۔ اس کا عنوان ہی عجیب سا لگتا ہے۔ رسا جاودانی کو قصیدہ نگاری کے فن پر پوری دسترس حاصل ہے۔ اس کی بہترین مثال بھدرواہ پر تصنیف شدہ قصیدہ ہے اور 'نیرنگ غزل' میں شامل ہے۔

تاریخ کے ذیل میں 'حیات قدیمہ اور عصر مابعد تاریخ' اس کا ماخذ 'قدیم ہندوستان کی ثقافت وتہذیب تاریخی پس منظر میں' مصنف ڈی ڈی کوسمبی مترجم بالمکند عرش ملسیانی ہیں۔ کیا خیال ہے۔ 'نفسیات' اس میں ایک مقالہ دیا گیا ہے۔ عنوان ہے 'فرد کی قدر شناسی اور اثبات اقدار کی صلاحیت' مصنف رولو مے مترجم زاہدہ زیدی۔ یہ بھی اسی طرح قومی اردو کونسل کی کتاب ہے۔ سماجیات کے تحت 'انسان بحیثیت سماجی حیوان' از شریف الحسن نقوی یہ بھی کتاب قومی اُردو کونسل سے ہی طبع شدہ ہے۔ 'صحت' کے ذیل میں 'ناقص تغذیہ کے اثرات' از شکیل احمد، یہ کتاب بھی قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان سے شائع شدہ ہے۔ 'سلسلہ صحافت' کے ذیل میں جناب محمد سہیل صاحب نے اپنا مقالہ بعنوان 'اُردو صحافت پر جدید ٹکنالوجی کے اثرات' سپرد قلم کیا ہے۔ اس کی تمہید میں یہ لکھا گیا ہے کہ اکیسویں صدی کی آمد کے ساتھ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں کافی ترقی ہوئی۔ ان ترقیوں کے ساتھ اردو صحافی کے آنگن میں نئی روشنی آب و تاب کے ساتھ نظر آئی۔ اُردو اخبارات، رسائل و جرائد کی اشاعت اور طباعت کا مرحلہ آسان سے آسان تر ہوتا چلا گیا۔ انھی بنیادوں پر اس سبق کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ 'نیا آسمان نئے ستارے' کے ذیل میں 'حسرت کا تصورِ عشق' جناب محمد عارف نے پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق حسرت نے اُردو کی غزلیہ شاعری کو ایک نئی توانائی اور قوتِ فکر ونظر سے روشناس کیا۔ ان کی شاعری میں معصومیت اور کھرا پن ہے۔ آپ کو اور بھی ایسے اوصاف سے سابقہ پڑے گا۔ 'کتابوں کی دنیا' میں کوئی 10 کتابوں پر تعارف وتبصرہ کیا گیا ہے تاکہ آپ کو اپنی پسند کی کتابیں منتخب کرنے میں آسانی رہے۔ 'خبرنامہ' میں دنیا جہاں سے اُردو دنیا کی خبریں دی گئی ہیں۔

مصطفیٰ ندیم خاں غوری بی11، گرین دہلی ریزیڈنسی، باغ چھترپتی سنبھاجی نگر، (مہاراشٹر)

ماہنامہ 'اردو دنیا' نومبر 2024 کا 'اردوٗ دنیا' کا شمارہ صوری و معنوی اعتبار سے لاجواب ہے۔ یوں تو پورا شمارہ ہی لائق مطالعہ ہے۔ بطور خاص نظام الحسن کا 'رامپور میں تذکرہ نگاری کا اجمالی جائزہ'، 'خاکہ نگاری کا ایک حوالہ آبِ حیات' قابلِ ذکر ہیں۔ 'ظفر گورکھپوری کی شخصیت اور شاعری میں مٹی کی مہک' اشتیاق سعید کا دلچسپ مضمون ہے۔ جن لوگوں نے ظفر صاحب کو قریب سے دیکھا ہے وہ اس سے یقیناً بہت لطف اندوز ہوں گے۔ ہمارے یہاں (بھیونڈی) کے چھوٹے بڑے مشاعروں میں ظفر صاحب تشریف لاتے تھے۔

خواجہ حسن نظامی ثانی پر لکھا گیا مضمون خواجہ حسن ثانی کی شخصیت اور ان کے کارناموں کا کسی حد تک احاطہ کرتا ہے۔ شمارے کا ایک اور اہم مضمون 'انور ندیم کے قلمی خاکے' ہے۔ ملک زادہ منظور پر انور ندیم نے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ حرف بہ حرف درست ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ملک زادہ کی شاعری کو ان کی نظامت نے دبا دیا تھا۔ ملک زادہ کے یہاں عمدہ شاعری کے نمونے کسی بھی بڑے شاعر سے زیادہ ہیں۔ ان کے یہ دو شعر نہیں بھلائے جاسکتے۔

منظور لہو کی بوندمری اب تک نہ کوئی بیکار گری
یا رنگِ حنا بن کر چمکی، یا پیشِ صلیب و دار گری
اوروں پہ نہ جانے کیا گزری اس تیغ وتبر کے موسم میں
ہم سر تو بچا لائے لیکن دستار سر بازار گری

محمد رفیع انصاری، 734 بھوسار محلہ، بھیونڈی 421302 ضلع تھانے، مہاراشٹر

شہلا کلیم

سہ روزہ قومی سمینار بعنوان

’معاصر اردو ادب کا تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی منظرنامہ‘

ادب اور سماج کے باہمی تعلق کے حوالے سے بارہا یہ بات دہرائی جاتی رہی ہے کہ ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔ کوئی بھی ادیب اپنے عہد اور سماج سے بے گانا نہیں رہ سکتا۔ ادب سماج ہی کی پیداوار ہے۔ ہر عہد کا ادب اپنے زمانے کا منظر نامہ لازماً پیش کرتا ہے۔ ہر زمانے کی تخلیقات میں اس عہد کی چھاپ صاف دکھائی پڑتی ہے۔ اس ضمن میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ ہمارے عہد کا ادب کس حد تک اپنے سماج کی عکاسی کرتا ہے۔ اکیسویں صدی کے ادب کے موضوعات و رجحانات کیا ہیں اور کس قسم کا ادب وجود میں آ رہا ہے۔ آیا وہ روایات یا تعطل اور جمود کا شکار تو نہیں ہو کر رہ گیا وغیرہ۔

انھی نکات کے پیش نظر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور ہندوستانی زبانوں کا مرکز (CIL) جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے اشتراک سے 8,9 اور 10 نومبر کو معروف دانش گاہ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں سہ روزہ قومی سمینار کا انعقاد ہوا۔ جس کا موضوع ’معاصر اردو ادب کا تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی منظر نامہ‘ تھا۔ اس سہ روزہ سمینار میں موضوع کے حوالے سے بہت ہی اہم اور دقیق مقالات پیش کیے گئے۔

اس سمینار کے افتتاحی اجلاس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر شوبھا سیوا شنکرن، مہمانان اعزازی کے طور پر مشہور و معروف ادیب ڈاکٹر سید فاروق اور پروفیسر سدھیر پرتاپ سنگھ نے شرکت کی۔

خیر مقدمی کلمات ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ڈاکٹر شمس اقبال نے پیش کیے۔ انھوں نے اس سمینار کا مقصد اور اہمیت و افادیت بیان کرتے ہوئے موضوع کے تعلق سے بہت سی کارآمد باتیں کہیں انھوں نے کہا کہ یہ موضوع اپنے آپ میں ایک وسیع کینوس پر محیط ہے۔ ڈاکٹر شمس اقبال نے کثیر لسانی نظام میں تقابلی ادب کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ تقابلی ادب اس لیے بھی ضروری ہے تا کہ آپ کو معلوم ہو سکے کہ آپ کا ادب کتنا ثروت مند ہے۔ اس کی تفہیم کے

بغیر آپ بہتر ادب تخلیق نہیں کر سکتے۔

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ نومبر 1974 میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے سینٹر آف انڈین لینگویجز کا قیام عمل میں آیا تھا۔ آج ہم اس اہم موقعے پر سینٹر کے پچاس سال مکمل ہونے پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور اس سمینار کے ذریعے ہندوستانی زبانوں کا مرکز کی گولڈن جوبلی کا آغاز کرتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس گولڈن جوبلی کی مناسبت سے سال بھر تقریباً 50 پروگرام منعقد کیے جائیں گے جن کا اختتام آئندہ سال کے ماہ نومبر میں ہوگا۔

موضوع کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ بلاشبہ یہ ایک وسیع موضوع ہے اور یقیناً اس کو وسیع ہونا ہی چاہیے کیونکہ یہ اپڈیشن کا عہد ہے جہاں بہت تیزی سے ہر لمحہ نئی مشینیں پرانی ہو کر بیکار ہوتی جا رہی ہیں۔ ایسے میں بڑا سوال ہے کہ کیا ہمارے پرانے ادب کا ذخیرہ بھی بیکار ہو جائے گا؟ کیا ہمارا ادب اس مشینی دور کے شانہ بشانہ چل سکے گا؟

ادب کی اہمیت و افادیت کو بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مشین خواہ کتنی ترقی کر لے لیکن وہ جمالیات کو پیش نہیں کر سکتی۔ وہ فکر و احساسات اور کیفیات کا متبادل نہیں ہو سکتی انھوں نے مزید کہا کہ آج کا سب سے بڑا تقاضا یہی ہے کہ ادب کو اپڈیٹ کرنا ہوگا۔

مشہور و معروف فکشن نگار سید محمد اشرف نے اپنے پر مغز کلیدی خطبے میں اردو زبان کی اہمیت و افادیت اور اس کی انفرادیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو وہ زبان ہے جس میں بے پناہ ہندوستانی عناصر موجود ہیں۔ یہ دو تہذیبوں کی روشنی سے پیدا ہونے والا شرارہ ہے۔ موضوع کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ادب اپنے عہد اور معاشرے کا زائدہ ہوتا ہے۔ تنقید اور تحقیق بھی وہی رویہ اختیار کرنے لگتی ہے جو اس عہد کا تقاضا ہو۔ لیکن اس بات کا انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ بعض ادب میں وہ آفاقی عناصر موجود ہوتے ہیں جو اس کو آئندہ عہد کے لیے زندہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اچھا ادب اپنی حنائی انگلی کا نظارہ چلمن کے پیچھے سے کراتا ہے اور کبھی کبھی اپنے جلوہ زیبائی کو دکھانے کے لیے ایک باریک نقاب کا بھی استعمال کرتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی گفتگو میں معاصر تحقیق، تنقید اور تخلیق کے میدانوں میں ہونے والی سرگرمیوں کا اجمالی جائزہ بھی پیش کیا۔

مہمان اعزازی کی حیثیت سے معروف سماجی کارکن ڈاکٹر سید فاروق نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ معاشرے میں دم توڑتی تہذیب و تمدن کو زندہ رکھنے کے لیے اس قسم کی مجلسوں کا انعقاد ضروری ہے۔

ڈاکٹر سدھیر پرتاپ سنگھ نے مہمان اعزازی کے طور پر اظہار خیال کرتے ہوئے شعبے کے چیئر پرسن کی حیثیت سے ایک بہترین سمینار کے انعقاد پر خوشی کا

اظہار کیا اور انھوں نے ہندی اور اردو کے باہمی تعلق کو استوار کرنے پر زور دیا۔

مہمان خصوصی پروفیسر شوبھا سیوا سنکرن نے زبانوں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ زبانیں محض Communication کا ذریعہ نہیں ہیں بلکہ یہ ہماری تاریخ، تہذیب، فلسفہ اور ادب وغیرہ کو بھی زندہ رکھتی ہیں۔

آخر میں ڈاکٹر نصیب علی چودھری اسسٹنٹ پروفیسر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نے اظہار تشکر پیش کیا۔ ڈاکٹر شگفتہ یاسمین نے اس افتتاحی اجلاس کی نظامت کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیے۔

افتتاحی اجلاس کے بعد محفل قوالی کا اہتمام کیا گیا۔ حسین براوران کے صوفیانہ کلام نے سماں باندھ دیا اور سامعین خوب محظوظ ہوئے۔

سمینار کے دوسرے دن کا پہلا تکنیکی اجلاس پروفیسر شہاب عنایت ملک صدر شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی اور مشہور و معروف ادیب پروفیسر غضنفر علی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں پروفیسر ابوبکر عباد، پروفیسر عباس رضا نیر، ڈاکٹر شمیم احمد، اور ڈاکٹر عبدالحی نے موضوع کے حوالے سے پر مغز مقالے پیش کیے۔

ڈاکٹر عبدالحی نے 'مصنوعی ذہانت اور اردو زبان کا موجودہ منظر نامہ' عنوان کے تحت اپنا مقالہ پیش کیا۔ مصنوعی ذہانت پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ موجودہ صدی کاغذ اور قلم کی صدی نہیں ہے یہ معلومات اور ذخیرہ اندوزی کی صدی ہے۔ دنیا میں آج سب سے زیادہ طاقتور وہی ہے جس کے پاس سب سے زیادہ ڈاٹا ہے اور اسی صدی کی ایک حیرت انگیز اور خوفناک ایجاد آرٹیفیشل انٹیلیجنس ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ابھی اے آئی کے پاس اردو میں بہت زیادہ ڈاٹا موجود نہیں ہے اسی لیے جب اس سے شعر کی تخلیق یا کوئی کہانی لکھنے کے لیے کہا جاتا ہے تو اس میں وہ تخلیقیت نہیں ہوتی جو انسانی عقل و ذہن سے لکھی ہوئی تحریر میں ہوتی ہے۔ اس کے باوجود اس کے پاس تحقیق، تنقید اور تخلیق کی صلاحیت موجود ہے۔

ڈاکٹر شمیم احمد نے 'ادبی تحریروں کا مشینی ترجمہ: مسائل اور امکانات' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے مشینی ترجمے کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہا کہ انسانی ذہن متن کے مطالعے میں کوئی غلطی کرسکتا ہے لیکن مشین کا مطالعہ بہت مکمل اور پرفیکٹ ہوتا ہے کیونکہ مشین کے ذریعے اسکین کیا گیا متن مشین کو بالکل وہی متن فراہم کرتا ہے جو بنیادی زبان کا متن ہے۔

پروفیسر ابوبکر عباد نے 'اکیسویں صدی میں 2013 تک کے چند ناولوں پر ایک نظر' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ اس دورانیے میں لکھے جانے والے تمام بڑے ناولوں کا احاطہ کرتے ہوئے ان کے موضوعات اور فکر و فن کے حوالے سے انھوں نے پر مغز گفتگو کی۔

پروفیسر عباس رضا نیر نے 'سوشل میڈیا اور معاصر اردو غزل: ایک لسانی جائزہ' کے عنوان سے اس سیشن کا آخری مقالہ پیش کیا۔ اس اجلاس کے صدور پروفیسر

شہاب عنایت ملک اور پروفیسر غضنفر علی نے اجلاس میں پیش کیے گئے مقالوں کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے موضوع کے حوالے سے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر شفیع ایوب نے اس سیشن کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔

سیمینار کے دوسرے تکنیکی اجلاس کی صدارت پروفیسر قمر الہدی فریدی صدر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور پروفیسر فضل اللہ مکرم صدر شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد نے کی اور نظامت کی ذمے داری راقم الحروف (شہلا کلیم) نے ادا کی۔ اس سیشن میں پروفیسر شمس الہدی دریابادی، ڈاکٹر مشتاق قادری، ڈاکٹر خاور نقیب اور ڈاکٹر محمد افضل مصباحی نے اپنے مقالے پیش کیے۔

ڈاکٹر افضل مصباحی نے 'معاصر ادب میں سماجی مسائل کی عکاسی: ناولوں کے حوالے سے' عنوان پر مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے عصر حاضر میں لکھے جانے والے ناولوں کے موضوعات اور ان میں بیان کردہ سماجی مسائل پر بھرپور گفتگو کی۔

ڈاکٹر خاور نقیب نے 'اردو تنقید پر مغربی نظریات کی بالادستی' کے عنوان سے مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ حالی نے اردو تنقید میں پیروی مغرب کی طرح ڈالی۔ لیکن یہاں حالی کی پیروی مغرب استفادے کی حیثیت رکھتی ہے نہ کہ محض نقالی کی۔

ڈاکٹر مشتاق قادری نے 'آزادی کے بعد جموں و کشمیر میں اردو تحقیق' کے عنوان سے مقالہ پیش کرتے ہوئے جموں اور کشمیر کے نامور محققین کی خدمات کا جائزہ پیش کیا۔

دوسرے سیشن کا آخری مقالہ 'سندی تحقیق کی موجودہ صورت حال' کے عنوان سے پروفیسر شمس الہدی دریابادی نے پیش کیا۔ انھوں نے اپنے مقالے میں جامعاتی تحقیق کی موجودہ صورت حال اور ریسرچ اسکالرز کے گرتے معیار پر اظہار افسوس کرتے ہوئے طلبا کو مفید مشوروں سے بھی نوازا۔ اجلاس کے آخر میں پروفیسر فضل اللہ مکرم اور پروفیسر قمر الہدی فریدی نے صدارتی کلمات پیش کیے اور اجلاس میں پڑھے گئے تمام مقالوں پر گفتگو کرتے ہوئے مقالہ نگاران کی حوصلہ افزائی کی۔

ظہرانے کے وقفے کے بعد تیسرے تکنیکی سیشن کا آغاز ہوا۔ اس سیشن کی صدارت پروفیسر کوثر مظہری اور پروفیسر محمد علی جوہر نے کی۔ مقالہ نگار کی حیثیت سے ڈاکٹر عقیلہ سید غوث، ڈاکٹر مشتاق صدف، ڈاکٹر انوپما پول اور پروفیسر ابوبکر رضوی نے شرکت کی۔

ڈاکٹر انوپما پول نے 'کرناٹک میں معاصر اردو ادب ایک جائزہ' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کرناٹک کے اہم ادبا کے حوالے سے اہم گفتگو کی۔

ڈاکٹر مشتاق صدف نے 'اردو کی نمائندہ فکشن نگار خواتین: ایک جائزہ' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔

ڈاکٹر عقیلہ سید غوث نے 'معاصر ادب میں سماجی مسائل کی عکاسی' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے اپنی گفتگو میں کہا کہ ادب کے ذریعے ہم معاشرتی

مسائل کو بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں۔

پروفیسر ابوبکر رضوی نے 'نسائی حسیت اور اردو کی چند خواتین افسانہ نگار' کے عنوان سے مقالہ پڑھتے ہوئے نمائندہ خواتین فکشن نگاروں پر اہم اور معلوماتی گفتگو کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں پروفیسر کوثر مظہری نے موضوع کی معنویت اور اس کی اہمیت و افادیت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس موضوع کا کینوس بہت وسیع ہے۔ انھوں نے کہا کہ سمینار کا یہ عنوان اپنے آپ میں بہت سے امکانات سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کی تمام جہات اور زاویوں پر مزید گفتگو اور جستجو کی ضرورت ہے۔ پروفیسر محمد علی جوہر نے بھی صدارتی خطبے میں اہم نکات کی طرف توجہ دلائی۔ اس سیشن کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر رکن الدین نے انجام دیے۔

چوتھے سیشن کی صدارت پروفیسر اعجاز محمد شیخ اور پروفیسر ناشر نقوی نے کی۔ اس سیشن میں ڈاکٹر درخشاں زریں، ڈاکٹر روبینہ شبنم، ڈاکٹر مجاہد الاسلام اور ڈاکٹر درانی شبانہ خان نے مقالات پیش کیے جب کہ نظامت جے این یو کے ریسرچ اسکالر نثار احمد نے کی۔ اس سیشن کے صدور پروفیسر اعجاز محمد شیخ اور پروفیسر ناشر نقوی کے پرمغز صدارتی خطبات پر اس سہ روزہ سمینار کے دوسرے دن کا اختتام ہوا۔

سہ روزہ قومی سمینار کے تیسرے دن کا آغاز پانچویں تکنیکی اجلاس سے ہوا جس کی صدارت پروفیسر اسلم جمشید پوری اور ڈاکٹر خاور نقیب نے کی۔ اس نشست میں ڈاکٹر ارشاد نیازی، ڈاکٹر نورالحق اور ڈاکٹر ایس محمد یاسر نے مقالات پیش کیے۔ ڈاکٹر خاور نقیب نے صدارتی کلمات میں تقابلی مطالعے کے فوائد اور اہمیت پر زور دیا۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ نئی صدی میں جو تبدیلیاں آئی ہیں اس کو نشان زد کرنا اس سمینار کا اہم مقصد ہے۔ مصنوعی ذہانت اور تکنیکی وسائل کو سمجھ کر ہی ادب کو آگے لے جایا جاسکتا ہے۔ اس نشست کی نظامت جے این یو کے ریسرچ اسکالر نوید رضا نے کی۔

چھٹے اجلاس کی صدارت پروفیسر شمس الہدیٰ دریابادی اور محترمہ یشیکا ساگر نے کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عبدالباری نے انجام دیے۔ اس نشست میں ڈاکٹر پرویز احمد، ڈاکٹر سیدہ بانو، ڈاکٹر خان محمد آصف اور ڈاکٹر شبنم شمشاد نے مقالات پیش کیے۔ صدارتی خطبے میں پروفیسر شمس الہدیٰ دریابادی نے تمام مقالات پر تفصیلی گفتگو کی۔ بالخصوص مصنوعی ذہانت کے حوالے سے انھوں نے پرمغز گفتگو کی اور اس طرف توجہ مبذول کرائی۔

اختتامی اجلاس میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا یہ ڈیجیٹل ایج ہے۔ سائنسی و تکنیکی ترقیات کے اس عہد میں ترجیحات تیزی سے بدل رہی ہیں، تقاضے تبدیل ہورہے ہیں، بزم جہاں کا انداز بدل رہا ہے، اس لیے ہمیں بھی اپنا انداز فکر اور

طرزِ احساس بدلنا ہوگا۔ زبان وادب کو بہت سے کلیشوں سے آزاد کرنا ہوگا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس سہ روزہ سمینار نے میرے ذہن میں سوالات کے کچھ نئے سلسلوں کو بھی جنم دیا۔ کیا ہمارا ادب ایک ہی سوئی کی نوک پر ٹھہرا ہوا ہے؟ کیا چند ہی نکات ونظریات میں ہمارا ادب محصور ہے؟ کیا ہمارا ادب حال اور مستقبل سے ہمیں جوڑنے میں ناکام ہے؟ ادب کے تعلق سے بہت سے سوالات ہیں جن کے جوابات اب ہمیں تلاش کرنے ہوں گے۔

اس موقعے پر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ یہ سمینار ادب کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ایک کوشش ہے۔ پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے مصنوعی ذہانت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے اس کے طریقہ استعمال پر بھی اہم نکات پیش کیے۔ انھوں نے کہا کہ آپ جس طرح مشین کو ٹرینڈ کریں گے وہ اس کا ردعمل بھی ویسا ہی ہوگا۔ انھوں نے اختتامی کلمات میں اس سمینار کو کامیاب بنانے پر تمام شرکا بالخصوص اپنے طلبا وطالبات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس اہم سمینار میں تعاون کے لیے حکومت ہند کا بھی شکریہ ادا کیا۔ پروفیسر احمد محفوظ، پروفیسر ابوبکر عباد، پروفیسر غضنفر، پروفیسر محمد علی جوہر، پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر نصیب علی چودھری اور ڈاکٹر انوپما پول نے اپنے تاثرات پیش کیے۔ ان لوگوں نے سمینار کو ہر زاویے سے کامیاب قرار دیا۔ اس اجلاس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر شفیع ایوب نے بحسن وخوبی انجام دیے۔

اس سہ روزہ قومی سمینار میں کل چھ تکنیکی اجلاس ہوئے۔ ہر اجلاس میں چار چار مقالات پیش کیے گئے۔ ہر سیشن کے اختتام پر سوال وجواب کا وقفہ بھی رکھا گیا۔ اس سمینار میں کتابوں کی نمائش اور خرید وفروخت کا بھی اہتمام کیا گیا۔

سمینار کے تینوں دن دلی کی اہم یونیورسٹیوں کے طلبا وطالبات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ ان کے علاوہ دیگر شائقین ادب بھی اس سمینار میں موجود رہے۔

یقیناً اپنے موضوع اور نوعیت کے اعتبار سے یہ سمینار انتہائی منفرد اور کامیاب رہا۔ اس سمینار کے ذریعے معاصر اردو ادب کے تحقیقی تنقیدی اور تخلیقی منظر نامے کے بہت سے پوشیدہ زاویوں سے پردہ اٹھا اور بہت سے امکانات کے در وا ہوئے۔ قوی امید ہے کہ یہ سمینار اردو ادب کے معاصر منظر نامے پر ایک سنگ میل ثابت ہوگا۔

■

Shahla Kaleem
Research Scholar,
Lohit Hostel, Girl's wings, JNU
New Delhi- 110067
shehlakaleem5@gmail.com

قلمکاروں سے چند معروضات

ماہنامہ 'اردو دنیا' علمی اور ادبی مجلہ ہے جس میں ادبیات، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب و ثقافت، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس و ٹکنالوجی، طب و فلسفہ، فنونِ لطیفہ، نفسیات، زبان کی زمینی صورت حال، عالمی ادبیات اور دیگر موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ خالص علمی اور ادبی نوعیت کا رسالہ ہے۔ اس میں مذہبی مباحث اور متنازعہ فیہ مسائل پر مضامین کی اشاعت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ رسالہ صرف 100 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس رسالے میں پوری اردو دنیا کے دانشوروں، ادیبوں اور قلمکاروں کی تحریریں اشاعت کے لیے موصول ہوتی ہیں۔ بہت سے مضامین اشاعت کے لیے منظور کرلیے جاتے ہیں لیکن بہت سی تحریریں اشاعت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ بہ کثرت مضامین موصول ہونے کی وجہ سے ادارے کو بہت سی دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے قلمکاروں سے گذارش ہے کہ اپنی تحریریں بھیجتے وقت مندرجہ ذیل امور کا بطورِ خاص لحاظ رکھیں۔

- مضمون غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلے میں ارسال نہ کیا گیا ہو اور نہ ہی اپنی یا کسی مرتب کردہ کتاب میں شامل ہو۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 2500 (پچیس سو) الفاظ سے کم اور 4000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں اور مضمون کے آخر میں حوالے/ حواشی (کتب اور مضامین) کا اندراج ضرور کریں۔
- اچھوتے، نئے اور اہم موضوعات پر بھیجے ہوئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے اور عمومی نوعیت کے مضامین کی اشاعت موصول ہونے کی ترتیب کے لحاظ سے کی جائے گی۔
- ایسے موضوعات یا شخصیات پر مضامین کی اشاعت ممکن نہیں جن پر بہ کثرت کتابیں یا مقالے شائع ہو چکے ہوں۔ ایسے موضوعات/شخصیات پر مضامین بھیجتے وقت چند سطروں میں نئے نکات اور نئے زاویے کی نشاندہی لازمی ہوگی۔
- جن مضامین میں زبان و بیان کی خامیاں اور حقائق، حوالے املا جملہ کی غلطیاں ہوں گی انھیں کسی بھی صورت میں اشاعت کے لیے منظور نہیں کیا جائے گا۔
- مضمون میں اشعار اور اقتباس کی صحت کا التزام اور ضرورت سے زیادہ اشعار اور اقتباسات سے پرہیز لازمی ہے۔
- شخصیات پر مضمون بھیجتے وقت متعلقہ فنکار کی تصویریں، کتابوں کا عکس اور دیگر ضروری معلومات ضرور ارسال کریں۔
- شہر یا ادارے پر لکھتے ہوئے اس سے متعلق تصاویر اور دیگر اہم معلومات لازمی بھیجیں۔
- درج ذیل تصدیق نامہ موصول ہوئے بغیر مضمون کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا:

''میرا مضمون غیر مطبوعہ ہے۔ کسی اخبار/ مجلہ/ اپنی یا مرتب کردہ کتاب میں شامل نہیں ہے۔ یہ کسی کتاب/ مضمون کا سرقہ یا چربہ نہیں ہے۔ اگر کچھ نقص پایا گیا تو اس کے لیے میں خود ذمہ دار ہوں گا/ ہوں گی۔''

- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

—ادارہ

ای آر محمد عادل

اردو غزل میں نظام شمسی

صدیوں سے کائنات کا مشاہدہ اور مطالعہ انسان کے لیے دلچسپی کا موضوع رہا ہے۔ جب ہم غور وفکر کرتے ہیں تو یہ راز آشکار ہوتا ہے کہ یہ کائنات ہماری فہم وادراک سے بھی زیادہ پر اسرار اور وسیع ہے۔ یہاں بے شمار کہکشائیں، لاتعداد ستارے اور سیارے موجود ہیں۔ ہماری یہ کائنات بے شمار عجائبات کی مظہر ہے۔ یہاں ایسی ایسی چیزیں وجود رکھتی ہیں جن کا مشاہدہ انسان روئے زمین پر رہ کر نہیں کر سکتا ہے جس کے لیے ہم کو خلاؤں کا سفر طے کرنا ہوگا۔ موجودہ دور کی سائنس آج اس قابل ہوگئی ہے کہ وہ روز بروز خلاؤں میں تحقیق کر کے اس سے متعلق نئی نئی وضاحتیں کر رہی ہے، جس کے سبب عصر حاضر کا انسان بہت سی سائنسی حقیقتوں سے آشنا ہو سکا ہے۔ سائنسدانوں اور ماہرین فلکیات کی کوششوں کے نتیجے میں آج انسان ان سوالات کا جواب بھی حاصل کر چکا ہے جن کو وہ برسوں سے تلاش کر رہا تھا اور جو بھی اس کے لیے معمہ بنے ہوئے تھے۔ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ صرف ماہرین فلکیات ہی نہیں بلکہ ہمارے معاشرے اور سماج و کائنات کے مسائل پر نظر رکھنے والے شعرا کے اذہان میں بھی فلکیات سے متعلق موضوعات گردش کرتے رہتے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ اردو شاعری میں بھی نظام شمسی اور اس سے متعلق سیاروں اور دیگر اجرام فلکی کی بھر پور عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے، کیونکہ اس نے عربی اور فارسی سے اپنا خمیر اٹھایا تھا۔ عربی و فارسی کے بہت سے شعرا گزرے ہیں جنھیں علم فلکیات میں گہری دلچسپی تھی۔ اس لیے انھوں نے علامتوں استعاروں میں ڈھال کر علم فلکیات اور اس سے متعلق اجرام فلکی کی منفرد ترجمانی کی۔ خود ہندوستان میں علم فلکیات میں دلچسپی رکھنے والے بڑے بڑے عالم تھے۔ اس لیے عوام کے لیے بھی یہ موضوع کوئی نیا نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شعرا نے اردو شاعری میں علم فلکیات کے مختلف موضوعات کو پیش کیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمارے شعرا نے شعوری اور غیر شعوری طور پر ایسے بہت سے اشعار رقم کر دیے ہیں، جو عصر حاضر کی جدید تحقیقات کے عین مطابق لگتے ہیں۔ لہٰذا اس تحقیقی مضمون میں اردو غزل میں ایسے اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے جو نظام شمسی اور اس سے متعلق اجرام فلکی کے پر اسرار حقائق کے ترجمان ہیں۔

جب انسان خلا کی وسعتوں سے آشنا ہوا تو اس کے دل میں تجسس پیدا ہوا کہ وہ ستاروں سے آگے جا کر نئے جہان کی تلاش کرے اور خلا میں پیش آنے والے نئے نئے چیلنجز کو حل کرے۔ جیسے جیسے یہ تحقیق کرتا گیا خلاؤں سے متعلق نئے نئے راز آشکار ہوتے گئے۔ اسی کی تحقیق کا ثمرہ ہے کہ آج ہم نظام شمسی سے متعلق پوشیدہ معلومات کو جان سکے ہیں۔ راز بنارسی کا ایک شعر دیکھیں جس میں شاعر نظام شمسی کا قصیدہ پڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔

اپنے اس اک نظام شمسی میں
دیکھو پوشیدہ راز کتنے ہیں

شاعر اپنے اس شعر میں نہ صرف نظام شمسی کی تعریف کر رہا ہے بلکہ اس کے پوشیدہ رازوں سے آشکار ہونے کی دعوت بھی دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم کو اپنے اس نظام شمسی سے واقفیت رکھنا ضروری ہے اور اس بات کو بھی سمجھنا ضروری ہے کہ اس میں کتنے راز پوشیدہ ہیں۔ اگر ہم اپنے اس نظام شمسی میں پوشیدہ رازوں سے واقف ہو جاتے ہیں تو اس وسیع کائنات میں موجود اسی طرح کے دوسرے نظاموں کو سمجھنے اور ان کے رازوں کو سلجھانے میں بہت مدد ملے گی۔ دراصل شاعر اپنے اس شعر کے ذریعے ذہنوں کو بیدار کرنا چاہتا ہے، کیونکہ ایک ماہر فلکیات کی طرح اس کے دل و دماغ میں بھی وہ سوالات ہل چل مچا

رہے ہیں جن سوالات کا جواب جدید سائنس تلاش کر رہی ہے۔ اسی ضمن میں فراق گورکھپوری کا یہ شعر دیکھیں۔

اس میں لاکھوں نظام شمسی ہیں
یوں تو دل تیرہ روزگار بھی ہے

مصرع 'اس میں لاکھوں نظام شمسی ہیں' فراق کی علم کونیات سے واقفیت ظاہر کرتا ہے۔ شاعر بخوبی اس بات سے آشنا ہے کہ ہماری کائنات میں صرف ہمارا نظام شمسی ہی نہیں بلکہ اس میں ایسے لاکھوں نظام شمسی وجود رکھتے ہیں۔

نظام شمسی سورج اور ان تمام اجرام فلکی کے مجموعے کو کہتے ہیں جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر سورج کی ثقلی گرفت میں ہیں۔ اس میں 8 سیارے ان کے 162 معلوم چاند، 3 شناخت شدہ بونے سیارے (Dwarf Planet) جس میں پلوٹو بھی شامل ہے، ان کے 4 معلوم چاند اور کروڑوں دوسرے چھوٹے اجرام فلکی شامل ہیں۔ ہمارا نظام شمسی آٹھ سیاروں، ہر سیارے کے اردگرد گردش کرتے متعدد چاند اور اربوں، کھربوں شہاب ثاقب سے مل کر بنا ہے اور آج کی جدید سائنس اور ماہرین کا یہ بھی ماننا ہے کہ ہماری کہکشاں جسے ملکی وے کہا جاتا ہے جس میں ہمارا نظام شمسی بھی آتا ہے۔ اسی طرح کی اربوں اور کھربوں کہکشائیں بھی اس خلا میں اپنا وجود رکھتی ہیں اور ہر ستارے یعنی سورج کے اپنے اپنے سیارے ہیں۔ جو مسلسل اس کے اردگرد گردش کر رہے ہیں۔

نظام شمسی اور دیگر اجرام کے اس تعلق سے غزل کا ایک شعر دیکھیں جس میں شاعر نظام شمسی کے درمیان کام کرنے والی قوت سے بندھے ہونے کا ذکر کر رہا ہے۔

بندھے ہوئے ہیں بنا ڈور کے سبھی رشتے
نظام شمسی میں جیسے کھنچاؤ کی صورت

(ایوب خاں بسمل)

ایوب خاں بسمل اپنے اس شعر کے ذریعے نظام شمسی میں سورج اور دیگر اجسام کے درمیان موجود قوت ثقل (Gravitional force) کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ ہمارے نظام شمسی کا محور سورج ہے جس نے ایک خاص قوت کے ذریعے سیاروں کو جکڑ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سیارے ایک مخصوص فاصلے پر اپنے مدار کے اندر رہتے ہوئے سورج کا طواف کرتے ہیں۔

سورج کے گرد مدار میں گردش کرنے والے اجسام کو ماہرین فلکیات تین گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں جو اس طرح ہیں۔ سیارے، بونے سیارے (Dwarf Planet) اور چھوٹے شمسی اجسام (Small Solar System Bodies)۔

ماہرین کا خیال ہے کہ ہمارا نظام شمسی نیبولائی نظریے کے مطابق وجود میں آیا ہے۔ یہ نظریہ سب سے پہلے عمانویل کینٹ نے 1755 میں پیش کیا تھا۔ اس نظریے کے مطابق 4 ارب 600 کروڑ سال پہلے ایک بہت بڑے مالیکیولی بادل کے ثقلی انہدام (Gravitational collapse) کی وجہ سے نظام شمسی کی تشکیل ہوئی۔ یہ بادل شروع میں اپنی وسعت میں کئی نوری سال پر محیط تھا اور خیال ہے کہ اس کے انہدام سے کئی ستاروں نے جنم لیا ہوگا۔ قدیم شہابیوں میں ایسے عناصر کے معمولی ذرات (Traces) پائے گئے ہیں جو صرف بہت بڑے پھٹنے والے ستاروں (Exploding stars) میں تشکیل پاتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سورج کی تشکیل ستاروں کے کسی ایسے جھرمٹ خوشۂ انجم (Star cluster) میں ہوئی جو اپنے قریب کے کئی سپر نووا دھماکوں کی زد میں تھا۔ ان دھماکوں سے پیدا ہونے والی لہروں (Shock wavess) نے اپنے پاس پڑوس کے نیبولا کے گیسی مادے پر دباؤ ڈال کر زیادہ گیسی کثافت کے خطے پیدا کر دیے جس سے سورج کی تشکیل کی ابتدا ہوئی۔ اور پھر اس کے بعد ہمارا نظام شمسی اور اس کے سیارے بنے۔ ندا فاضلی کی غزل کا ایک شعر دیکھیں جس میں شاعر نیبولائی نظریے کی ترجمانی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

کہیں نہیں کوئی سورج دھواں دھواں ہے فضا
خود اپنے آپ سے باہر نکل سکو تو چلو

گویا ندا فاضلی سورج بننے سے قبل نیبولائی عمل کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ اور اس وقت کی منظر کشی کر رہے ہیں جب سورج کا وجود بھی نہیں تھا۔ یعنی وہ اپنے بننے کے ابتدائی مراحل میں تھا۔ ان حقائق کی تائید عصر حاضر کے سائنسی انکشافات بھی کرتے ہیں۔ جب سائنسدانوں نے جیم ویب ٹیلسکوپ کی مدد سے اربوں سال پیچھے خلا میں جھانکا تو کائنات کے وجود میں آنے سے متعلق بہت سے راز آشکار ہوئے۔ شعر کا پہلا مصرع 'کہیں نہیں کوئی سورج دھواں دھواں ہے فضا' نیبولائی بادلوں کا ترجمان ہے۔ دوسرا مصرع ''خود اپنے آپ سے باہر

نظام شمسی سورج اور ان تمام اجرام فلکی کے مجموعے کو کہتے ہیں جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر سورج کی ثقلی گرفت میں ہیں۔ اس میں 8 سیارے ان کے 162 معلوم چاند، 3 شناخت شدہ بونے سیارے (Dwarf Planet) جس میں پلوٹو بھی شامل ہے، ان کے 4 معلوم چاند اور کروڑوں دوسرے چھوٹے اجرام فلکی شامل ہیں۔

نکل سکو تو چلو' اپنی محدود کائنات سے باہر نکل کر تحقیق کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اسی ضمن میں ایک اور شعر دیکھیں۔

نہیں ہے کوئی بھی سورج خلا کے صحرا میں
جہاں بھی دیکھیے گرد و غبار چھایا ہے

(عادل فراز)

بہرحال ہماری اس کائنات میں صرف ہمارا ہی نظام شمسی نہیں اس سے بھی بڑے بڑے ستارے اور ان کا نظام وجود رکھتا ہے۔ اگر ہم اپنے نظام شمسی کے محدود دائرے سے باہر نکل کر دیکھیں تو اربوں کھربوں کہکشائیں ہماری منتظر ہیں۔ لیکن ان تک رسائی تب ہی ممکن ہے جب ہم لاکھوں نوری سال کی مدت طے کر کے ان تک پہنچیں گے۔ لیکن اس کے لیے ہمیں روشنی کی رفتار سے سفر کرنا ہوگا۔ اس ضمن میں راحت اندوری کا ایک شعر دیکھیں۔

سوال یہ ہے کہ رفتار کس کی کتنی ہے
میں آفتاب سے آگے نکل کے دیکھوں گا

یہاں یہ شعر اپنے دامن میں بہت سے مفاہیم کو سمیٹے ہوئے نظر آتا ہے۔ پہلا یہ کہ راحت نظام شمسی میں

موجود سورج اور اس سے متعلق اجرام فلکی کی گردش کی رفتار کی پیمائش کی بات کر رہے ہیں۔ تبھی کہتے ہیں 'سوال یہ ہے کہ رفتار کس کی کتنی ہے' دوسرا مطلب یہ بھی لیا جاسکتا ہے کہ وہ خلا میں سفر کرنے کی رفتار یعنی لائٹ کی اسپیڈ سے سفر کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ یعنی عصر حاضر میں ہمارے خلائی جہاز کی کتنی رفتار ہے۔ اور ہمارے موجودہ نظام شمسی میں آفتاب اور اس سے آگے کا سفر طے کرنے میں ہمیں کتنی رفتار سے سفر کرنا ہوگا۔ ان تمام باتوں کی طرف راحت اندوری کا یہ شعر ذہن کو مرکوز کرتا ہے۔

سورج (SUN): سورج ہماری زمین کے لیے روشنی اور حرارت کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس کے ذریعے ہمارے نظام شمسی کا نظام قائم و دائم ہے۔ یہ ہماری کہکشاں مِلکی وے کے مرکزے سے تقریباً 30 ہزار نوری سال کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ ہمارے نظامِ شمسی کا مرکز ہے۔

سورج زیادہ تر ہائیڈروجن اور ہیلئم گیسوں پر مشتمل ہے۔ اس کے مرکز میں ایک بڑا نیوکلیائی ری ایکٹر ہے۔ جس کا درجۂ حرارت کم از کم ایک کروڑ 40 لاکھ سینٹی گریڈ (2 کروڑ 50 لاکھ فارن ہائیٹ) ہے۔ سورج نیوکلیائی فیوژن کے ذریعے توانائی پیدا کرتا ہے۔ نیوکلیائی فیوژن سے مراد وہ عمل ہے جس سے ہائیڈروجن ہیلئم میں تبدیل ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ توانائی کا اخراج بھی ہوتا ہے۔ سورج 40 لاکھ ٹن فی سیکنڈ کی شرح سے توانائی کی صورت اپنی کمیت کا اخراج کر رہا ہے۔ جو زمین کی کمیت کا 3,30,000 گنا اور نظام شمسی کے تمام سیاروں کی کمیت کا 745 گنا ہے۔ سورج کا قطر 13,92,000 کلومیٹر (8,63,000 میل) ہے جو زمین کے قطر سے 109 گنا بڑا ہے۔ سورج کا حجم زمین سے 13 لاکھ گنا زیادہ ہے۔ اس کے اطراف میں 8 بڑے سیارے، ان کے چاند، سیاروں کے مابین واقع چھوٹے اجسام، ہزاروں سیارچے، دمدار تارے، شہابیے گردش کرتے رہتے ہیں۔

اردو غزل میں شعرا نے جہاں سورج کو اپنی شاعری میں علامت اور استعارے کے پیرائے میں ڈھال کر پیش کیا ہے وہیں انھوں نے سورج کے اطراف گردش کررہے اجرام فلکی اور سیاروں کی بھی منظر کشی اپنے اشعار میں منفرد انداز میں کی ہے۔ غزل کا ایک شعر دیکھیں

سورج ہماری زمین کے لیے روشنی اور حرارت کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس کے ذریعے ہمارے نظام شمسی کا نظام قائم و دائم ہے۔ یہ ہماری کہکشاں مِلکی وے کے مرکزے سے تقریباً 30 ہزار نوری سال کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ ہمارے نظامِ شمسی کا مرکز ہے۔

جس میں شاعر اسی فکر کا ترجمان نظر آتا ہے۔

زد میں سیاروں کی کیسے آ گیا سورج مرا
سوچتا ہوں بارہا پر راز کھل پاتا نہیں
(محسن فتح پوری)

شاعر اپنے اس شعر میں نظام شمسی میں موجود سورج کے اطراف میں گردش کر رہے سیاروں کے بارے میں بات کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور اس کے پیچھے کے سائنسی عمل کو سمجھنے کی دعوت دیتا ہے۔ اردو غزل کا ایک اور شعر ملاحظہ کریں یہ شعر بھی اسی سائنسی فکر کا ترجمان ہے۔

سورج یہ نظام شمسی کا دیتا ہے اجالے دنیا کو
کیا راز ہے اس میں پوشیدہ سمجھو تو ہمیں بھی سمجھانا
(جاوید اعظمی)

عطارد (Mercury): عطارد ہمارے نظام شمسی کا سب سے اندرونی سیارہ ہے۔ جو سورج کے گرد ایک چکر زمینی اعتبار سے 87.969 دنوں میں پورا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ سورج کے گرد لگانے والے ہر دو چکروں میں عطارد اپنے محور کے گرد تین بار گردش کرتا ہے۔ چونکہ زمین سے عطارد ہمیشہ سورج کے قریب دکھائی دیتا ہے اس لیے عطارد کا مشاہدہ عموماً سورج گرہن کے دوران ہی کیا جاسکتا ہے۔ شمالی نصف کرے پر عطارد کو دیکھنے کے لیے غروب آفتاب کے فوراً بعد یا طلوع آفتاب سے ذرا قبل کا وقت مناسب ہوتا ہے۔ ماہرین فلکیات کے مطابق عطارد کے بارے میں نسبتاً بہت کم معلومات موجود ہیں۔ زمین سے دور بین سے کیے جانے والے مشاہدات سے ہلال کی شکل کا عطارد دکھائی دیتا ہے تاہم زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوتی۔ عطارد کو جانے والے دو خلائی جہازوں میں سے پہلا جہاز 'میرینز دہم' تھا۔ جس نے 1974 سے 1975 کے دوران عطارد کے 45 فیصد حصے کی نقشہ کشی کی تھی۔ دوسرا جہاز 'میسینجر' تھا۔ جو عطارد کے مدار میں 17 مارچ 2011 کو داخل ہوا اور بقیہ حصے کی نقشہ کشی میں مصروف ہوگیا ہے۔ سطح کی درجہ حرارت منفی 183 سے 427 درجے تک رہتا ہے۔ سورج کی دھوپ والے حصے سب سے زیادہ گرم ہیں جب کہ قطبین کے نزدیک والے گڈھے سب سے سرد مقام ہیں۔ اس کے اندر بہت بڑی مقدار میں لوہا پایا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا مقناطیسی میدان زمین کے مقناطیسی میدان کا محض ایک فیصد ہے۔ اپنے چھوٹے حجم اور لوہے کے اندرونی ڈھانچے کے باعث عطارد کثیف ہے۔ عطارد شکل میں ہمارے چاند سے مشابہ ہے اور شہابیوں کے گرنے سے پیدا ہونے والے گڑھے یہاں بے شمار ہیں۔ اس کا اپنا کوئی قدرتی چاند نہیں ہے اور نہ ہی کوئی خاص فضا ہے۔ اردو غزل کا شاعر جب اپنی غزل میں عطارد کا ذکر کرتا ہے تو اس کی اس خصوصیت کو کچھ اس طرح بیان کرتا ہے۔

رکھتا نہیں ہوں آج کوئی اپنے پاس چاند
کیا میں بھی ہوگیا ہوں عطارد تری طرح
(زبیر صدیقی)

زمین سے دیکھنے پر عطارد سورج کے سب سے قریب دکھائی دیتا ہے۔ اس حقیقت کی ترجمانی میں ایک شعر ملاحظہ کریں:

قربت تری خورشید سے رہتی ہے برابر
اس واسطے ہم تجھ کو عطارد ہی کہیں گے
(شمیم عارف)

زہرہ (Venus): سورج سے دوسرا سیارہ ہے اور سورج کے گرد ایک چکر زمینی وقت کے مطابق 224.7 دنوں میں مکمل کرتا ہے۔ اس کا نام قدیم رومن دیوی 'وینس' کے نام پر رکھا گیا ہے جو محبت و حسن کی دیوی کہلاتی تھی۔ رات کے وقت آسمان پر ہمارے چاند

کے بعد دوسرا روشن ترین خلائی جسم ہے۔اس کی روشنی سایہ بناسکتی ہے یہ سیارہ عموماً سورج کے آس پاس ہی دکھائی دیتا ہے۔سورج غروب ہونے سے ذرا بعد یا سورج طلوع ہونے سے ذراقبل زہرہ کی روشنی تیز ترین ہوتی ہے۔اس وجہ سے اسے صبح یا شام کا ستارہ بھی کہا جاتا ہے۔زہرہ کو ہمارے شعرانے محبوب کے حسن کی ترجمانی میں بطور علامت بھی استعمال کیا ہے۔اس سے متعلق اشعار دیکھیں۔

نظر جب بھی زہرہ جبیں کوئی آئی
ستارہ صبح کا مجھے یاد آیا

(نوید اشرف)

زہرہ دکھائی دینے لگا آسمان پر
سورج نکلنے والا ہے اپنے مکان پر

(جمیل کوثر)

زہرہ زندگی کی علامت بھی ہے اور حسن کا ترجمان بھی۔اس کا دیدار ہونے پر یہ خبر بھی ملتی ہے کہ کچھ دیر میں اندھیرا دور ہو جائے گا یا سحر نمودار ہوگی کیونکہ سورج طلوع ہونے والا ہے۔اس سے متعلق اشعار دیکھیں۔

بنام زہرہ جبینان خطۂ فردوس
کسی کرن کو جگاؤ بڑا اندھیرا ہے

(ساغر صدیقی)

نہ تیرگی کے لیے ہوں نہ روشنی کے لیے
ستارہ سحری ہوں میں زندگی کے لیے

(عین سلام)

زمیں کی گود سے سورج نکالنے والو
ستارۂ سحری رہنما نہ ہو جائے

(اسلم فرخی)

زمین(Earth): نظام شمسی میں سورج کا تیسرا نزدیک ترین سیارہ ہے۔زمین کی بیرونی سطح پہاڑوں، ریت اور مٹی کی بنی ہوئی ہے۔ پہاڑ زمین کی سطح کا توازن برقرار رکھنے کے لیے بہت ضروری ہیں۔اگر زمین کو خلا سے دیکھا جائے تو ہمیں سفید رنگ کے بڑے بڑے نشان نظر آئیں گے۔زمین کا صرف ایک چاند ہے۔ زمین کا شمالی نصف کرہ زیادہ آباد ہے جبکہ جنوبی نصف کرہ میں سمندروں کی تعداد زیادہ اور خشکی کم ہونے کی وجہ سے کم آبادی ہے۔

قطب شمالی اور قطب جنوبی پر چھ ماہ کا دن اور چھ ماہ کی رات رہتی ہے۔ عام دن اور رات کا دورانیہ چوبیس گھنٹے کا ہوتا ہے۔ماہرین فلکیات کے مطابق نظام شمسی میں واحد ہماری زمین ہی ایک ایسا سیارہ ہے جس پر حیات پائی جاتی ہے۔اس فکر کی ترجمانی میں ایک شعر دیکھیں۔

یہی زمین ہے واحد نظام شمسی میں
جہاں حیات کا اک کاروبار چلتا ہے

(عادل فراز)

ماہرین فلکیات کا یہ بھی ماننا ہے کہ ہماری زمین اور سورج کے اردگرد گردش کر رہے سیارے دراصل سورج کے ہی ٹکڑے ہیں جو اس سے ٹوٹ کر الگ ہوئے تھے۔اس کی عکاسی میں ایک شعر ملاحظہ کریں۔

اسی زمین نے سب کو حیات بخشی ہے
جدا ہوئی تھی کبھی آگ کے سمندر سے

(شعلہ بجنوری)

ماہرین فلکیات جہاں اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ اس کائنات میں صرف ہمارا نظام شمسی نہیں بلکہ اس جیسے اور بھی لاتعداد نظام وجود رکھتے ہیں۔جس میں سورج اور اس کے اردگرد سیارے گردش کررہے ہوں گے۔ یعنی ہماری زمین کی طرح اور بھی لاتعداد زمینیں ہوں گی۔اس فکر کی ترجمانی میں کیفی اعظمی کا ایک شعر دیکھیں۔

میں ڈھونڈتا ہوں جسے وہ جہاں نہیں ملتا
نئی زمین نیا آسماں نہیں ملتا

(کیفی اعظمی)

گویا کیفی اعظمی نئے نظام شمسی اور اس میں موجود نئی زمینوں کی تلاش کرنے کی طرف ذہن کو مرکوز کر رہے ہیں۔

مریخ(Mars): مریخ نظام شمسی میں سورج سے فاصلے کے لحاظ سے چوتھا اور عطارد کے بعد دوسرا سب سے چھوٹا سیارہ ہے۔مریخ کی سرخ رنگت کی وجہ سے اسے سرخ سیارہ بھی کہا جاتا ہے۔یہ سرخ رنگ مریخ کی سطح پر آئرن آکسائڈ کی کثرت کی وجہ سے ہے۔مریخ ایک زمین مماثل سیارہ ہے جو زمین کی نسبت ہلکا کرہ ہوائی رکھتا ہے۔مریخ کے دو چاند ہیں جنہیں 'فوبوس' اور 'ڈیموس' کہتے ہیں۔اردو غزل کا شاعر جب مریخ کو اپنی غزل میں پیش کرتا ہے تو کہتا ہے۔

آنکھوں میں اتنی سرخی مریخ لگ رہے ہو
محفل میں چل رہے ہو دو چاند ساتھ لے کر

(خورشید ضیغم)

مشتری(Jupiter): ہمارے نظام شمسی میں مشتری سورج سے پانچواں اور سب سے بڑا سیارہ ہے۔گیس جائنٹ ہونے کے باوجود اس کا وزن سورج کے ایک ہزارویں حصے سے بھی کم ہے۔لیکن نظام شمسی کے دیگر سیاروں کے مجموعی وزن سے زیادہ بھاری ہے۔مشتری آسمان پر سورج، چاند اور زہرہ کے بعد چوتھا روشن ترین اجرام فلکی ہے۔شمیم کرہانی اپنے ایک شعر میں زہرہ، مشتری، اور ماہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

دل بھی کیا راہ گزر ہے کہ ہمیشہ جس میں
زہرہ و مشتری و ماہ چلا کرتے ہیں

شمیم کرہانی کا یہ شعر اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ شاعر اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ ہمارے نظام شمسی میں مشتری کے علاوہ زہرہ اور چاند بھی روشن ترین اجسام ہیں۔اور شاعر کے دل میں ہمیشہ ان کے

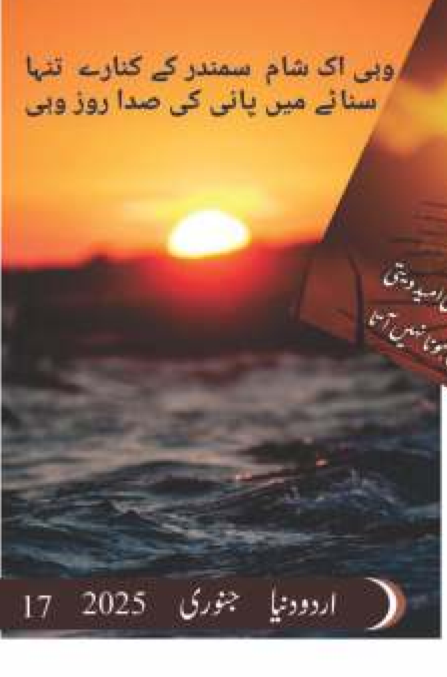

بارے میں جاننے کی خواہش پیدا ہوتی رہتی ہے۔

زحل (Saturn): زحل ہمارے سورج سے چھٹے نمبر پر ہے جب کہ ہمارے نظامِ شمسی کا دوسرا بڑا سیارہ ہے۔ زحل کے گرد 62 چاند دریافت ہو چکے ہیں۔ اس کے گرد نو دائرے ہیں جو زیادہ تر برفانی ذرات سے بنے ہیں جب کہ کچھ میں پتھر اور دھول بھی موجود ہے۔ اردو غزل کا یہ شعر دیکھیں جس میں شاعر منفرد انداز میں زحل اور اس کے اطراف میں پائے جانے والے دائروں کی ترجمانی کرتا ہے۔

ایسا گھرا ہوا ہے محفل میں دائروں کی
مثلِ زحل ہوا ہے وہ مہ جبیں ہمارا
(ہلال نقوی)

صمد رضا بھی اپنی غزل کے ایک شعر میں زحل کے بارے میں جاننے اور تحقیق کرنے کے لیے آمادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

چاند پر جاؤ کہ مریخ پہ پہنچو
اس سے آگے کی نہ سوچو کہ زحل پڑتا ہے

یورینس (Uranus): ہمارے نظامِ شمسی میں سورج سے ساتواں سیارہ یورینس ہے۔ یہ سیارہ اپنے رقبے کے اعتبار سے تیسرا جب کہ وزن کے اعتبار سے چوتھا بڑا سیارہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس سیارے کا نام یونانی دیوتا یورینس کے نام پر رکھا گیا ہے جو آسمان کا دیوتا کہلاتا ہے۔ دیگر سیاروں کی طرح یورینس کے گرد بھی چھلے پائے جاتے ہیں اور اس کا اپنا مقناطیسی فضائی کرہ اور کئی چاند بھی ہیں۔ ماہرین کے مطابق یورینس کے اب تک کل 27 قدرتی چاند دریافت ہو چکے ہیں۔ جن کے نام شیکسپیئر اور الیگزینڈر پوپ کی تحاریر سے لیے گئے ہیں۔ پانچ بڑے چاندوں کے نام میرانڈا، ایریل، امبریل، ٹائٹانیہ اور اوبیرون ہیں یورینس کی فضا زحل اور مشتری سے ملتی جلتی ہے اور اس میں ہائیڈروجن اور ہیلیئم پائی جاتی ہے۔ اس کی فضا میں پانی، امونیا اور میتھین سے بنی برف زیادہ پائی جاتی ہے۔ ہمارے نظامِ شمسی کی یہ سرد ترین فضا ہے جس کا کم سے کم درجہ حرارت منفی 224 ڈگری سینٹی گریڈ ہے۔ بناوٹ کے اعتبار سے یورینس نیپچون سے بھی مشابہت رکھتا ہے۔ اردو غزل کا ایک شعر دیکھیں جس میں شاعر اس مشابہت اور نظامِ شمسی میں ان کے آخر میں ہونے کی بات کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

سورج تیری محفل میں یہ جڑواں نظر آئے
کیا کام ہے ان کا کوئی بتلائے جہاں کو
(زاہد اسرار)

یورینس نیپچون ہوں کیا
ذکر آیا ہے میرا آخر میں
(حامد مشتاق)

نیپچون (Neptune): ہمارے نظامِ شمسی میں نیپچون آٹھواں اور سورج سے بعید ترین سیارہ ہے۔ اسے روم کے سمندری دیوتا کے نام پر نیپچون کہا گیا ہے اور نصف قطر کے لحاظ سے چوتھا جبکہ کمیت کے اعتبار سے تیسرا بڑا سیارہ ہے۔ نیپچون زمین سے 17 گنا زیادہ وزن رکھتا ہے اور اپنے جڑواں یورینس سے کچھ زیادہ بھاری ہے۔ زمین کی نسبت اس کا سورج سے اوسط فاصلہ 30 گنا زیادہ ہے۔

سورج سے دوری کی بنا پر اس کی فضا ہمارے نظامِ شمسی کے سرد ترین مقامات میں سے ایک ہے۔ بادلوں کے بالائی سرے پر درجۂ حرارت منفی 218 ڈگری تک پہنچ جاتا ہے جبکہ سطح پر درجۂ حرارت تقریباً 5000 ڈگری سینٹی گریڈ رہتا ہے۔ نیپچون کے گرد مدھم سے حلقے پائے جاتے ہیں جنھیں پہلی بار 1960 کی دہائی میں دریافت کیا گیا۔

نیپچون کے اب تک 14 معلوم چاند ہیں۔ سب سے بڑا اور تمام چاندوں کے مجموعی وزن کے 99.5 فیصد کمیت کا حامل چاند ٹریٹن ہے جو کروی شکل کا ہے۔ اسے ولیم لاسل نے نیپچون کی دریافت کے محض 17 دن بعد دریافت کیا تھا۔ پورے نظامِ شمسی میں یہ واحد چاند ہے جس کی حرکت سیارے کے مخالف سمت ہے۔ اس سے متعلق غزل کا ایک شعر دیکھیں۔

سورج کی بزم میں یہی واحد ملا ہے چاند
گردش میں مختلف ہے ہر اک اعتبار سے
(انعام رضا)

غزل کا یہ شعر غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے کہ آخر ہمارے نظامِ شمسی میں نیپچون کا چاند ٹریٹن اپنے سیارے سے مخالف سمت میں گردش کیوں کرتا ہے۔

پلوٹو (Pluto): ایک بونا سیارہ ہے جو 1930 میں دریافت ہوا تھا۔ پلوٹو 1930 سے 2006 تک نظامِ شمسی کے نویں سیارے کے طور پر جانا جاتا رہا ہے۔ لیکن 2006 میں نئی تحقیق کے بعد اس کو نظامِ شمسی کے سیارے کی حیثیت سے باہر نکال دیا گیا۔ ماہرین کا ماننا تھا کہ ایک سیارہ اپنے مدار میں آنے والے تمام سیارچوں کو اپنی جانب کھینچتا ہے یعنی اس کی اپنی بے پناہ کشش ثقل ہونی چاہیے۔ چونکہ سیارہ نیپچون کی کشش سیارے پلوٹو پر اثر انداز ہوتی ہے، اور سورج کے گرد گردش کے دوران ان کے مدار دو بار ایک دوسرے کو قطع کرتے ہیں، اس لیے، یونین کے نئے معیاروں کی وجہ سے پلوٹو کو سیارہ نہیں کہا جا سکتا، اور اس کا درجہ کم کر کے اسے ڈوارف پلینٹ یعنی بونے یا چھوٹے سیارے کا درجہ دیا گیا۔ اردو غزل کے اشعار دیکھیں جو پلوٹو کے نظامِ شمسی کے سیارے کی حیثیت سے باہر نکالے جانے کی ترجمانی کرتا نظر آتا ہے۔

کس لیے حسن کی محفل سے نکالا اس کو
کیا کہیں قد میں وہ سورج کے برابر تو نہیں
(سجاد حیدر)

میں انساں ہوں کوئی پلوٹو نہیں ہوں
نکالو نہ محفل سے بونا سمجھ کر
(عطاوارث)

اس میں کوئی شک نہیں کہ عصرِ حاضر کے شعرا نے نئے نئے موضوعات کو غزل کے پیرائے میں شامل کر کے اس کو نئے جہانِ معنی سے آشنا کرایا ہے۔ کیونکہ یہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے اور اب شعر و ادب کے تقاضے بھی بڑی تیزی کے ساتھ تبدیل ہو رہے ہیں اس لیے سائنسی رجحانات کو اردو غزل کے پیرائے میں ڈھال کر پیش کرنا بے حد ضروری ہے۔

غرض یہ کہ اردو غزل کے دامن میں اتنی وسعت ہے، جس میں نہ صرف ہمارے نظامِ شمسی کی ترجمانی کی جا سکتی ہے بلکہ اس میں کائنات کے تمام پہلوؤں اور اس کے حسن و جمال کو ایک مختصر سے شعر کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا جا سکتا ہے۔

کتابیات

1. کائنات کیسے وجود میں آئی مترجم 'مولانا محمد زکریا اقبال'
2. تخلیق کائنات مترجم 'عبدالستار'

E.R Mohd Adil
Hilal House, H. No: 4/114, Jagjeevan Colony
Naglah Mallah, Civil Line
Aligarh- 202001 (UP)
Mob.: 8273672110
mohdadil75@yahoo.com

شاہد وصی

تنقید کی زبان

تخلیق اور تنقید کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ادب میں جتنی اہمیت تخلیق کار کی ہے، اتنی ہی ناقد کی بھی ہے۔ تنقید کا بنیادی مقصد تفہیم متن اور فن پارے کی تعیین قدر ہے۔ تنقید نگار قاری اور فن پارے کے درمیان پل کا کام کرتا ہے۔ وہ فن پارے کا ادب میں معیار متعین کرتا ہے، وہیں اس کے محاسن ومعائب اور قدر و قیمت کا تعین بھی کرتا ہے۔ کلیم الدین احمد کی نگاہ میں تنقید کی ادب میں وہی حیثیت ہے جو کسی باغ اور گلستان میں مالی اور باغباں کی ہے۔ جس طرح باغباں قینچی کی مدد سے مرجھائے پتے اور خشک ہوچکی شاخوں کو کاٹ کرا سے خوشنما اور جاذب نظر بناتا ہے، بعینہ یہی کام ایک تنقید نگار کے ذریعے بھی انجام پاتا ہے۔ تنقید نگار کی ایک اہم ذمے داری یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ ادب میں کسی فن پارے کے لیے اصول وضع کرے اور اس کے ضابطے بنائے تا کہ ایک تخلیق کار ان اصول وضوابط کی روشنی میں اپنی تخلیقات کو ادبی منزل تک پہنچا سکے۔ دیگر بہت ساری اصناف سخن کی طرح تنقید کا فن بھی اردو میں مغرب کے زیر اثر پروان چڑھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مغربی ادبیات کی آمد سے پہلے مشرق میں اردو ادبا اور دانشوران کے اندر کوئی تنقیدی شعور نہیں تھا۔ وجہی سے لے کر عہد حاضر تک کے جتنے بھی فنکار و تخلیق کار گزرے ہیں سبھوں کے اندر ایک اچھا تنقیدی شعور موجود تھا، کیونکہ اس کے بغیر کوئی اچھا فن پارہ وجود میں ہی نہیں آسکتا۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ اردو زبان میں تنقید کے باضابطہ اصول مغربی ادبیات کے زیر اثر ہی بنائے گئے۔ آل احمد سرور اپنے ایک مضمون میں اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مغرب کے اثر سے اردو میں کئی خوشگوار اضافے ہوئے۔ ان میں سب سے اہم فن تنقید ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مغرب کے اثر سے پہلے اردو ادب میں کوئی تنقیدی شعور نہیں رکھتا تھا یا شعر و ادب کے متعلق گفتگو، شاعروں پر تبصرہ اور زبان و بیان کے محاسن پر بحث نہیں ہوتی تھی۔ بڑے تخلیقی کارنامے بغیر ایک اچھے تنقیدی شعور کے وجود میں نہیں آسکتے۔''

(تنقید کیا ہے؟ پروفیسر آل احمد سرور، ص142)

یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی تخلیقی کارنامہ یا کوئی بھی فن پارہ اسی وقت شاہکار اور ادبی کہلاتا ہے جب اس کے تخلیقی عمل میں تنقیدی شعور اور فنی بصیرت کام کررہی ہوتی ہے۔ اردو میں باضابطہ تنقید کی شروعات خواجہ الطاف حسین حالی کی کتاب 'مقدمہ شعر و شاعری' سے ہوتی ہے، لیکن تنقیدی خیالات و افکار ہمیں اس سے پہلے بھی ہر فنکار و تخلیق کار کے یہاں جا بہ جا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ حالی سے پہلے بھی وجہی سے لے کر میر و غالب تک بے شمار شہ پارے تخلیق کیے گئے، اگر ان تمام کے تخلیقی عمل کے دوران تنقیدی شعور کارفرما نہ ہوا ہوتا تو یہ فن پارے شاہکار نہیں بن سکتے تھے۔ پروفیسر احتشام حسین کا خیال ہے کہ اردو ادب کی پیدائش ہی اس وقت ہوئی جب پہلے سے بہت ساری زبانوں کے ادب موجود تھے اور اچھے یا برے تنقیدی معیارات وجود میں آچکے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہر ادیب کے پاس اعلی یا ادنی تنقید کا کوئی نہ کوئی معیار ضرور ہوتا ہے جو تخلیقی عمل کے ساتھ ساتھ جاری رہتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو اچھا تخلیقی عمل بھی وجود میں نہ آئے۔ گویا اچھی تخلیقی قوت، اچھی تنقیدی قوت کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔''

(ادبی تنقید کے مسائل: مشمولہ روایت اور بغاوت: سید احتشام حسین، ص14)

تخلیق کار ہو یا تنقید نگار وہ اپنے مافی الضمیر اور

اپنے جذبات وخیالات کے اظہار کے لیے جس آلے اور ذریعے کا انتخاب کرتا ہے وہ زبان ہے۔ انسان کو فطرت کی جانب سے جو بہت ساری صلاحیتیں اور خصوصیتیں ودیعت کی گئی ہیں، ان میں سب سے بڑی صلاحیت نطق یعنی بولنے کی صلاحیت ہے۔ زبان اسی صلاحیت نطق کا دوسرا نام ہے اور نثر اسی خاصہ نطق کی مربوط، منظم اور ترقی یافتہ شکل ہے۔ روز اول سے ہی انسان اپنے احساسات وخیالات کی تبلیغ وترسیل، اپنے مافی الضمیر کے اظہار اور اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے زبان ہی کو ذریعہ بناتا چلا آرہا ہے۔ زبان کے مختلف مشاہیر ادب نے مختلف اقسام بیان کیے ہیں۔ محی الدین قادری زور نے الفاظ کے اعتبار سے اسے چار قسموں میں بانٹا ہے۔: مرجز: مقفی: مسجع، عاری۔ اسی طرح معنی کے اعتبار سے انھوں نے زبان کو چار قسموں میں تقسیم کیا ہے: سلیس سادہ، سلیس رنگین، دقیق سادہ، دقیق رنگین۔ کہیں کہیں اسلوب کو زبان کے مترادف کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن ان دونوں میں قدرے اختلاف ہے۔ زبان جہاں اپنے اندر عمومی مفہوم رکھتی ہے، وہیں اسلوب ایک خاص معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

لغوی اعتبار سے اسلوب کو طرز، اسٹائل کہتے ہیں۔ اصطلاح میں اسلوب کسی فن کار کے انفرادی طرز اظہار اور انداز بیان کا نام ہے۔ یہ انفرادی طرز بیان اس فن کار کی شناخت اور پہچان ہوتی ہے۔ اسلوب کی تشکیل میں بہت سارے عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اوائل عمر میں کسی ادیب کا اسلوب کچھ ہوتا ہے اور مشق وتمرین اور مشاہدات وتجربات کے نتیجے میں کچھ اور ہوجاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اسلوب انداز بیان ہے، جس میں انسان اور فنکار کی شخصیت جھلکتی ہے۔ اسے پڑھنے والا، اسلوب پڑھتے ہی فنکار کو پہچان لیتا ہے۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے اردو کے نثری اسالیب میں مختلف مشاہیرین ادب کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اسلوب کو دس خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس اسلوب کے نمائندہ ادیبوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

''سادہ اسلوب:.. نمائندہ: سرسید، نذیر احمد، حالی، پریم چند، میر امن، عبدالحق۔

مرصع اسلوب:.. نمائندہ: ملا وجہی، عطا حسین تحسین، رجب علی بیگ سرور

شگفتہ اسلوب:.. نمائندہ: حسن نظامی، نیاز فتحپوری، مہدی افادی، محمد حسین آزاد، کرشن چندر، غالب

طنزیہ اسلوب:.. نمائندہ: غالب، سرشار، رشید احمد صدیقی، پطرس، کرشن، عصمت، فرحت اللہ بیگ

پرشکوہ اسلوب:.. نمائندہ: شبلی، ابوالکلام آزاد، محمد حسین آزاد، شرر، قاضی عبدالستار، رسوا

بیانیہ اسلوب:.. نمائندہ: سرسید، شبلی، رسوا، سرشار، نیاز، ابوالکلام آزاد، محمد حسین آزاد، عبدالحق، حیات اللہ

ہیجانی اسلوب:.. نمائندہ: سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، عزیز احمد

مخلوط اسلوب:.. نمائندہ: عبدالرحمٰن بجنوری، سجاد انصاری، قاضی عبدالستار، غالب، سرسید، ابوالکلام آزاد، انتظار حسین، محمد حسین آزاد، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر وغیرہ

محاوراتی اسلوب:... نمائندہ: میر امن دہلوی، عصمت چغتائی، راشد الخیری، نذیر احمد وغیرہ

رومانوی اسلوب:... نمائندہ: کرشن چندر، نیاز فتحپوری، مہدی افادی، عزیز احمد، قاضی عبدالغفار وغیرہ۔''

(اردو کے نثری اسالیب، شہاب ظفر اعظمی، ص 27-26)

زبان و اسلوب کے مذکورہ بالا اقسام کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ہر تخلیق کار و فنکار اپنے تخلیقی اظہار کے لیے کسی نہ کسی قسم کا سہارا لیتا ہے۔ بسا اوقات وہ اپنے ادبی اور تخلیقی اظہار کے لیے اس میں کئی طرح کے تصرفات بھی کرتا ہے۔ کبھی وہ تصرف جدت وندرت پیدا کرتا ہے اور کبھی صنف اس تصرف کی متقاضی ومتحمل نہیں ہوتی ہے۔ ادب میں زبان کے تخلیقی استعمال کی بڑی اہمیت ہے۔ زبان کے منفرد، انوکھے اور مخصوص استعمال سے کسی ادیب کو زبان کی یہ تخلیقیت حاصل ہوتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ زبان کے استعمال سے ہی اسلوب کی تشکیل ہوتی ہے۔ چونکہ کوئی بھی ادیب یا تخلیق کار فن پارے کی تعمیر میں زبان کا ہی استعمال کرتا ہے، اس لیے ہر ادبی شہ پارے میں اور ہر ادیب کے یہاں اسلوب کا پایا جانا لازمی ہے۔ اسی طرح زبان کی نوعیت ہر فن پارے اور ادیب کے یہاں بدلتی رہتی ہے، اس میں یکسانیت نہیں رہتی اور زبان کے ساتھ اسلوب بھی بدلتا رہتا ہے۔ داستان ہی کو لے لیں۔ فسانہ عجائب کی زبان مقفی، مرصع اور مسجع ہے۔ رانی کیتکی کی کہانی کی زبان سادہ اور عاری ہے، اسی طرح باغ و بہار میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ بھی سادہ اور سلیس ہے۔ بیسویں صدی کے اندر عموماً اکثر اصناف میں جو زبان استعمال کی گئی وہ سادہ اور سلیس ہی تھی۔ سبھوں کی یہی کوشش رہی کہ سادگی اور سلاست کے ساتھ اپنے مافی الضمیر کو ادا کردیا جائے۔

تنقید بھی مانند جملہ فنون کے ایک فن ہے۔ تنقید کاریگری اور صناعی کا کام ہے۔ فن تو ہر طرح کے ہوتے ہیں، بعض مشکل تو بعض آسان وسہل، اس میں تنقید ایک مشکل ترین فن ہے۔ ہر فن کی طرح تنقید کے بھی کچھ اصول وضوابط اور اغراض ومقاصد ہیں۔ ہر کس و ناکس اس کے فرائض کما حقہ ادا نہیں کرسکتا۔ ایک نقاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ فن تنقید کے ہر پہلو سے آگاہ ہو، اس کے اندر لطیف اور قوت حاسہ کا ملکہ ہو، اس کی نگاہ وسیع ہو اور وہ اپنی زبان کے ادبی کارناموں سے بھی پوری واقفیت رکھتا ہو۔ اسی کے ساتھ وہ دوسری زبانوں کے شہ پارے سے آگہی رکھتا ہو۔ وہ جو زبان استعمال کرے، اس کے اندر سادگی، متانت اور قطعیت کا عنصر غالب ہو۔ تنقید کی زبان میں پیچیدہ بیانی، تعویق لفظی، دقیق زبان، صنائع وبدائع کا استعمال اور مصنوعی پن سم قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تنقید میں عبارت آرائی اور رنگینی سے نفس مضمون تک رسائی نہیں ہوپاتی ہے۔ تنقید کے لیے غیر جانب داری انتہائی ضروری ہے۔ ایک ناقد کی یہ شان ہوتی ہے کہ وہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ معروف ادیب و ناقد پروفیسر کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب 'اردو تنقید پر ایک نظر' میں تنقید کی زبان کی تعیین پر کافی زور دیا ہے۔ وہ تنقید کی زبان کو غزل کی زبان بنا دینے کے سخت خلاف ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح کی عبارت آرائی اور رنگین زبان چند وقفے کے لیے قاری کو تو چونکا سکتی ہے، لیکن تنقید کا جو فرض منصبی ہے، اس میں رکاوٹ پیدا ہوجاتی ہے۔ محمد حسین آزاد کی مشہور کتاب 'آب حیات' پر تنقید کرتے ہوئے ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''ان جملوں کا مقصد سبحان اللہ ہے۔ ہر سمجھ والا جانتا ہے کہ اس عبارت میں مغز کم ہے اور اس کو اختصار اور جامعیت کے ساتھ سیدھے سادے لفظوں میں بیان

کیا جاسکتا ہے۔ چند صاف اور معمولی باتوں کو حسین لفظوں اور چمکتے ہوئے نقوش سے آراستہ کیا گیا ہے۔ چمک تو بڑھ گئی ہے، لیکن ان حسین لفظوں اور چمکیلے نقوش نے معانی کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ الفاظ اور نقوش اپنی رنگینی اور چمک کے ساتھ عام، مبہم اور غیر متعین بھی ہیں۔ عبارت آرائی کی جستجو میں مقصد فراموش ہوجاتا ہے اور اس قسم کی عبارت سے کچھ حاصل بھی نہیں ہوتا۔ تنقید کی زبان سیدھی سادی ہوتی ہے۔ صاف اور معین ہوتی ہے۔ تنقید میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ زبان کی سلاست اور روانی، رنگینی اور جلا خیالات پر پردہ نہ ڈال دے۔" (اردو تنقید پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، ص 50)

کلیم الدین احمد تنقید کے لیے ایسی زبان کے سخت خلاف ہیں جس کی وجہ سے موضوع اور مقصد پس پشت چلا جائے۔ وہ زبان میں سادگی اور سلاست کے قائل ہیں۔ کلیم الدین احمد ہی کی طرح اکثر نقاد تنقید کے لیے سادہ زبان کے قائل ہیں۔ لیکن یہاں مسئلہ یہ درپیش ہوتا ہے کہ تنقید میں زبان کا استعمال اگر صرف معنی مقصود تک رسائی کے لیے ہی ہو تو پھر ایسی زبان کاروباری ادارے کے ہی شایان شان ہے۔ تنقید کسی کاروباری ادارے کی نمائندگی نہیں کرتی بلکہ یہ فنون لطیفہ کی ایک شاخ ہے جو اپنے اندر ادبیت اور تخلیقی شان کا متقاضی ہے۔ ورنہ سپاٹ پن اور بدمزگی ذوق سلیم کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔

تنقید کا بنیادی کام فن پارے کی تعیین قدر اور استخراج نتائج ہے۔ جب کوئی ناقد کسی فن پارے کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھتا ہے اور اس فن پارے کے معائب و محاسن کی نشاندہی کرتا ہے تو اسے سائنسی عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ فن پارے کے تمام گوشوں کی چھان پھٹک کر کے منطقی دلائل، معروضی انداز، تجزیاتی شواہد، وسعت مطالعہ، ماقبل کے تجربات اور زور بیان کے توسط سے وہ نتیجے تک پہنچتا ہے۔ اسی لیے ادب میں اگر کوئی صنف سائنس سے قریب تر ہے تو وہ تنقید ہی ہے۔ سائنس سے قریب تر ہونے کے باوجود ان دونوں کی زبان میں واضح فرق ہے۔ سائنس میں ادبی شان نہیں ہوتی اور نہ ہی اس میں زبان مقصود بالذات ہوتی ہے، اس کے برعکس تنقید میں زبان کی خامی فوراً قابل گرفت ہوجاتی ہے۔ جس طرح سائنس میں کسی چیز کا تجربہ کرنے کے لیے تجربہ گاہ اور مختلف آلات و اوزار کی ضرورت ہوتی

تنقید کا بنیادی کام فن پارے کی تعیین قدر اور استخراج نتائج ہے۔ جب کوئی ناقد کسی فن پارے کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھتا ہے اور اس فن پارے کے معائب و محاسن کی نشاندہی کرتا ہے تو اسے سائنسی عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ فن پارے کے تمام گوشوں کی چھان پھٹک کرکے منطقی دلائل، معروضی انداز، تجزیاتی شواہد، وسعت مطالعہ، ماقبل کے تجربات اور زور بیان کے توسط سے وہ نتیجے تک پہنچتا ہے۔

ہے، اسی طرح تنقید میں بھی استخراج نتائج کے لیے منطقی، استدلالی اور معروضی انداز، حوالے، تجزیہ و تشریح اور زور بیان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنی تنقیدی نگارشات کے توسط سے کوئی ناقد مصنف کے خیالات و جذبات اور اس کے اندرونی کائنات میں داخل ہوکر نتیجہ اخذ کرنے اور جو ہر مقصود پانے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ تنقید کی زبان میں گہرائی، تہہ داری، سنجیدگی اور زیریں لہروں کی ترنگ کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

تنقید کی زبان سیدھی سادی، سلیس اور رواں ہونی چاہیے جو نفس مطلب تک پہنچا دے۔ سارے ناقدین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن تنقیدی اظہاریے کا مقصود صرف مفہوم تک رسائی ہو تو پھر اس میں اور صحافتی زبان میں فرق کرنا مشکل ہوجائے گا۔ اسی طرح اگر اس کی زبان میں عبارت آرائی اور رنگینی اس قدر ہو کہ وہی مقصود بالذات نظر آئے، تو پھر تنقید کا مقصد اصلی ہی فوت ہوجائے گا۔ تنقید کی نثر میں حسن اور چاشنی ضروری ہے۔ کیونکہ تنقید ادب کی ایک توانا شاخ ہے، لہٰذا اس کی نثر میں بھی توانائی ضروری ہے۔ رشید احمد صدیقی، فراق گورکھپوری، عبدالرحمٰن بجنوری، نیاز فتح پوری، آل احمد سرور، کلیم الدین احمد اور اختر اورینوی وغیرہ کی تنقیدی زبان میں سادگی کے ساتھ نثری حسن بھی اس قدر در آیا کہ قاری اکثر ان تحریروں کی چاشنی میں کھو سا جاتا ہے۔ احتشام حسین کی زبان بھی سادہ اور دلکش ہے، لیکن ان کے انداز بیان میں اکثر فلسفیانہ رنگ غالب آجاتا ہے۔

تنقید کی زبان کا سب سے اہم پہلو اس کا تعمیری ہونا ہے۔ تعمیری زبان مسائل کی نشاندہی کے ساتھ ان کے حل کی تجاویز بھی فراہم کرتی ہے۔ اس قسم کی زبان قاری کے ساتھ ساتھ مصنف کو بھی حوصلہ دیتی ہے اور اسے اپنی خامیوں کو قبول کرنے اور اسے بہتر بنانے کی ترغیب دیتی ہے۔ تنقید کرتے وقت الفاظ کا انتخاب انتہائی محتاط انداز میں ہونا چاہیے۔ غیر مناسب، توہین آمیز، یا غیر مہذب الفاظ مصنف و قاری کی دل آزاری کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس، موزوں اور مہذب الفاظ کسی بھی سخت بات کو نرم اور قابل قبول بنا دیتے ہیں۔ ادبی تنقید کا بنیادی مقصد کسی ادبی تخلیق کی خوبیاں اور خامیاں اجاگر کرنا ہے۔ اس کے لیے تنقید کی زبان علمی، متوازن، اور معروضی ہونی چاہیے۔ اگر کوئی نقاد محض اپنی ذاتی پسند یا ناپسند کی بنیاد پر تنقید کرے، تو اس کی رائے غیر معتبر تصور کی جائے گی۔ جب تنقید ذاتی جذبات، عناد، یا تعصبات پر مبنی ہو، تو یہ اپنی معروضیت کھو دیتی ہے۔ ایسی زبان تنقید کو بے مقصد اور غیر موثر بنا دیتی ہے۔ بعض اوقات نقاد تنقید کرتے وقت مبالغہ آرائی کا سہارا لیتا ہے، جو کہ حقیقت کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ مبالغہ آمیز زبان تنقید کی ساکھ کو متاثر کرتی ہے۔ ادبی تنقید ادبی تخلیقات کا تجزیہ، ان کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کرنے کا فن ہے۔ یہ نہ صرف تخلیق کی گہرائیوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے بلکہ ادیب، قاری، اور معاشرے کے درمیان ایک فکری مکالمے کا پل بھی قائم کرتی ہے۔ ادبی تنقید کے لیے ایک خاص اسلوب اور طریقہ کار ضروری ہے، جو انصاف، معروضیت، اور شائستگی کے اصولوں پر مبنی ہو۔

■

Dr. Shahid Wasi
C/o Book Imporiam, Ashok Rajpath,
Sabzibagh, Patna-4
Mob. No.: 9006331029
Email: shahidrahi101@gmail.com

محمد معراج عالم

بہار کے اردو ناولوں میں شہری زندگی کی عکاسی

ہندوستان گاؤں میں بسنے والا ملک ہے لیکن بہت تیزی سے گاؤں کے لوگ شہر کی طرف نقل مکانی کر رہے ہیں کیونکہ ان کو لگتا ہے کہ شہر میں وہ تمام سہولیات میسر ہیں جو گاؤں میں نہیں ہیں۔ دور سے دیکھنے والوں کو شہری زندگی میں بڑی چمک دمک اور آن بان نظر آتی ہے لیکن وہ نہیں جانتے کہ شہر میں رہنے والوں کے سامنے کتنے مسائل ہیں۔ شہروں کا سب سے بڑا مسئلہ افزائش آبادی ہے یعنی جس تیزی سے شہروں کی آبادی بڑھ رہی ہے اتنے مسائل بھی کھڑے ہو رہے ہیں۔ شہروں میں رہنے والوں کے سامنے پانی، صفائی، ٹرانسپورٹ کے ساتھ ساتھ ٹریفک اور اسکول اور کالجوں کا بھی ہے۔ اس کے باوجود گاؤں سے شہر کی طرف لوگ تیزی سے آ رہے ہیں۔ جو لوگ پہلے سے شہر میں آباد ہیں وہ تو مسائل سے دوچار ہیں ہی لیکن جو نئے لوگ آ رہے ہیں وہ ان مسائل میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔

شہر کی آبادی جس طرح بڑھے گی مسائل بھی بڑھتے جائیں گے اور شہر میں رہنے والا ہر آدمی ان مسائل سے دوچار ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔ سماج میں جو کچھ رونما ہوتا ہے ادب پر اس کا براہ راست اثر پڑتا ہے۔ جب ہم بہار کے اردو ناولوں میں شہری زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ابتدا ہی سے بہار کے ناول نگاروں نے اس کی طرف توجہ کی ہے۔ اردو کے ادیب زیادہ تر شہر میں آباد ہوتے ہیں اس لیے شہری زندگی کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ واقعات و حادثات کے چشم دید گواہ ہوتے ہیں اس لیے اردو فکشن میں شہری زندگی کی عکاسی کو بڑی خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔

بہار کا پہلا ناول نگار شاد عظیم آبادی کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کا ناول 'صورۃ الخیال' 1876 میں منظر عام پر آیا جب کہ ڈپٹی نذیر احمد کا ناول 'مراۃ العروس' 1869 میں شائع ہوا اسے اردو کا پہلا ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ 'صورۃ الخیال' کا اگر مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ یہ بھی ایک اصلاحی ناول ہے۔ ولایتی ناول کا مرکزی کردار ہے اور وہ اپنی زندگی کی کہانی خود سناتی ہے۔ شاد عظیم آبادی، ڈپٹی نذیر احمد سے بے حد متاثر تھے بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس وقت کے تمام ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کی پیروی کرتے ہوئے اصلاحی ناول لکھ رہے تھے۔ 'صورۃ الخیال' میں شہری زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔ ولایتی پٹنہ کی رہنے والی ہے اور اس کی شادی صاحب گنج میں ہوتی ہے۔ پورا ناول ان دونوں شہروں کے اردگرد گھومتا نظر آتا ہے۔

رشیدۃ النسا کا ناول 'اصلاح النسا' (1896) میں

ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔ سماج میں جو کچھ رونما ہوتا ہے ادب پر اس کا براہ راست اثر پڑتا ہے۔ جب ہم بہار کے اردو ناولوں میں شہری زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ ابتدا ہی سے بہار کے ناول نگاروں نے اس کی طرف توجہ کی ہے۔ اردو کے ادیب زیادہ تر شہر میں آباد ہوتے ہیں اس لیے شہری زندگی کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ واقعات و حادثات کے چشم دیدگواہ ہوتے ہیں اس لیے اردو فکشن میں شہری زندگی کی عکاسی کو بڑی خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔

شائع ہوا جب کہ یہ ناول (1881) میں مکمل کرلیا گیا تھا۔ رشیدۃ النسا کے سامنے ڈپٹی نذیر احمد کا ناول 'مراۃ العروس' بھی تھا اور شاد عظیم آبادی کا ناول 'صورۃ الخیال' بھی۔ ان دونوں ناولوں نے انھیں ناول لکھنے کی طرف راغب کیا اور انھوں نے 'اصلاح النسا' جیسا ناول لکھا۔ اصلاح النسا میں بھی اصلاح کا پہلو غالب ہے۔ اس میں بھی دو لڑکیاں ہیں ایک شریف اور ایک بدمعاش۔

رشیدۃ النسا نے نہ صرف اصلاح کا پہلو سامنے رکھا ہے بلکہ اس وقت کے مسلم گھرانوں میں جو کچھ ہوتا تھا اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ یہ ناول شہر پٹنہ سے شروع ہوتا ہے اور وہیں ختم ہوجاتا ہے یعنی اس ناول میں بھی شہری زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔

سہیل عظیم آبادی کا صرف ایک ناول 'بے جڑ کے پودے' 1972 میں شائع ہوا۔ اس میں چھوٹا ناگپور کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس وقت چھوٹا ناگپور میں کئی عیسائی مشنریاں کام کررہی تھیں اور یہ ناول اسی عیسائی مشنری کا احاطہ کرتا ہے۔ بے جڑ کے پودے میں عیسائیت کا پورا ماحول ہے۔ اس میں چرچ کا میدان، ڈورمیٹری، مشن کا یتیم خانہ، مشن کمپاؤنڈ، عیسائیوں کی تہذیب وتمدن ان کی زندگی، چرچ اور کمیونیٹی کے مسائل، عیسائی دھرم کی تبلیغ واشاعت، لاوارث بچوں کی معصومی، رومن کیتھولک کی فیملی، روزولا کی آرام وآرائش سب کچھ ہے۔ سہیل عظیم آبادی نے بہت خوبصورتی سے یتیم خانے میں پرورش پارہے بچوں کو پیش کیا ہے۔ سہیل عظیم آبادی نے پہلی بار عیسائی مشنری کو موضوع بنایا ہے۔ ناول 'بے جڑ کے پودے' رانچی کے مشن سے شروع ہوتا ہے اور رانچی کے مشن پر ہی ختم ہوجاتا ہے اس طرح یہ ناول رانچی میں رہ رہے اینگلو انڈین کی زندگی، رہن سہن اور طور طریقے کو پیش کرتا ہے۔

اختر اورینوی کا صرف ایک ناول 'حسرت تعمیر' شائع ہوا۔ یہ ناول بھی چھوٹا ناگپور کے زندگی کو پیش کرتا ہے۔ اختر اورینوی نے اس ناول میں بیسویں صدی کے مسلم گھرانے کو موضوع بنایا ہے۔ اس ناول میں چھوٹا ناگپور کے جغرافیائی حالات اور وہاں رہنے والے لوگوں کی زندگی کے بارے میں بھی معلومات ملتی ہیں۔

شین مظفرپوری نے بہت سارے ناول لکھے جیسے ہزار راتیں، چاند کا داغ، کھوٹا سکہ، تین لڑکیاں ایک کہانی وغیرہ۔ شین مظفرپوری کا ناول 'ہزار راتیں' بے حد مقبول ہوا۔ 'ہزار راتیں' کا مرکزی کردار ایک لڑکی منی ہے جسے قسمت نے فٹ پاتھ سے اٹھا کر بازار تک پہنچا دیا پھر فلموں میں قسمت آزمائی کرتی ہے اور آخر میں لوٹ کر اسی فٹ پاتھ پر آجاتی ہے جہاں اس نے زندگی شروع کی تھی۔ دراصل شین مظفرپوری نے طوائفوں کو سامنے رکھ کر کئی ناول لکھے یا پھر مسلم معاشرے کو سامنے رکھ کر ناول لکھے۔ اس ناول میں پٹنہ اور ممبئی جیسے شہر کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

شکیلہ اختر کا صرف ایک ناول 'تنکے کا سہارا' منظر عام پر آیا ہے۔ ناول 'تنکے کا سہارا' میں جو مسائل اٹھائے گئے وہ یقیناً قابل توجہ ہیں۔ اس ناول میں بھی پٹنہ شہر اپنی آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

انور عظیم کا ناول 'جھلستے جنگل' 1998 میں شائع ہوا۔ دوسرا ناول 'پرچھائیوں کی وادی' ہے۔ یہ ناول زندگی سے بھرپور ہے کیونکہ اس میں مصنف نے اپنے مشاہدے کا اظہار کیا ہے۔ لندن، روس، پیرس کی خوبصورتی کا مشاہدہ کرنے کے بعد سب کچھ پرچھائیوں جیسا لگتا ہے۔ 'پرچھائیوں کی وادی' میں نہ صرف شہری زندگی ہے بلکہ روس کے شہروں کی بھی زندگی ہے کیونکہ انور عظیم ایک عرصے تک سوویت یونین میں رہے اور وہاں کی زندگی کو بہت غور سے دیکھا اس لیے اس ناول میں ان کا تجربہ ومشاہدہ دیکھنے کو ملتا ہے۔

غیاث احمد گدی کا ایک ناول 'پڑاؤ' 1980 میں شائع ہوا۔ 'پڑاؤ' میں افسانے کی تکنیک کو سامنے رکھا گیا ہے۔ غیاث احمد گدی نے جس طرح افسانے میں علامت واستعارے کا استعمال کیا اسی طرح ناول 'پڑاؤ' میں بھی کیا۔ ناول 'پڑاؤ' کا کینوس بہت چھوٹا ہے اس میں صرف تین کردار ہیں اور انھیں تین کرداروں کے بیچ پورا ناول گھومتا ہے۔ اس ناول میں بھی شہری زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔

الیاس احمد گدی کا ناول 'فائر ایریا' 1996 میں شائع ہوا۔ اس ناول کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ اس ناول میں پہلی بار کوئلے کی کان میں کام کرنے والے مزدوروں کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ کہانی گیا شہر سے شروع ہوتی ہے اور جھریا میں جاکر ختم ہوجاتی ہے۔ اس ناول میں مزدوروں کا استحصال بھی ہے۔ ٹریڈ یونین بھی ہے اور کول فیلڈ کے مالکوں کا ظلم و ستم بھی ہے۔ مزدوروں کا ہمیشہ استحصال کیا گیا ہے

شکیلہ اختر کا صرف ایک ناول 'تنکے کا سہارا' منظر عام پر آیا ہے۔ ناول 'تنکے کا سہارا' میں جو مسائل اٹھائے گئے وہ یقیناً قابل توجہ ہیں۔ اس ناول میں بھی پٹنہ شہر اپنی آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

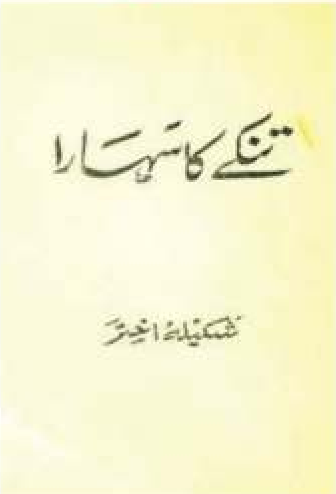

چاہے وہ جس فیلڈ میں کام کررہے ہوں۔ الیاس احمد گدی نے پہلی بار کولری کی زندگی کو پیش کیا ہے کیونکہ اس سے پہلے وہاں کی زندگی کو کسی افسانہ نگار یا ناول نگار نے پیش نہیں کیا تھا۔ الیاس احمد گدی نے کول فیلڈ کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اس لیے 'فائر ایریا' جیسا ناول وہی لکھ سکتے تھے۔

عبدالصمد کا ناول 'دو گز زمین' 1988 میں شائع ہوا اور اس ناول کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی ملا۔ یہ ناول بہار شریف سے شروع ہوتا ہے اور پٹنہ اور دوسرے شہروں کا احاطہ کرتا ہے۔ آزادی کے بعد مسلمانوں کو جن مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی عکاسی اس ناول میں کی گئی ہے۔ مصنف نے ہجرت کے کرب کو پیش کیا ہے۔ بہار کے مسلمانوں کو دو بار ہجرت کرنی پڑی ایک بار بنگلہ دیش اور جب وہ الگ ہوا تو پاکستان۔ عبدالصمد نے پہلی بار بہار کے ان مسلمانوں کے درد کو سمجھا جو پہلے مشرقی پاکستان گئے اور پھر بنگلہ دیش بننے کے بعد پاکستان

جانے پر مجبور ہو گئے۔

عبدالصمد کا دوسرا ناول 'مہاتما' ہے۔ جس میں تعلیمی نظام میں جو بدنظمی ہے اور کرپشن ہے اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی نوجوان بے روزگار رہتا ہے۔ ان سب کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ 'خوابوں کا سویرا' میں جاگیردارانہ خاندان کے افراد کی زندگی اور ان کے نظریات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ عبدالصمد کا ناول 'مہاساگر'، 'دھمک'، 'بکھرے اوراق'، 'شکست کی آواز' اور 'دستخط' میں بھی شہری زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔

حسین الحق کے تین ناول 'بولو مت چپ رہو' 1990، 'فرات' 1992 اور 'اماوس میں خواب' 2017 میں شائع ہوئے۔ 'اماوس میں خواب' پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی ملا۔ 'اماوس میں خواب' میں بھی سیاسی، سماجی، تہذیبی تبدیلیوں کے پس منظر میں انسانی زندگی کے المیے کو پیش کیا ہے۔ یہ ناول اپنے موضوع اور اسلوب اور تکنیک کے لحاظ سے منفرد ہے۔ حسین الحق نے اس ناول میں ہندوستان کی جمہوری قدروں کے کھوکھلے پن کو اجاگر کیا ہے۔ اس ناول میں وہ سب کچھ ہے جو آج ہندوستان میں ہو رہا ہے۔ حسین الحق نے اپنے تینوں ناولوں میں شہری زندگی کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

شفق کے تین ناول کانچ کا بازی گر، بادل اور 'کابوس' شائع ہو چکے ہیں۔ 'کانچ کا بازی گر' میں پہلی بار کسی ناول نگار نے ایمرجنسی کے حالات کو قلم بند کیا۔ لیکن علامتی انداز میں اگر یہ عام بیانیہ میں لکھا جاتا تو شاہکار ناول ہوتا۔ 'بادل' میں آج جو کچھ ہندوستان میں ہو رہا ہے اس کو خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کے تینوں ناولوں میں شہری زندگی موجود ہے۔

شموئل احمد کا ناول 'ندی' 1999، 'مہاماری' 2005، 'گرداب' 2016 اور 'چمراسر' 2019 میں شائع ہوا اور ایک سوانحی ناول 'اے دل آوارہ' 2015 میں منظر عام پر آیا۔

شموئل احمد کے ناول ندی میں ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو ندی کی طرح جینا چاہتی ہے لیکن شادی کے بعد اس کا شوہر اس پر کئی طرح کی پابندیاں عائد کرتا ہے جس سے وہ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ شموئل احمد نے اس ناول میں عورت کی ذہنی اور جسمانی آزادی کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

ناول 'چمراسر' میں ایک دلت اور اس کے احتجاج کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ان کے ناولوں میں بھی شہری زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔

معین شاہد کے چار ناول ٹھوکریں، جذبۂ دل، شیشۂ دل اور 'شکست آرزو' میں شہری زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔

ذکی انور نے تقریباً پچاس ناول لکھے۔ ان رومانی اور داستانوی رنگ و آہنگ نے سارے ناولوں کا مزاج برہم کر دیا۔ کچھ جاسوسی ناول بھی انھوں نے لکھے اور ان کے سبھی ناولوں میں شہری زندگی کی عکاسی بھرپور طریقے سے ملتی ہے۔

ناول 'آسمان سے آگے' میں' ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو مذہبی پابندیوں میں رہتی ہے لیکن جب آزاد ہوتی ہے تو وہ آسماں سے آگے تک پرواز کرتی ہے۔

احمد صغیر کے چار ناول ہیں۔ انھوں نے اپنے چاروں ناولوں میں شہری زندگی کو عمدگی سے پیش کیا ہے۔

غضنفر کا ناول 'پانی' 1989 میں شائع ہوا۔ اس میں پانی کو علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس میں داستانوی طرز ہے اور ناول نگار نے بتایا ہے کہ پانی انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اگر آنے والے وقت میں پانی کی کمی ہو گئی تو کیا ہو سکتا ہے۔ بے نظیر جو اس ناول کا اہم کردار ہے پانی کی تلاش میں نکلتا ہے لیکن ہر جگہ اسے ناکامی ہی ملتی ہے۔ وہ جن لوگوں سے ملتا ہے ان کا اپنا نظریہ ہے اور بے نظیر کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ پانی کی تلاش بے معنی ہے۔

غضنفر کا دوسرا ناول 'کینچلی' 1993 میں شائع ہوا جس میں ایک شوہر اور بیوی کی کہانی ہے۔ اس ناول میں وینا کے کردار پر بہت محنت کی گئی ہے۔ اس نے وفادار بیوی کا کردار نبھایا ہے۔ غضنفر کا سب سے اہم ناول 'دویہ بانی' ہے جو 2000 میں شائع ہوا۔ دراصل یہی ناول غضنفر کی پہچان ہے۔ یہ اردو کا پہلا دلت ناول ہے۔

غضنفر نے پہلی بار دلت مسائل کو اٹھا کر ایک اہم ناول لکھا ہے۔ غضنفر کا ناول 'فسوں'، 'وش منتھن'، 'مم'، 'شوراب' اور 'مانجھی' بھی ہے جس میں شہری زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔

پیغام آفاقی کا ناول 'مکان' 1989، 'پلیتہ' 2011 اور 'دوست' ان کی موت کے بعد 2018 میں شائع ہوئے۔ پیغام آفاقی کے ناول 'مکان' کی کہانی یہ ہے کہ میڈیکل کی ایک طالبہ جس کے والد کا انتقال ہو گیا ہے اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ دلی میں رہتی ہے اس لڑکی کے بھی کئی خواب ہیں لیکن کمار جو اس کے مکان میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہ رہا ہے اس کی نیت میں کھوٹ پیدا ہو جاتی ہے اور وہ مکان کو حاصل کرنے کی تیاریاں شروع کر دیتا ہے۔ نیرا اور اس کی ماں کو جب کمار کی نیت کا پتہ چلتا ہے تو گھبرا جاتی ہے اور یہیں سے شروع ہوتی ہے مکان مالک اور کرایہ دار کی جنگ۔ یہ پورا ناول دلی شہر کے حالات کا احاطہ کرتا ہے۔

پیغام آفاقی کا دوسرا ناول 'پلیتہ' ہے جس میں ایک سو پچاس سال پرانے درد اور جبر کے رشتے کو آج سے جوڑ کر ایک نیا پہلو سامنے لایا گیا ہے۔ ناول 'دوست' میں میاں بیوی کی کہانی ہے یہ تینوں ناول شہری زندگی کا احاطہ کرتی ہیں۔

کوثر مظہری کا ناول 'آنکھ جو سوچتی' ہے 2000 میں شائع ہوا جس میں سیتامڑھی میں ہوئے فساد کو پیش کیا گیا ہے۔

اچاریہ شوکت خلیل کا ناول 'اگر تم لوٹ آتے' 2003 میں شائع ہوا۔ اس ناول کا موضوع تقسیم ہند ہے۔ شبر امام کے دو ناول 'جب گاؤں جاگے' اور 'شاہین' منظر عام پر آچکے ہیں۔ محمد علیم کے بھی دو ناول 'جو اماں ملی تو کہاں ملی' اور 'میرے نالوں کی گمشدہ آواز' میں بھی شہری زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ آشا پربھات کا ناول 'دھند میں اگا پیڑ'، ظفر عدیم کا ناول 'یاسمین'، افسانہ خاتون کا ناول 'دھند میں کھوئی روشنی'، نسرین ترنم کا ناول 'ثنا'، نیلوفر کا ناول 'آٹرم لین'، علی امجد کا ناول 'کالی ماٹی'، خورشید انور ادیب کا ناول 'یادوں کے سائے'، جاوید حسن کا ناول 'سیاہ کاری ڈور میں ابلیس' اور اقبال نظامی کا ناول 'آخر کب تک' میں بھی شہری زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام ناولوں کا تقابلی مطالعہ کر کے ان ناولوں کا مقام متعین کیا جائے تبھی ان ناولوں کے ساتھ انصاف ہو سکے گا۔

■

Md. Meraj Alam
New Aliganj
Near: Rose Palace
Gaya-823001
E-mail:merajalamgaya786@gmail.com
Mobile: 8789236712

مخطوطہ شناسی اور ادبی تحقیق

تعریف و تفہیم اور اصول

امتیاز احمد

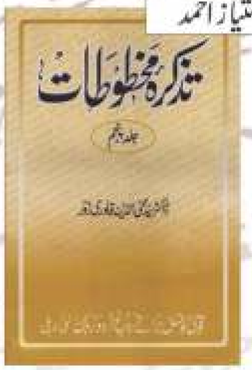

مخطوطہ عربی زبان کا لفظ خط سے مشتق ہے جس کا معنی کسی مادی شے پر ہاتھ سے لکھا ہوا یا ٹائپ شدہ تحریری نمونہ کے ہیں۔ نمونے کی یہ تحریر نقل بھی ہوسکتی ہے اور طبع زاد بھی، طویل بھی اور مختصر بھی، مفید بھی اور غیر مفید بھی۔ اصطلاحی معنی میں مخطوطہ کا اطلاق قلمی کتاب اور نسخے پر ہوتا ہے۔ یعنی وہ کتاب جو قلم سے لکھی گئی ہو۔ مخطوطہ لکھنے والے کو خطاط اور تحریر کو خطاطی کہتے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین مخطوطہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر مخطوطہ کہلاتی ہے۔ یہ تحریر ایک صفحے پر مشتمل ہو یا ایک ہزار صفحے پر، ایک سال پرانی ہو یا ایک ہزار سال، کاغذ پر لکھی ہو یا کھجور کی چھال پر، پتھر پر کندہ ہو یا ہڈیوں کے ٹکڑوں پر۔ بہر حال اسے تحقیق و تدوین کی زبان میں مخطوطہ کہا جائے گا۔''[1]

بہر حال مخطوطے کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ ہاتھ سے لکھا گیا ہو خواہ مصنف نے اسے بذاتِ خود لکھا ہو یا کسی کاتب سے نقل کرایا ہو۔

مخطوطہ شناسی یا تحریر شناسی ایک ہمہ گیر اور وسیع شعبۂ علم ہے جس کی اہمیت و افادیت ازمنہ گزشتہ سے مسلم رہی ہے۔ البتہ یہ شعبۂ علم جس قدر ناگزیر ہے اسی قدر اس کی تلاش و جستجو، قرأت و مطالعہ اور اصول و ضوابط دشوار کن اور اعصاب شکن بھی ہیں۔ مخطوطہ کئی قسم کا ہوسکتا ہے۔ قلمی نسخہ، بیاض، مکتوب، مقالہ اور اس قبیل کی دوسری شکلوں میں بھی ہوسکتا ہے۔ سید جمیل احمد رضوی مخطوطے کی اس نوعیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایسی دستاویز جو خطی ہو یا ٹائپ کی ہو (اس میں کاربن کی کاپیاں بھی شامل کی جاتی ہیں) اس میں خطوط، تاریں، روز نامچے، رسیدیں، ذاتی حالات، فہرستیں، اجلاس کی روئیدادیں، معاہدے، ٹیکس کے ریکارڈز، قانونی سرٹیفکیٹ (متعلقہ پیدائش، موت، شادی وغیرہ) ادبی کتب، تقاریر اور دوسری دستاویزات کے اصل مسودات جو شخصیات یا افراد سے تعلق رکھتے ہیں۔''[2]

درج بالا تعریفات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کوئی ایسا کاغذ، مٹی، مٹی کی تختی، کپڑا، انڈے کا خول، کانچ، لکڑی یا لکڑی کا تختہ، چمڑا، پتھر، درخت کا پتا یا چھال، دھات یا جانور کے جسم کی جھلی، جانوروں کی ہڈیوں یا ہاتھی دانت جس پر کوئی عبارت تحریری شکل میں مرقوم ہو یا کندہ کی ہوئی ہو تو اس کو مخطوطہ کہا جائے گا۔

مخطوطات کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں جن میں سب سے پہلی قسم نسخہ اصلیہ (Original copy) کی ہے جسے مؤلف نے خود اپنے ہاتھ سے سپرد قرطاس کیا ہو۔ اس کے بعد وہ نسخہ جو نسخہ اصلیہ سے نقل کیا گیا ہو۔ پھر فروعی نسخے جنھیں اصلی یا ثانوی نسخوں سے نقل کر کے تیار کیا گیا ہو۔ یہ مخطوطات در حقیقت بعد میں لکھی جانے والی کتابوں کے لیے مصدر اور سرچشمے کا کام کرتے ہیں۔ یہ جدید دور کی کتابوں کے لیے امہات کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ انسانی تہذیب و ثقافت کی اساس اور جدید تمدن کا شاندار ستون ہیں۔

مشرقی زبانوں بالخصوص عربی، فارسی اور اردو میں مخطوطات کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ ہمارا بیشتر قدیم علمی و ادبی سرمایہ مخطوطات کی شکل میں ہے۔ قدیم تواریخ و تذکرے، سوانح و سیرت، داستانیں، مثنویات اور شعرا کے دواوین وغیرہ سب کے سب مخطوطات کی شکل میں محفوظ ہیں۔ ان مخطوطات کے بغیر ہم اپنی ادبی روایات کی جڑوں تک نہیں پہنچ سکتے۔ عہد قدیم کے شاعروں اور نثر نگاروں کی تخلیقات سے ہم مستفید نہیں ہو سکتے۔ مذہب سے قطع نظر مخطوطات میں ہمارے اسلاف کا جو ادبی سرمایہ محفوظ ہے وہ در اصل اپنے عہد کی معاشرتی اور تہذیبی دستاویز ہے۔ اس سے اپنا تعلق جوڑے بغیر نہ تو ہم اپنے ماضی کو بالاستیعاب سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی اس کے واقعات و انسلاکات سے کوئی نتیجہ مستنبط کر سکتے ہیں۔

انسانی ارتقا کی تاریخ متعین کرنے میں سب سے اہم اور بنیادی ماخذ مخطوطات ہیں۔ قدیم یونان و روم سے لے کر مصر، افریقہ، چین اور برصغیر ہند تک کی تاریخ انہی مخطوطات سے منعکس ہوتی ہے۔ انسانی ارتقا سے صرفِ نظر جب ہم ادبی حوالے سے اس کے دائرۂ کار کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں زبان و ادب کے مختلف موضوعات سے متعلق تحقیق اور تدوین کا میدان نظر آتا ہے جہاں مخطوطات ایک اساسی اہمیت رکھتے ہیں۔ زبان و ادب سے متعلق مختلف شعرا و ادبا کے حالات زندگی قلم بند کرنا ہو، اصنافِ نظم و نثر پر خامہ فرسائی کرنا ہو، ادبی رجحانات و تحریکات کی تاریخی دستاویز سپردِ قلم کرنا ہو یا ادبی اداروں، تنظیموں، حلقوں اور دبستانوں کی تاریخ منضبط کرنا ہو ان سب کے لیے مخطوطات کی ضرورت درکار ہوتی ہے۔ ان مخطوطات کو مدون اور مرتب کرنے سے ہی ہمارے سامنے مطلوبہ اشخاص، اصناف، ادارے، دبستان اور رجحانات و میلانات نمودار ہوتے ہیں۔

اردو زبان میں تدوین یا ترتیب، عربی میں تحقیق اور انگریزی میں ایڈیٹنگ سے مراد مخطوطے کو صحیح صورت میں اس طرح پیش کرنا ہے جیسا کہ اس کے مصنف نے اپنے ہاتھوں سے اسے تحریر کیا تھا۔ یہ تدوین قابلِ مطالعہ و قابلِ فہم ہونے کے ساتھ ساتھ مقررہ معیارات کے مطابق ہو۔

تدوین، متن کی تصحیح و ترتیب کا ایک عملی فن ہے جس میں مدون اپنی پوری توجہ اور محنت سے کسی مصنف کی کتاب کو پوری صحت کے ساتھ ترتیب دیتا ہے۔ سب سے پہلے تو وہ اصل متن کی تلاش کرتا ہے۔ خواہ وہ ایک جگہ ہو یا اس کے اجزا منتشر حالتوں میں مختلف جگہوں پر ہوں، اسے فراہم کرتا ہے، پھر اس متن کو منشائے مصنف کے مطابق ترتیب دیتا ہے۔ متن کی ترتیب میں اسے مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یعنی اول تو وہ اس کی تصحیح کرتا ہے۔ تصحیح کے دوران اس متن کی پوری تحقیق اور چھان بین کرتا ہے، اسے تنقیدی زاویوں سے پرکھتا ہے، پھر اپنی رائے پیش کرتا ہے، حسب ضرورت متن کی وضاحت بھی کرتا ہے اس پر حاشیہ چڑھا کر اس کی تزئین کرتا ہے اور مقدمے کا اضافہ کر کے اس کی تکمیل کرتا ہے۔ اس طرح تدوین متن عملی طور پر فراہمی متن، ترتیبِ متن، تصحیح متن، تحقیقِ متن اور توضیح متن پر محیط ہے۔

مخطوطے کی تدوین کے کچھ اصول اور ضابطے ہوتے ہیں جن کو ملحوظ خاطر رکھ کر تدوین کے کام کو بہ حسن و خوبی انجام دیا جا سکتا ہے۔ مدون کو معلوم ہونا چاہیے کہ ترتیب و تدوین کا مطلب نہ تو مخطوطے کی عبارات کو بدل کر زیادہ بہتر الفاظ میں نقل کرنا ہے اور نہ ہی اس کا مقصود یہ ہے کہ مصنف کے اسلوب کو بدل کر کوئی اور زیادہ بہتر اسلوب اختیار کیا جائے یا اگر مصنف نے کوئی نظریہ خلاف واقعہ بیان کیا ہے اس کی تصحیح کر دی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ترتیب و تدوین ایک تاریخی امانت ہے، اس کا اپنا تقدس اور حرمت ہے اور مخطوطہ اور اس کی عبارات مصنف کی امانت ہیں، ان میں کسی قسم کا ردو بدل نہیں کیا جا سکتا۔

تدوینِ مخطوطہ کا پہلا اصول یہ ہے کہ جس مخطوطے کے متن کی تدوین کا ارادہ ہو اس کے بارے میں پہلے یہ معلوم کر لیا جائے کہ اس کے کتنے نسخے ہیں اور کہاں کہاں ہیں۔ جہاں جہاں وہ نسخہ موجود ہو وہاں وہاں تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔

> **انسانی ارتقا کی تاریخ متعین کرنے میں سب سے اہم اور بنیادی ماخذ مخطوطات ہیں۔ قدیم یونان و روم سے لے کر مصر، افریقہ، چین اور برصغیر ہند تک کی تاریخ انھی مخطوطات سے منعکس ہوتی ہے۔ انسانی ارتقا سے صرفِ نظر جب ہم ادبی حوالے سے اس کے دائرۂ کار کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں زبان و ادب کے مختلف موضوعات سے متعلق تحقیق اور تدوین کا میدان نظر آتا ہے جہاں مخطوطات ایک اساسی اہمیت رکھتے ہیں۔**

تدوینِ مخطوطہ کا دوسرا اصول یہ ہے کہ حاصل شدہ نسخوں میں سے چند نسخوں کو منتخب کر لیا جائے۔ مثلاً اگر کسی مخطوطے کے دس نسخے دستیاب ہوئے ہیں تو ان میں سے تین یا چار نسخوں کو جو زیادہ اہمیت کے حامل ہوں، منتخب کر لیا جائے۔ حاصل شدہ نسخوں میں سب سے بہتر اور مستند کی درجہ بندی درج ذیل معیار پر کر لی جائے۔

- سب سے مستند وہ نسخہ مانا جائے جو مصنف کے ہاتھ سے لکھا ہوا ہو۔
- مصنف کے نسخے سے نقل کیا ہوا نسخہ جسے خود مصنف نے پڑھا یا سنا ہو۔
- وہ نسخہ جو مصنف کے نسخے سے نقل کیا گیا ہو لیکن مصنف نے اس کو نہ پڑھا ہو۔
- مصنف کے زمانے میں نقل کیا گیا نسخہ
- مصنف کے زمانے سے قریب تر نسخہ

جب نسخوں کو منتخب کر لیا گیا اور ان میں سے کسی ایک کو بنیادی نسخہ بنا لیا گیا تو اب مدون حاصل شدہ تمام نسخوں کے متن کو ملائے اور ان کی عبارت کو آپس میں مقابلہ کرے کہ تمام نسخوں کی عبارت ایک طرح سے ہے یا اس میں کچھ فرق ہے۔ اگر کوئی اختلاف نہ ہو تو کوئی بات نہیں لیکن اگر کوئی اختلاف ہو تو اس کو حاشیے میں نقل کر دیا جائے۔

تدوینِ مخطوطہ کا چوتھا اصول حواشی ہے۔ جب دستیاب نسخوں میں اختلاف پایا جائے تو اس کو بیان کرنے کے لیے حاشیہ چڑھایا جاتا ہے۔ حاشیہ درج کرنے کے دو طریقے رائج ہیں؛ ایک طریقہ یہ ہے کہ جس صفحے کا حاشیہ ہے اسی صفحے کے فٹ نوٹ میں نمبر ڈال کر حاشیہ لکھ دیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ حاشیہ نمبر ڈالتے جائیں اور تمام حواشی ایک ساتھ کتاب کے اخیر میں نقل کر دیے جائیں۔

مدوّن اگر کسی قدیم شعرا و ادبا یا اصناف کے مخطوطے کو مدون کر رہا ہو تو وہ فرہنگ سازی کا اہتمام کرے۔ فرہنگ میں متعلقہ مخطوطہ کے مشکل الفاظ، اصطلاحات، تلمیحات، نامانوس اور متروک الاستعمال الفاظ کے معنی، تشریح اور مفہوم کی وضاحت کرے۔ اس کے علاوہ محاوروں کا مفہوم، متن میں مستعمل مشکل جملے، مصرعے اور فقروں کی توضیح بھی فرہنگ میں لکھے۔

تکمیل کتاب کے بعد مدون ایک مفصل مقدمہ تحریر کرے جس میں اس کتاب اور اس کے متعلقات کو زیر بحث لائے۔ مثلاً کتاب کی ادبی اہمیت، لسانی تجزیہ، مصنف کی سوانح، کاتب کی لیاقت، زیرِ نظر تمام نسخوں کی کیفیت، متعلقہ متن کی دریافت و بازیافت اور اس کام میں جن لوگوں نے ہاتھ بٹایا ہے ان کا شکریہ وغیرہ۔

تدوینِ مخطوطہ کے خاص اصول کی پابندی موضوع کی مناسبت سے کی جاتی ہے کیونکہ ہر موضوع کے تقاضے جداگانہ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی نثری مخطوطے کی تدوین کر رہا ہے تو اس کے تقاضے جدا ہیں اور شعری مخطوطے کی تدوین کے تقاضے جدا۔

مخطوطہ شناسی ادبی تحقیق کا بنیادی جزو ہے کیونکہ کسی صنف، شخصیت، دبستان اور تحریک و رجحان پر تحقیق کے لیے اس سے متعلق مخطوطے کا موجود ہونا لازم ہے۔ تحقیق کا بنیادی مقصد حقائق کی تلاش، سچ کی جستجو، مناسب انداز سے واقعات کو ترتیب دینا اور خالص منطقی انداز سے نتائج نکالنا ہے۔ اس کے لیے چاہیے کہ مخطوطے کے متن کے آداب کا خیال رکھا جائے۔

مخطوطے میں مندرج حواشی، مقدمہ، متن کا زمانۂ تحریر، مصنف اور اس کے عہد سے متعلق ضروری معلومات، داخلی شواہد کا تعین وغیرہ ایسے امور ہیں جن پر خاطر خواہ توجہ صرف کرنا نہایت ضروری ہے۔ اسی طرح کسی شخص کو تدوین پر اس وقت تک دسترس نہیں ہو سکتی جب تک وہ تحقیق کا مزاج نہ رکھتا ہو۔ تدوین کے لیے مخطوطہ شناسی

انتہائی ضروری شرط ہے۔ چونکہ تدوین تحقیق سے آگے کی منزل ہے اس لیے تدوین کے لیے مخطوطہ شناسی کو کافی اہم قرار دیا جاتا ہے۔ تحقیق کی طرح تدوین کے لیے بھی مخصوص مسائل، آداب اور ضابطے ہیں جس کے لیے مخطوطہ شناسی کا علم سب سے اہم ہے۔ جب کسی مخطوطے کو موضوع بنایا جاتا ہے تو اس کی اصلیت یا اسناد کے بارے میں سب سے پہلے اطمینان کرنا ضروری ہے۔

درج بالا توضیحات سے یہ بات مترشح ہو جاتی ہے کہ بعض اشخاص کسی نہ کسی وجہ سے اصل متن کو چھپا کر یا مسخ کر کے حالات و واقعات کو اپنی مرضی کے مطابق پیش کرتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ جب تحقیق شروع کی جائے تو اصل متن تک رسائی حاصل کی جائے۔ تحقیق اور تدوین کے اس عمل کے لیے ضروری ہے کہ مخطوطے کو پہچان لیا جائے اور اس کی پہچان مختلف طریقوں سے ہو سکتی ہے۔ محقق کو چاہیے کہ وہ ایک سے زیادہ قلمی نسخے حاصل کرے۔ جب مختلف نسخے ہاتھ آجائیں تو یہاں سے اس کی مخطوطہ شناسی کا امتحان شروع ہو جاتا ہے کہ وہ اس میدان میں کتنی مہارت رکھتا ہے۔ وہ کس نسخے کو اصل قرار دے اور کس کو ثانوی حیثیت دے اور کس کو رد کر دے۔

محقق کو زیر تحقیق کتاب کے مخطوطے کو پہچاننے اور اصل حقائق تک پہنچنے کے لیے داخلی اور خارجی شواہد سے کام لینا چاہیے۔ داخلی شواہد میں زیرِ تحقیق مخطوطہ کے دیباچہ اور متن کی اہمیت مسلم ہے۔ اور خارجی شواہد میں معتبر ذرائع، تاریخیں، تذکرے اور دوسری یادداشتیں اہمیت کی حامل ہیں۔ مخطوطے کی حتمی شناخت کے بعد اس کے عہد اور زمان و مکان کے تعین کا مرحلہ آتا ہے۔ زیرِ نظر مخطوطہ کب اور کن حالات میں وجود میں آیا، اس کے جاننے سے موضوع کی بہت سی گتھیاں حل ہو جاتی ہیں۔ مخطوطے کی بازیافت کا انحصار اس کی کیفیت پر بھی ہوتا ہے۔ مخطوطوں کو کیفیت کی بنا پر دو زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک مکمل و سالم، دوسرا ناقص۔ مکمل یا سالم مخطوطہ وہ ہے جس میں کسی تخلیق کا متن قابل قرأت حالت میں از ابتدا تا انتہا لفظ بہ لفظ پوری طرح موجود ہو۔ ناقص مخطوطہ وہ ہے جس میں متن بہ تمام و کمال موجود نہ ہو۔ ناقص مخطوطے کو پانچ زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ (1) ناقص الاول (2) ناقص الآخر (3) ناقص الاوسط (4) ناقص الطرفین (5) بوسیدہ یا کرم خوردہ۔

بعض اوقات مخطوطے میں مصنف کا نام درج نہیں ہوتا ہے۔ تخلیق کار از راہِ عاجزی وانکساری اپنا نام نہیں لکھتا ہے۔ اس صورت میں مخطوطے کے عنوان کو دیکھ کر اس کے فن کے مطابق مصنف معلوم کرنا ہوتا ہے۔ بعض دفعہ مخطوطات کی فہرستوں اور ترقیمات کو دیکھ کر مصنف کا نام معلوم کیا جاتا ہے۔ نیز بعض مخطوطات کے مشترک مصنف ہوتے ہیں۔

تحقیق مخطوطے کا آخری مرحلہ قرأت متن کا ہے۔ کسی مخطوطے کے متن کا درست پڑھ لینا جس قدر ضروری ہے اس قدر دشوار بھی ہے۔ بیشتر مخطوطات ایسی مخدوش حالت میں ملتے ہیں جن میں اغلاط کا طوفان ہوتا ہے۔

> **تحقیق اور تدوین کے اس عمل کے لیے ضروری ہے کہ مخطوطے کو پہچان لیا جائے اور اس کی پہچان مختلف طریقوں سے ہو سکتی ہے۔ محقق کو چاہیے کہ وہ ایک سے زیادہ قلمی نسخے حاصل کرے۔**

ایک محقق کو دورانِ تحقیق مخطوطات کو سمجھنے کے لیے انتہائی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک وہ مخطوطہ شناسی کے فن سے بخوبی واقف نہیں ہوتا تب تک وہ تحقیق و تدوین کے کام کو بخوبی سرانجام نہیں دے سکتا۔ اور نہ ہی قدیم متنوں کو اصول تدوین کی مکمل پابندی کے ساتھ مرتب کیا جا سکتا ہے۔ یہ امر واضح ہے کہ مستند نسخے کو ماخذ بنائے بغیر کسی اقتباس کو اس اعتماد کے ساتھ نہیں پیش کیا جا سکتا کہ اس سے جو نتیجہ نکالا گیا ہے وہ درست ہے۔ اس احساس نے صحت متن کی اہمیت کو بڑھا دیا۔ محض یادداشت یا سماعت پر بھروسا کر کے متن پیش کر دینا یا کسی بھی سہل الحصول ثانوی ماخذ سے عبارتوں کو نقل کر دینا بہت آسان کام ہے۔ محقق کی ذمے داری ہے کہ وہ مخطوطے کے متن کے نقطوں، رموز و اوقاف اور اعراب و حرکات کا باریکی اور پوری توجہ کے ساتھ جائزہ لے اور اس کی صحیح قرأت کو نقل کرے۔ مالک رام مخطوطے کی صحیح قرأت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مخطوطہ پڑھنے میں اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ کاتب پورے الفاظ نہیں لکھتے۔ نقطے غائب یا غلط جگہ لگے ہوں گے، یائے معروف اور یائے مجہول میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ بعض اوقات لفظ یائے معروف اور یائے مجہول دونوں سے بامعنی ہو سکتا ہے (اگرچہ شاذ و نادر ہو)، اس صورت میں ایک کو ترجیح دے کر اسے متن میں لکھیے اور دوسری قرأت کو حاشیے میں لکھ کر تشریح کر دیجیے۔''3

مخطوطہ شناسی اور تحقیق و تدوین کے فروغ نے احتیاط کو تقویت دی ہے اور اعتراض کرنا سکھایا ہے نیز اس بات کو بھی ضروری قرار دیا ہے کہ شعری عبارت ہو یا نثری اقتباس اس کو معتبر ترین ماخذ سے نقل کرنا چاہیے۔

متن کی تحریفات و تصرفات کتاب کے بار بار چھپنے کے سبب سے بھی ہوتی ہیں۔ اکثر کتابوں کی اولین اشاعتیں یا اہم اشاعتیں عام طور پر نہیں ملتیں۔ اس لیے جو ایڈیشن دستیاب ہوتے ہیں، ان سے کام لیا جاتا ہے۔ اس صورت میں متن کی تبدیلیوں کا امکان ہوتا ہے۔ اکثر صفحات اصل نسخوں کی طرف رجوع کرنے کی بجائے، پہلے کے شائع شدہ انتخابات سے یا ایسے دوسرے ثانوی یا غیر معتبر ماخذ سے نثر و نظم کے اجزا نقل کیے جاتے ہیں۔ یہ تدوین کے سراسر خلاف ہے۔ متن کو سند اور ثبوت کے طور پر اس وقت تک پیش نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ معتبر نسخوں سے مقابلہ نہ کر لیا جائے، جب تک ایسے متنوں کو آداب تدوین کی پابندی کے ساتھ معرض طبع میں نہ لایا جائے، ایسی صورت میں مخطوطے کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، مگر جس طرح بار بار ذکر کیا گیا ہے، مخطوطے کا دستیاب ہونا بہت اہم ہے لیکن تحقیق و تدوین کے لیے مخطوطہ شناسی اس سے بھی زیادہ اہم ہے کیونکہ جب تک مخطوطے کی اصلیت کا پتا نہیں چلتا، تحقیق و تدوین کا کام ہو ہی نہیں سکتا۔

حواشی

1 ڈاکٹر گیان چند جین، تحقیق کا فن، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، 1994، ص 568

2. ڈاکٹر سلطانہ بخش (مرتب)، اردو میں اصول تحقیق - منتخب مقالات، اردو اکیڈمی، لاہور 2021، ص 81

3 مالک رام، مخطوطات، تلاش، قرأت و ترتیب مشمولہ تحقیق و تدوین (سید محمد ہاشم)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 1978، ص: 139

■

Imtiyaz Ahmad
Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025
Mob.:9911752717
imtiyaz7262@gmail.com

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم زبان اور زمینی صورتِ حال کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کردی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

گیان چند جین

علم اللغات اور لفظ اصلیات

عربی میں لغت کے معنی لفظ بھی ہیں اور ڈکشنری بھی۔ موخرالذکر مفہوم میں لغت کی جمع لغات کو زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اردو کی عام بول چال میں لغت اور لغات دونوں کو ڈکشنری کے معنی میں لیا جاتا ہے۔ ان میں بھی سہولت اور اختصار کی خاطر 'لغت' بولنے کا زیادہ رواج ہے۔ یونانی زبان میں Lexis لفظ کو کہتے ہیں۔ اس سے Lexican بنا جس کے معنی لغات کی کتاب یا ذخیرۂ الفاظ قرار پائے۔ لاطینی میں dicere کے معنی کہنا ہیں جس سے dictionaries بنا اور جو انگریزی میں ڈکشنری ہو گیا۔ اس لفظ کے معنی لغات کی کتاب ہیں۔

لسانیات نے یونانی اصطلاح کو ترجیح دی ہے۔ لغت سے متعلق دو علوم ہیں یا ایک ہی علم کے دو پہلو ہیں۔ پہلے کو lexicology کہتے ہیں۔ اردو میں اس کا ترجمہ علم اللغات یا لغاتیات ہو سکتا ہے۔ یہ نظریاتی شاخ ہے جس میں لغت تیار کرنے کے مسائل پر غور کیا جاتا ہے۔ اس کی عملی شاخ کو لغت نگاری (Lexicography) کہتے ہیں۔ یہ اطلاقی لسانیات کا عمل ہے۔

لغت کا موضوع ایک زبان کا ذخیرۂ الفاظ (Vocabolary) ہوتا ہے۔ اس کے تعین میں بہت سی دشواریاں آتی ہیں۔ تاریخی اعتبار سے ذخیرۂ الفاظ میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے یعنی کچھ الفاظ معدوم اور کچھ اضافہ ہوتے جاتے ہیں۔ اس باب میں ان پہلوؤں پر بھی غور کیا جائے گا۔

لغت میں جہاں لفظ کے متعلق طرح طرح کی معلومات درج کی جاتی ہیں ان میں سے ایک اہم اور مفید اندراج لفظ کی اصل کے بارے میں ہوتا ہے۔ انگریزی میں اسے Etymology کہتے ہیں۔ اس باب کے آخر میں اس کے مسائل پر بھی مختصراً نظر کی جائے گی۔

امریکہ اور مغربی یورپ میں علم اللغات کو لسانیات کی باقاعدہ آزاد شاخ کی حیثیت نہیں دی جاتی۔ لسانیات کی کتابوں میں لغاتیات پر ابواب نہیں ہوتے۔ ان کے مقابلے میں روس میں علم اللغات اور لغت نگاری دونوں کو مطالعۂ زبان کے اہم شعبے مانے جاتے ہیں، چنانچہ ان کی لسانیات کی کتابوں میں علم اللغات پر مفصل غور کیا جاتا ہے۔ روسیوں میں علم اللغات کا مشہور عالم شیربا (Scherba) ہے جس نے اس علم پر نظریاتی حیثیت سے بھی لکھا اور عملی لغت نگاری بھی کی، مغرب میں لغت نگاری کا کام بڑے پیمانے پر ہوا ہے۔ اس کے اصولوں پر بھی لکھا گیا لیکن باقاعدہ مستقل سائنس کے طور پر نہیں۔

لغت کی ترتیب میں لفظ بنیادی اکائی ہے اور مارفیمیات کے باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ لفظ کی تعریف آسان نہیں۔ بعض ماہرین نے لفظ سے ملتا جلتا Lexeme کا تصور پیش کیا ہے لیکن اس اصطلاح کے معنی پر اتفاق نہیں۔ Whoy نے اسے Stem یعنی بنیادی لفظ کے مساوی قرار دیا تھا، لیکن یہ صحیح نہیں۔ اس کے تعین میں بھی لفظ کی طرح دشواریاں ہیں اس لیے ہم لغت کی حد تک عام بول چال کے لفظ 'لفظ' سے کام چلائیں گے۔ کم از کم ترسیمیات میں لفظ 'واضح' ہوتا ہے یعنی وہ روپ جس کو بقیہ مماثل روپوں سے فاصلہ دے کر لکھا جائے۔

ہم کسی شے کو دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں تو ایک طرف اس کا ذہنی تصور قائم کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف اسے ایک صوتی علامت دی جاتی ہے گو یہ صحیح ہے کہ نفسیاتی اکائی 'جملہ' ہے لفظ نہیں یعنی ہم ہر خیال 'جملے' کے پیرائے میں کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ مجرد تصورات کی اکائی لفظ ہے۔

زبان کے دو حصے ہوتے ہیں (1) لغات یعنی لفظیات (2) قواعد۔ لغات یا ذخیرۂ الفاظ میں لفظ مجرد تصور کے طور پر ظاہر ہوتا ہے، قواعد ان کے آپسی رشتے کو ظاہر کرتی ہے۔ اس طرح الفاظ کی — بھی دو قسمیں کی جا سکتی ہیں (1) لغاتی لفظ اور (2) قواعدی لفظ۔ لغاتی لفظ بنیادی اور قائم بالذات ہوتے ہیں۔ اُلمان نے انھیں outo sematic یا Principal کہا ہے جب کہ قواعدی لفظ امدادی اجزا، حروف وغیرہ ہوتے ہیں۔ المان انھیں Syn-Semanzic یا Eccessory کہتا ہے۔ سیاق کے اعتبار سے بعض اوقات ایک موقعے پر جو لفظ خاص ہے دوسرے موقعے پر قواعدی ہو جاتا ہے، مثلاً

خاص لفظ	قواعدی لفظ
وہ یہاں رہتا ہے	وہ مجھے ستاتا رہتا ہے
یہاں سے جاؤ	کھاتے جاؤ
اس نے مجھے ایک روپیہ دیا	وہ مار پڑتے ہی بول دیا

زبان کے لغاتی لفظوں کا ذخیرہ بنا بنایا موجود ہے لیکن قواعدی لفظ بنتے رہتے ہیں۔ لفظ آفرینی کا تعلق قواعدی الفاظ سے ہے۔

لفظ اگر مجرد ہو تو محض ایک تصور پارہ ہے لیکن کلام میں استعمال ہو کر اس کے مخصوص سیاقی معنی ہو جاتے ہیں۔ اس طرح لفظ کے معنی کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں (1) لغاتی (Lexical) معنی اور (2) قواعدی معنی۔ لغاتی معنی مجرد مفہوم ہوتے ہیں لیکن قواعدی معنی سیاق کے اعتبار سے ہوتے ہیں اور ان میں حسب استعمال کچھ نہ

کچھ دلالت (Denotation) شامل ہو جاتی ہے۔ لغت نگار کو یہ قواعدی معنی پریشان کرتے ہیں۔ ان پر آگے چل کر مزید اظہارِ خیال کیا جائے گا۔

انسائیکلوپیڈیا امریکنا کے مطابق لغت نگاری (Coinotation) سائنس نہیں کیونکہ اس میں معنی کے بہت سے فیصلے موضوعی (Lexicography) ہوتے ہیں یعنی انفرادی شعور کے مطابق درج کیے جاتے ہیں۔ ایک حد تک تلفظ تک موضوعی ہوتا ہے۔ روسی لغت نگار شیربا کا دعویٰ ہے کہ لغت نگاری تدوین نہیں تخلیق ہے لیکن ماہرین لغت کا یہ دعویٰ بلند بانگ معلوم ہوتا ہے۔

لغت نگاری کی پہلی منزل خزینۂ الفاظ کو جمع کرنا ہے۔ اگر کسی زبان کی پہلی بار لغت بنائی جارہی ہے تو اس کے لیے اہل زبان سے سن سن کر لفظ جمع کرنے ہوں گے۔ جائزے اور مشاہدے سے تمام الفاظ جمع کرنا تقریباً ناممکن سا ہے۔ اگر اس زبان میں کوئی تحریری ادب ملتا ہے تو اس ادب کی لفظیات کو لیا جائے گا۔ اگر کسی ایسی زبان کی لغت بنائی جارہی ہے جس میں پہلے سے لغت موجود ہیں تو اس کے لفظ تین سرچشموں سے جمع کرنے ہوں گے۔

(ا) پہلے سے موجود لغت کی کتابیں (ب) ادب کو چھان پھٹک کر (ج) اہل زبان کی تقریر سے سن کر۔

جامع لغت تیار کرنے کے لیے ادبیات کا جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ اردو میں اس قسم کی کوشش ترقی اردو بورڈ پاکستان کی اردو لغت ہے۔

الفاظ کو جمع کر کے ان کے کارڈ بنائے جاتے ہیں اور انھیں فائل میں ترتیب دیا جاتا ہے۔ مغرب میں فیتوں (Tape) پر بھی فائل تیار کیے جاتے ہیں اور ان کی ترتیب میں کمپیوٹر سے مدد لی جاتی ہے۔ لفظ کی تعیین میں کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن میں سے کچھ حسب ذیل ہیں:

(1) بعض اوقات یہ طے کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کون سا روپ تہہ نشیں ہے اور کون سا اس سے مشتق مثلاً Life اور Line میں کون سا بنیادی ہے اور کون سا متخرج۔

(2) مشتق اور متخرج روپوں میں یہ مشکل سامنے آتی ہے کہ کسے آزاد لفظ کی حیثیت سے دیا جائے اور کسے تہہ نشین لفظ کے تحت رکھا جائے۔ روسی ماہر لغت شیربا نے مثال کے طور پر لکھا ہے کہ روسی لغات Truba (شہنا) اور Trubal (شہنانواز) کو دو لغات قرار دیا جائے کیونکہ ایک بے جان شے کو ظاہر کرتا ہے، دوسرا شخص کو لیکن شہنا کی تصغیر کے لفظ Trubocka کو Truba ہی کے ذیل میں دینا چاہیے۔ اس کی تقلید میں دلی کے آرین شری واستو نے ہندی کے ذیل کے جوڑوں کو علیحدہ لغات کے طور پر درج کرنے کی سفارش کی۔

چام، چمار لوہا، لہار سونا، سنار

لیکن ذیل کے جوڑوں کے دونوں ارکان کو ایک لفظ کے تحت ہی رکھا۔

آم، امیا (امری)۔ کھاٹ، کھٹیا۔ پل، پلیا

شیربا یا شری واستو کے اس بیان سے صرف ان دو رویوں کے بارے میں رہبری ہوتی ہے۔ کوئی عام اصول سامنے نہیں آتا۔ اردو کی مثال لیجیے کار سے کارواں، کارساز ـــــ کارروائی، کارستانی، کارکردگی، کاروبار، کارکن، کارندہ، بےکار، خودکار، ناکارہ، ہرکارہ، وغیرہ متخرج ہیں۔ ان کے مفہوم میں کافی اختلافات ہیں۔ ان میں سے کن کو کار کے تحت درج کیا جائے اور کن کو علیحدہ لغت کے طور پر۔ ظاہر ہے کہ لغت نگار کا موضوعی فیصلہ ہی رہبری کرے گا۔ کوئی ایسا اصول نہیں بنایا جاسکتا جس کا ہر موقع پر یکسانی سے اطلاق کیا جاسکے۔

اردو لغات میں اس معاملے میں بہت لاپروائی برتی گئی ہے۔ دوسری لغات کو تو چھوڑیے ترقی اردو بورڈ پاکستان کی لغت میں ذیل کے تمام الفاظ کو علیحدہ علیحدہ درج کیا گیا ہے۔

اختصاص: اختصاصی

اختلاج: اختلاجی

اختیار: اختیارات، اختیاری

اخروٹ: اخروٹی

ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا ہر سطر کے تمام الفاظ کو ایک ہی لغت کے ذیل میں دینا چاہیے تھا۔

(3) محاوروں کو کس طرح درج کیا جائے۔ میرے سامنے فیروز اللغات ہے اس میں آنکھ کے علاوہ آنکھ کے متعدد محاورے الگ الگ لغت کی حیثیت سے دیے گئے ہیں۔ محاوروں کے بارے میں یہ اصول ہونا چاہیے کہ محاورہ مرکزی لفظ کے تحت دیا جائے۔

(4) کثیر معنوی لفظ کو ایک لغت کے طور پر نہ دے کر اسے ہر آزاد معنی کے لحاظ سے علیحدہ لغت قرار دیا جائے مثلاً 'بار' بمعنی بوجھ، بار بمعنی باریابی یا دخل اور بار بمعنی دفعہ یا مرتبہ کو تین علیحدہ لغات شمار کرنا چاہیے۔ بعض اوقات یہ طے کرنا دشوار ہوتا ہے کہ ایک لفظ کے دو معنی آزاد مفاہیم ہیں یا ایک دوسرے سے نکلے ہیں، مثلاً عرق بمعنی پسینہ اور عرق بمعنی کسی شے کا نچوڑ۔ آب بہ معنی پانی اور آب معنی چمک۔ سوز بہ معنی جلن اور سوز بہ معنی داد حل مثلاً سوز و گداز ہیں۔ ان تمام موقعوں پر لغت نگار اپنی لسانی حس کے مطابق فیصلہ کرے گا۔

(5) علمی اصطلاحات کو کس حد تک زبان کے ذخیرے کا جزو مانیں۔ کیا انگریزی لغت میں سائنس، طب، انجینئرنگ وغیرہ کی اصطلاحات کو لیں اور اگر لیں تو کس حد تک لیں اور کہاں رک جائیں۔ حکومتِ ہند کے سائنسی اصطلاحات کمیشن نے ہندی کی کئی لاکھ اصطلاحیں وضع کر دی ہیں۔ ترقی اردو بیورو اردو کے سلسلے میں یہی کام کر رہا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں بھی اردو کی ہزاروں اصطلاحیں بنائی گئی تھیں۔ وہ عربی فارسی سے بجنسہٖ نہیں لی گئی تھیں بلکہ اردو میں وضع کی گئی تھیں۔ ہم انھیں اردو لغت میں جگہ نہیں دیتے بلکہ وہ لفظ ہیں اور ہر لفظ کسی نہ کسی زبان کا ہوتا ہے۔

بہتر یہ ہے کہ اصطلاحات کو مخصوص علموں کی اصطلاحاتی لغت میں درج کیا جائے۔ عام لغت میں کون سی اصطلاحیں لی جائیں اس پر لغت کی قسموں کے سلسلے میں غور کیا جائے گا۔

(6) متعدد الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو کسی زبان کے علاقے میں بولے جاتے ہیں لیکن تحریر میں استعمال نہیں کیے جاتے۔ ہر معیاری زبان کی ذیلی بولیاں یا معیار زبان کا تقریری روپ ایسے الفاظ فراہم کرسکتا ہے۔ بعض مصنف مثلاً میر امن، نظیر اکبرآبادی، جوش ملیح آبادی ایسے تقریری الفاظ تحریر میں استعمال کر جاتے ہیں۔ کھڑی بولی کا علاقہ دلی اور مغربی یوپی کا ہے۔ وہاں کی بول چال کے ذیل کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''سنگوانا (کسی چیز کو محفوظ کرنا یا تھیالینا)، کھرسا (خشک گرمی کا موسم)، بلد (بیل)، جھوٹا (بھینسا)، کٹیا (بھینس کی بچی)، دھورے (پاس)، دھی (لڑکی)، دھیوتا (نواسہ)، دوہر (دوہری چادر)، بدھیا (بیل)، گیرنا (ڈالنا)، پلکیا (پلنگیا)، بال بانا (بالوں میں کنگھا کرنا)، بڑنا (داخل ہونا)

ان میں سے کن کو معیاری زبان کی لغت میں جگہ دی جائے اور کن کو نہیں۔ اتفاق سے ان میں سے 'سنگوانا'، مصحفی نے 'بدھیا' نظیر نے 'کھرسا' حالی نے اور 'دوہڑا' اکبرالہ آبادی نے استعمال کیے ہیں ان کے استعمال کے بعد اردو لغت میں انھیں کیونکر نظر انداز کیا جائے۔

(7) ہر زبان میں دوسری زبانوں کے بہت سے الفاظ دخل پا جاتے ہیں، ان میں سے کس کس کو حصولی زبان کے ذخیرۂ الفاظ کا جزو مانا جائے۔ نیشن، لٹریچر، اسکول، کالج، یونیورسٹی، انجینئرنگ، ایکسپورٹ، امپورٹ جیسے الفاظ کو اردو میں شامل کریں کہ نہیں۔ اہل اردو ان لفظوں کو لغت میں شامل متعدد عربی و فارسی الفاظ سے زیادہ بہتر طریقے پر بولتے اور سمجھتے ہیں کیا مستند ادیبوں کی تحریروں میں مستعمل تمام بیرونی لفظوں کو لغت میں جگہ دی جائے۔ اکبرالہ آبادی کا شعر دیکھیے۔

ان کے دست ناز سے پائی ہے ٹی
اب کہاں باقی ہے ہم میں پائٹی

ٹی (چائے) اور پائٹی (Piety) کو اردو نہیں مانا جاسکتا۔ لغت نویس کو طے کرنا چاہیے کہ کون سے بیرونی الفاظ زبان میں رچ بس گئے ہیں۔ انھیں متن لغت میں جگہ دینی چاہیے۔ ادب میں استعمال شدہ دوسرے بیرونی الفاظ کو آخر میں ضمیمہ میں درج کرنا چاہیے۔

(8) اس سے بھی بڑی مشکل ماخذ زبانوں یا مادر زبان کے الفاظ کی صورت میں آتی ہے۔ اردو لغت میں عربی فارسی کے اور ہندی لغت میں سنسکرت کے کن الفاظ کو لیں اور کسے نہ لیں۔ اردو یا ہندی کی لغتوں میں ان کلاسیکل زبانوں کے وہ اجنبی الفاظ دکھائی دیتے ہیں جنھیں دختر زبان میں تقریر تو درکنار کوئی تحریر میں بھی استعمال نہیں کرتا۔

ہندی شبد ساگر میں اردو کے بیشتر الفاظ کو شامل کرلیا گیا ہے۔ ان میں عربی کے ایسے ایسے الفاظ داخل ہیں جنھیں ہندی والا تو درکنار معمولی اردو والا بھی نہیں سمجھ سکتا۔

اصول یہ ہونا چاہیے کہ مادر یا ماخذ زبانوں کے جو الفاظ مشتق زبان کی تحریروں میں پائے جاتے ہیں صرف انھیں کو لیا جائے بقیہ کو نہیں، مثلاً اردو لغت میں عربی فارسی کے صرف وہ الفاظ شامل کرنے چاہئیں جو اردو کتابوں یا دوسری تحریروں میں استعمال ہوئے ہیں۔

(9) ذخیرۂ الفاظ مسلسل بدلتا رہتا ہے۔ کچھ الفاظ استعمال سے جاتے رہتے ہیں اور کچھ نئے الفاظ شامل ہوتے رہتے ہیں۔ بولی لغت میں متروک الفاظ کو حذف کرنا ہوگا لیکن معیاری زبان کی لغت میں انھیں بھی برقرار رکھنا ہوتا ہے کیونکہ ادبیات میں متروک الفاظ باقی رہتے ہیں۔ زبان یا بولی میں روز روز نئے Slang الفاظ جاری ہوتے رہتے ہیں لیکن وہ اسی سرعت سے مرتے بھی ہیں۔ لغت نگار کو ان کی طرف بھی توجہ کرنی ہوگی۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ لغت پر دو تین سال میں نظر ثانی کرنی چاہیے اور ہر دس سال بعد از سر نو لکھنی چاہیے۔

ذخیرہ الفاظ کو جمع کرنے کے بعد یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ الفاظ کو کس ترتیب سے درج کیا جائے۔ چونکہ لغت پڑھنے کی کتاب نہیں ہوتی بلکہ حوالے کی کتاب ہوتی ہے اس لیے اس کے اندراجات ایسے ہونے چاہئیں کہ ضرورت پڑنے پر مطلوبہ لفظ بآسانی مل سکے۔ حروف تہجی کی ترتیب سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا۔ یہ ترتیب پہلے حروف ہی پر نہیں جملہ حروف پر نظر رکھتی ہے۔ اب تمام عام ڈکشنریاں اسی ترتیب سے مدون ہوتی ہیں لیکن ماضی میں طرح طرح کے طریقے رائج رہے ہیں جن میں سے کچھ یہ ہیں:

1 اردو فارسی کی منظوم لغات میں الفاظ بغیر کسی ترتیب کے درج کیے جاتے تھے ملاحظہ ہو۔ خالق باری اور اس طرح کی دوسری لغات۔ ان میں کسی مخصوص لفظ کو تلاش کرنا امر محال ہے۔

2 فارسی کی قدیم لغات میں لفظ کے پہلے اور آخری حرف کو پیش نظر رکھ کر لفظوں کے گروہ ترتیب دیے جاتے تھے۔ یہ بھی کافی دقت طلب تھا۔

3 ہندوستانی زبانوں کی بعض قدیم لغات میں صرف پہلے حرف کی ترتیب سے لفظوں کو لکھ دیا جاتا تھا۔ اس میں قباحت یہ تھی کہ اگر الف سے دو ہزار لفظ شروع ہوتے ہیں تو الف سے شروع ہونے والے کسی ایک لفظ کو کھوجنے کے لیے دو ہزار لفظوں کو کھنگالنا پڑتا تھا۔ بعد میں لفظ کے دوسرے حرف کو بھی پیش نظر رکھنے لگے اور آخر میں تمام حروف کو۔

4 صوت رکنوں کی تعداد کے مطابق بھی لفظوں کی گروہ بندی کی جاتی ہے۔ قدیم ہندوستانی نیز چینی زبانوں کی ایک صوت رکنی لغت ملتی ہیں۔ بعض زبانوں میں سب سے پہلے ایک صوت رکن کے الفاظ درج کیے گئے اس کے بعد دو ارکان والے پھر تین والے پھر علی الترتیب اور زیادہ ارکان والے۔

5 سروالی زبانوں میں سر کے لحاظ سے بھی الفاظ کا اندراج کیا جاتا ہے۔

6 بعض لغتوں میں مادہ اور مشتق کی رو سے گروہ بندی کی جاتی ہے یعنی ایک مادہ دے کر اس کے تمام مشتقات درج کردیے جاتے ہیں۔

7 بعض اوقات خیال و مفہوم کے اعتبار سے لفظوں کے گروہ قائم کیے جاتے ہیں۔ اس میں دشواری یہ ہے کہ کوئی بھی دو آدمی اتفاق نہیں کریں گے کہ کس قسم کے الفاظ کو مقدم اور کسے موخر لکھا جائے مثلاً پہلے فلسفیانہ لطیف الفاظ ہوں یا روزانہ کی ضرورت کے ہوں یا اعضائے جسم کے ہوں یا کچھ اور۔ سنسکرت کے امرکوش میں لفظوں کو معنوی زمروں کی بنا پر درج کیا گیا ہے۔

8 بعض اوقات قواعدی گروہوں کے لحاظ سے لفظوں کو تقسیم کیا جاتا ہے یعنی اسما ایک جگہ، صفات دوسری جگہ، افعال تیسری جگہ وغیرہ۔ عربی میں مادّے کی تصریفی شکل کے لحاظ سے بھی لفظوں کی گروہ بندی کی جاتی ہے، مثلاً باب استفعال کے الفاظ ایک جگہ تو تفعیل کے دوسری جگہ۔ اس قسم کی کتابیں لغت اور قواعد دونوں کا امتزاج ہوتی ہیں۔

فی الحال تلاش کی آسانی کی خاطر لفظوں کو حروفِ تہجی کی ترتیب سے درج کرنا ہی رواجِ عام ہوگیا ہے۔

ذخیرۂ الفاظ کی تعیین اور لفظوں کی ترتیب کے بعد تیسری منزل لفظ کے ہجا یا املا کی ہے۔ بیشتر لفظوں کا املا طے ہوتا ہے لیکن متعدد کا مختلف فیہ ہوتا ہے۔ اردو میں اس مسئلہ کی وسعت ترقی اردو بورڈ کی کتاب املا نامہ یا رشید حسن خاں کی کتاب اردو املا سے واضح ہوگی۔ مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں میں لفظوں کا املا بدلتا رہتا ہے۔ برطانیہ اور امریکہ میں کئی لفظوں کا املا مختلف ہے۔

■

ماخذ: عام لسانیات، **مصنف:** گیان چند جین، **دوسرا ایڈیشن:** 2003، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

طلبا کی تعلیم پر گھر اور اسکول کے ماحول کا اثر

شفاعت احمد

پروفیسر فنڈلے نے اپنی کتاب The School میں تعلیم کی یہ تعریف بیان کی ہے کہ ''تعلیم ان تدابیر اور وسائل کے مجموعے کا نام ہے، جو نوعمروں کو تمدنی زندگی کا اہل بنانے کے لیے بالارادہ کام میں لائے جاتے ہیں اور جن کے ذریعے ان کے دماغوں کو بعض خاص اثرات اور مقاصد سے متاثر کیا جاتا ہے''۔

(بحوالہ اصول تعلیم، خواجہ غلام السیدین، ص42، مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان 2023)

اس تعریف سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ بچوں کی تعلیم وتربیت میں معاشرے کے بالغ اور سمجھ دار افراد اور جماعتوں کا اہم کردار ہوتا ہے اور انھیں اس عمل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے تبھی طلبا اپنے تعلیمی مقاصد میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ وہ لوگ اور جماعتیں جو طلبا کی تعلیمی و تربیتی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں، انھیں مجموعی طور پر دو زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا تو والدین اور بچوں کے سرپرستوں کا زمرہ ہے اور دوسرا اسکول، درس گاہ اور اساتذہ کا زمرہ ہے۔ یعنی بچوں کی تعلیم و تربیت اسی وقت کما حقہ انجام پاسکتی ہے جب یہ دونوں زمرے سرگرمی کے ساتھ اپنا کردار ادا کریں گے۔

یہ تو واضح حقیقت ہے کہ بچے کے سیکھنے کا عمل اصلاً اس کے گھر سے شروع ہوتا ہے اور افرادِ خاندان کے طرزِ معاشرت کا جو اثر بچے پر شروعاتی زندگی میں پڑتا ہے، وہی آگے چل کر اس کی پختہ عادتوں اور اخلاقیات کا حصہ بن جاتا ہے۔ پہلے ماں کی گود میں اور پھر دوسرے گھر والوں کے ذریعے ایک بچہ ابتدائی حرکات و مشاغل سیکھتا ہے اور ساتھ ہی اخلاقی اور معاشرتی تربیت بھی زیادہ تر گھر میں ہی عمل میں آتی ہے۔ یہیں وہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے کہ کس طرح گھر میں رہنے والے بہت سے لوگ مشترکہ مقاصد کی تکمیل کے لیے محنت اور کوشش کرتے ہیں اور جب تک ہر فردِ خانہ اس حوالے سے اپنے حصے کا کام نہ کرے گھر کا نظام صحیح طریقے سے نہیں چل سکتا۔ اس ماحول میں اگر ایسی چیزیں موجود ہیں جن سے فائدہ اٹھا کر ایک بچہ یا طالب علم اپنی آنے والی زندگی کی بہتر منصوبہ بندی اور اپنی شخصیت کی تشکیل کرسکتا ہے تو یقیناً یہ چیزیں اس کے حق میں خوشگوار کہلائیں گی، لیکن اس کے برعکس اگر اس کی خاندانی روایت میں تنگ نظری پائی جاتی ہو، گھر کے بڑے بزرگوں کے سامنے بچوں کی تربیت کے حوالے سے کوئی اخلاقی اصول نہ ہو اور وہ ہمیشہ بچے کو دبانے اور بات بات پر ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا رویہ اپنائے ہوئے ہوں، تو اس ماحول میں جو بچہ پرورش پاتا ہے اس کی شخصیت میں مضبوطی، خوداعتمادی نہیں ہوتی ہے۔ وہ اپنی آنے والی زندگی میں قدم قدم پر مشکلات سے دوچار ہوگا اور چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے سے پہلے بھی اسے ہزار دفعہ سوچنا پڑے گا کہ اسے کرے یا نہ کرے۔ اس کی شخصیت کا اخلاقی پہلو بھی کمزور ہوگا اور وہ معاشرے کے لیے کوئی قابل ذکر عمل انجام نہیں دے سکتا۔ یہ نکتہ قابل غور ہے کہ بنیادی طور پر طلبا کی تعلیم وتربیت میں گھریلو ماحول دو طرح سے اثر انداز ہوتا ہے۔ ایک تو والدین کے باہمی تعلقات اور ان کے عملی مظاہرے بچے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور دوسرا گھر کا معاشی یا اقتصادی ماحول۔ اگر والدین کے باہمی تعلقات اچھے ہیں اور وہ اپنے چھوٹے بڑے مسئلوں کو باہمی افہام وتفہیم اور خوشگوار طریقے سے حل کرلیتے ہیں، اسی طرح وہ ایک دوسرے کی ضرورت کے ساتھ ہی ایک دوسرے کی طبیعت اور مزاج کو سمجھتے اور اسی کے مطابق ایک دوسرے سے برتاؤ کرتے ہیں، تو اس ماحول میں جو بچہ تعلیم وتربیت حاصل کرتا ہے وہ نتیجہ خیز اور خوشگوار ہوتا ہے، کیونکہ

ایک تو والدین کے باہمی برتاؤ اور رویے کا اس پر اچھا اثر مرتب ہوتا ہے، دوسرے جب والدین یا ان میں سے کوئی ایک بچے کو کچھ سکھانا چاہے گا تو وہ پوری آمادگی اور خوشی کے ساتھ سیکھنا چاہے گا۔ اس کے برعکس اگر والدین کے باہمی تعلقات اچھے نہیں ہیں، وہ بچوں کے سامنے ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں، انھیں اپنے مسائل کو بحسن و خوبی حل کرنے کی تدبیر نہیں آتی اور قدم قدم پر انھیں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرنا پڑتا ہے، تو ایسے ماحول میں بچے کی تعلیم و تربیت یقیناً ناقص ہوگی اور اگر وہ انھیں نہایت سنجیدگی کے ساتھ کچھ سکھانا چاہیں گے تب بھی جو گھر کا ماحول ہے، وہ اس کی راہ میں حائل ہو جائے گا اور اس کی تعلیم و تربیت میں کمی رہ جائے گی۔ کمی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایسا بچہ تعلیم ہی حاصل نہیں کر سکتا، ہوسکتا ہے کہ وہ تعلیم حاصل کرلے، بڑی ڈگریاں حاصل کرلے اور معاشی آسودگی کے وسائل بھی اسے حاصل ہو جائیں، مگر تعلیم کا جو مقصد ہے یعنی فرد کو اچھی اور مفید تمدنی زندگی کا اہل بنانا، وہ نہیں ہو پائے گا اور وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیمی ڈگریاں حاصل کرنے اور بہت زیادہ مال و اسباب کمانے کے باوجود معاشرے کے لیے یا خود اپنے گھر اور خاندان کے لیے ایک مفید اور مؤثر عامل نہیں بن سکتا، اس لیے کہ تعلیم و تربیت کی بالکل ابتدا میں اس کی شخصیت میں جو نقص رہ گیا تھا وہ اس کی عمر کے ساتھ بڑھتا ہی جائے گا، کبھی دور نہیں ہو سکے گا۔

(مفتاح الدین ظفر، تعلیمی نفسیات، ص 190، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند 1943)

گھر کے ماحول کا دوسرا پہلو معاشی حالات سے وابستہ ہے۔ انسان کے معاشی حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے۔ اگر کوئی شخص روزگار سے وابستہ ہے تب بھی مہنگائی، گھر میں کسی کے بیمار پڑنے یا کسی اور وجہ سے بعض دفعہ اس کی معاشی حالت خراب ہو جاتی ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں تو زیادہ تر گھرانے نچلی معاشی سطح پر زندگی گزارتے ہیں اور ایسے والدین کے لیے نہ صرف بچوں کی کھیلنے اور کھانے کی خواہشات پورا کرنا مشکل ہوتا ہے، بلکہ اس کی تعلیمی سرگرمیوں میں خرچ ہونے والی رقم جٹا پانا بھی بعض دفعہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس وقت انھیں مزید پریشانی اور دباؤ کا سامنا ہوتا ہے جب والدین اپنا پیٹ کاٹ کر بچوں کو مہنگے اسکولوں میں داخل کراتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ وہاں سے بچے بہترین تعلیم حاصل کے نکلیں گے۔ اس سلسلے میں والدین کو چاہیے کہ وہ اپنی مالی حیثیت و استطاعت کے مطابق ہی اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے منصوبہ بندی کریں۔ اگر ان کی معاشی حالت اچھی ہے اور وہ بہت مہنگے اسکول میں اپنے بچے کو پڑھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو وہ ایسا کر سکتے ہیں، لیکن اگر ان کا تعلق متوسط سماجی طبقے سے ہے یا نچلے سماجی طبقے سے ہے تو انھیں پہلے اپنی گھریلو معاشی حالت کا جائزہ لینا چاہیے اور اس کے مطابق ہی بچے کے لیے تعلیمی ادارے کا انتخاب کرنا چاہیے۔ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیے جس سے ان کی معاشی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہو۔ نیز بچے کے لیے تعلیمی ادارے کا انتخاب کرتے ہوئے وہاں کے تعلیمی معیار کو دیکھنا چاہیے، اونچی اونچی عمارتوں اور مہنگی فیس والے اسکولوں میں کوئی ضروری نہیں کہ تعلیم بھی اچھی ہوتی ہو۔ اسی طرح اچھے تعلیمی نتائج کے لیے بچے کے اندر شوق و لگن اور دلچسپی کا ہونا بھی ضروری ہے۔

> بچے کے سیکھنے کا عمل اصلاً اس کے گھر سے شروع ہوتا ہے اور افرادِ خاندان کے طرزِ معاشرت کا جو اثر بچے پر شروعاتی زندگی میں پڑتا ہے، وہی آگے چل کر اس کی پختہ عادتوں اور اخلاقیات کا حصہ بن جاتا ہے۔ پہلے ماں کی گود میں اور پھر دوسرے گھر والوں کے ذریعے ایک بچہ ابتدائی حرکات و مشاغل سیکھتا ہے اور ساتھ ہی اخلاقی اور معاشرتی تربیت بھی زیادہ تر گھر میں ہی عمل میں آتی ہے۔

دوسری اہم جگہ جس کے ماحول کا بچوں پر اثر پڑتا ہے وہ اسکول ہے۔ اسکول صرف ایسی جگہ نہیں ہے جہاں متعینہ نصاب یا تعلیم کے مختلف مراحل میں کچھ طے شدہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، بلکہ بقول پروفیسر ہاورتھ (Howerth) یہ خود ایک چھوٹی سی دنیا ہے اور اس میں وہ تمام مشاغل اور عمدہ اثرات مہیا کیے جانے چاہئیں جن کی تمدنی زندگی میں ضرورت ہوتی ہے۔ (اصول تعلیم، ص 34) البتہ باہر کی دنیا اور اسکول کی دنیا میں ایک بنیادی فرق ہے۔ وہ یہ کہ ہم باہر کی دنیا میں مختلف قسم کے اثرات کے درمیان کما حقہ فرق نہیں کر سکتے۔ اس میں بری اور بھلی، نیک اور بد ہر قسم کی نشو و نما کے اثرات و عوامل موجود ہوتے ہیں۔ ایسے میں ایک نوعمر اور بچے کے لیے بغیر کسی امداد اور رہنمائی کے فائدہ اٹھانا مشکل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے تعلیمی اداروں کے قیام کا تصور معاشرے میں فروغ پاتا ہے تاکہ بچوں کی شخصیتیں ایسے ماحول میں نشو و نما حاصل کریں، جہاں برے اثرات نہ پائے جائیں، ایسے عوامل نہ پائے جائیں جو بچوں کی تعلیم و تربیت میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اس لیے اسکول کو انسانی تمدنی ماحول سے ایسے اجزا و عناصر کا انتخاب کرنا چاہیے جو بچوں کی تربیت کے لیے خاص طور پر اہمیت کے حامل ہوں اور ان کی زندگیوں سے ہم آہنگ ہوں۔ پھر ان اجزا و عناصر کو اس طرح مرتب انداز میں پیش کرنا چاہیے کہ بچہ اپنے شوق و دلچسپی سے نئی نئی چیزیں سیکھے، نئی نئی معلومات حاصل کرے اور رفتہ رفتہ انسانی مشاغل کو سمجھ بوجھ کر برتنے کے قابل ہو جائے۔ نصاب کی تدوین اور اسکول کی تمام سرگرمیوں کی تشکیل میں اسکول انتظامیہ اور معلمین کو ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ تمدنی زندگی کے اہم عناصر کو سادہ اور دلچسپ انداز میں اسکولی زندگی کا حصہ بنائیں اور انھیں اس طرح مرتب کریں کہ جوں جوں طالب علموں کی عمر اور تجربات میں ترقی ہو، وہ زندگی کے مشکل اور پیچیدہ

مسائل و مشاغل کو بھی سمجھنے کے قابل ہوتے جائیں۔ ان سرگرمیوں کو اس طرح پیش کرنا چاہیے کہ انھیں کرتے ہوئے بچے پوری دلچسپی لیں اور ان کے کرنے سے انھیں مسرت حاصل ہو۔

اسکول کے ماحول کو ایسی چیزوں اور سرگرمیوں سے پاک ہونا چاہیے جو طلبا کی ماغی نشو ونما اور ان کے سماجی عادات و اطوار پر برے اثرات مرتب کرنے والے ہوں۔ اسکول انتظامیہ اور اساتذہ کا یہ فرض ہے کہ وہ تمدنی ورثے میں سے ان چیزوں کو اسکولی سرگرمیوں کا حصہ بنائیں جو نئی نسل کی تربیت اور آئندہ معاشرے کی ترقی میں معاون ثابت ہوں۔ ہمارے دور میں یہ انتخاب خصوصاً ضروری ہوگیا ہے، کیونکہ ہر شعبۂ زندگی میں ایسی ہوش ربا ترقی اور تبدیلی واقع ہو رہی ہے اور علوم وفنون کے شعبوں میں اتنا پھیلاؤ پیدا ہو رہا ہے کہ اب کوئی انسان تمام علوم کو حاصل نہیں کرسکتا، اس لیے طلبا کی دلچسپی اور ان کے ذوق وشوق کے مناسب مضامین کا انتخاب اور اسی طرح زمانے کی تبدیلیوں اور تقاضائے عصر کے مطابق وقتاً فوقتاً نصابِ تعلیم کی جانچ پڑتال کرتے رہنا ضروری ہے۔ کیوں کہ اس برق رفتار عہد میں اگر نصابِ تعلیم کو کسی طے شدہ ڈگر پر چلایا جائے اور اس کے تمام پہلوؤں پر غور وفکر نہ کیا جائے تو نصابِ تعلیم میں بہت سی رطب و یابس چیزیں جمع ہو جائیں گی، جن کے فائدے کم اور نقصانات زیادہ ہوں گے۔

اسکول کے ماحول کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہاں تمدنی ماحول کے مختلف عناصر کے درمیان ہم آہنگی اور توازن پیدا کیا جائے۔ (پروفیسر ڈیوئی، Democracy and Education، ص24) اکثر بچے کے گھر اور پڑوس کا ماحول بہت محدود ہوتا ہے اور اس میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ وہ اس کی مجموعی تربیت کرسکے۔ مثال کے طور پر اگر ایک بچہ کسی مزدور کے گھر پیدا ہوتا ہے تو اس کا گھر اور آس پاس کا ماحول اسے مزدوری کی ہی ترغیب دیتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی بچہ کسی ایسے گھر میں آنکھیں کھولتا ہے جو جاگیردار یا زمیندار ہے اور جو ہے تو مالدار مگر اس کے افراد کسی صنعت وحرفت سے وابستہ نہیں ہیں، تو وہ بچہ صنعت ومحنت کے سارے سسٹم سے ناواقف رہتا ہے، اسے گھر سے نکلے بغیر یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے لوگ کیا کیا کرتے ہیں۔ یہی حال دوسرے کسی خاص پس منظر والے

اسکول کے ماحول کو ایسی چیزوں اور سرگرمیوں سے پاک ہونا چاہیے جو طلبا کی دماغی نشوو نما اور ان کے سماجی عادات و اطوار پر برے اثرات مرتب کرنے والے ہوں۔ اسکول انتظامیہ اور اساتذہ کا یہ فرض ہے کہ وہ تمدنی ورثے میں سے ان چیزوں کو اسکولی سرگرمیوں کا حصہ بنائیں جو نئی نسل کی تربیت اور آئندہ معاشرے کی ترقی میں معاون ثابت ہوں۔

خاندان میں پیدا ہونے والے بچے کا ہوگا۔ یعنی وہ جس ماحول میں پیدا ہوگا، اس کے ذہن میں اسی سے متعلق خیال یا عمل کی تحریک پیدا ہوگی، اس سے الگ وہ نہیں سوچ سکتا ہے۔ البتہ اسکول ایسی جگہ ہے، جس کا ماحول ایسا منظم اور متنوع ہوتا ہے جس میں ہر پس منظر سے تعلق رکھنے والے بچے کی مناسب نشوونما کا انتظام ہوتا ہے اور اس بات کا التزام ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے کہ طلبا مختلف قسم کی دماغی و جسمانی سرگرمیوں میں شریک ہوسکیں اور ہمہ جہت تربیت حاصل کرسکیں۔ اس لیے اسکول کا ماحول اس حوالے سے آزادانہ ہونا چاہیے، جہاں طلبا اپنی تعلیم کے زمانے میں بغیر کسی پابندی اور روک ٹوک کے مختلف قسم کے تجربے کرسکیں اور زندگی کی مختلف راہوں سے آگاہ ہوسکیں۔

اسی طرح اسکول کی ذمے داری یہ بھی ہے کہ وہ ہر طالب علم کی طبیعت میں ان تمام اثرات کو ہمہ جہت انداز میں منظم کرے جو مختلف معاشرتی اداروں میں شرکت کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر گھریلو زندگی میں الگ ضابطۂ اخلاق نافذ ہوتا ہے اور فطری طور پر ہر بڑا چھوٹا اسی پر عمل کرتا ہے، جبکہ گھر کے باہر گلی اور بازار وغیرہ میں انسان کا طرزِ عمل مختلف ہوتا ہے، دکانوں اور کارخانوں میں الگ انداز سے سوچا اور عمل کیا جاتا ہے اور مذہبی معاملات میں مختلف اپروچ اختیار کیا جاتا ہے۔ اس طرح ایک ہی شخص جب ایک ماحول سے دوسرے ماحول میں جاتا ہے تو اس کی طبیعت پر مختلف قسم کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس لیے اسکول کا فرض ہے کہ وہ بچے کی طبیعت میں استقلال اور وحدت تاثر کا رنگ پیدا کرے۔ اگر اسکول میں تربیت کا نظام اچھا ہے تو اس کی وجہ سے بچے کی زندگی میں ایسے اصول و قوانین جاگزیں ہوجائیں گے جو آئندہ زندگی میں اسے راہِ راست پر چلائیں گے اور اس وقت اس کی صحیح رہنمائی کریں گے جب بیرونی ماحول کا تنوع اور مختلف قسم کی ترغیبات انسان کو عمل اور ردعمل کی مختلف سمتوں میں کھینچتی ہیں اور انسانی عقل حیرانی وآشفتہ سری سے دوچار ہوجاتی ہے۔

اس طرح ہم سمجھ سکتے ہیں کہ بچوں کی تعلیمی وتربیتی زندگی میں اسکول اور گھر دونوں کے ماحول کا غیر معمولی اثر ہوتا ہے، چنانچہ جہاں والدین اور دوسرے سرپرستوں کی ذمے داری ہے کہ وہ بچوں کی تعلیم وتربیت میں نہایت فعال اور مفید کردار ادا کریں، وہیں اسکول انتظامیہ اور اساتذہ کو بھی چاہیے کہ وہ طلبا کو محض نصاب رٹانے کے بجائے ان تمام عناصر پر توجہ دیں، جن پر طلبا کی علمی، سماجی وتمدنی زندگی کی بنیاد ہے اور جن سے تعلیم کی تکمیل کے بعد انھیں قدم قدم پر واسطہ پڑنے والا ہے۔

حوالہ جات

1. Findlay, J.J. (1923): The School: An Introduction to the Study of Education. FB & c Ltd, Dalton House, 60 Windsor Avenue, London.
2. Schopler, J. Weisz, J. King Morgan C. (1993), Introduction to Psychology Y. New Delhi: Prentice Hill of India Pvt. Ltd.
3. پروفیسر محمد شریف خاں (2004) جدید تعلیمی نفسیات، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
4. ملک محمد موسیٰ شاذیہ رشید (2008) تعلیمی نفسیات اور رہنمائی، جوران پبلی کیشنز، لاہور۔
5. طلعت عزیز (2013)، تعلیمی نفسیات، مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی۔

Dr. Shafayat Ahmad
Associate Professor
Maulana Azad National Urdu University
School of Education & Training
College of Teacher Education
Darbhanga- 846002 (Bihar)
Mob.: 7091490018
shafayatahmad@manuu.edu.in

ہندوستانی ادب کے معمار

مہاکوی سبرامنیم بھارتی

طیب خرادی

سبرامنیم بھارتی، ایک تامل مصنف، شاعر، صحافی، آپ بیتی نگار، ہندوستانی مجاہدِ جنگِ آزادی، سماجی مصلح اور کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ ان کو 'مہاکوی بھارتی' کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ وہ جدید تامل شاعری کے علمبردار تھے اور انھیں تامل ادب کی عظیم ترین شخصیات میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ ان کی پیشہ ورانہ زبانیں انگریزی، فرانسیسی، سنسکرت، تیلگو اور بطور خاص تمل رہی ہے۔ تمل ادب پر بھارتی کا اثر غیر معمولی ہے، کیونکہ انھوں نے سیاسی، سماجی اور روحانی موضوعات پر بھرپور انداز میں اپنی خدمات کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے خواتین کی آزادی کے لیے جدوجہد کی۔ صنفی مساوات اور خواتین کے حقوق کی حمایت کی۔ انھوں نے بیواؤں کی دوبارہ شادی کی حمایت کی اور کم عمری کی شادی کی مخالفت کی۔

سبرامنیم بھارتی دسمبر 1882 کو ایٹیاپورم، ترونلویلی ضلع، تامل ناڈو برطانوی ہند (موجودہ توتوکڈی ضلع، تامل ناڈو، بھارت) تامل ناڈو میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد چناسامی ایر اور والدہ لکشمی امل تھی۔ ان کی ابتدائی تعلیم تامل اور انگریزی زبانوں میں ہوئی۔ سبرامنیم بھارتی کی ماں لکشمی امل کا انتقال 1887 میں ہوا جب وہ پانچ سال کے تھے۔ اس طرح، ان کی پرورش ان کے والد اور دادی بھاگیرتھی امل نے کی۔ ان کے والد چاہتے تھے کہ وہ انگریزی اور ریاضی سیکھیں اور انجینئر بنیں۔ گیارہ سال کی عمر میں جب وہ اسکول میں تھے، انھوں نے شاعری کے لیے اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ ان کی قابلیت کی وجہ سے وہ 'بھارتی' (علم کی دیوی سرسوتی کی برکت) کے نام سے مشہور ہونے لگے۔ انھوں نے 1897 میں پندرہ سال کی عمر میں چیلمل نامی خاتون سے شادی کی۔ 1898 میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ انھوں نے اتیاپورم کے راجا کو اس کی اطلاع دی اور ان سے مالی مدد فراہم کرنے کی درخواست کی۔ اتیاپورم میں کچھ وقت کام کرنے کے بعد، بھارتی نے نوکری چھوڑ دی اور کاشی چلے گئے۔ وہ تقریباً چار سال تک بنارس کی ایک خانقاہ میں رہے۔ وہاں قیام کے دوران بھارتی کو روحانیت اور قوم پرستی کے بارے میں پتہ چلا۔ انھوں نے سنسکرت، ہندی اور انگریزی سیکھی۔ انھوں نے بال بڑھانا اور پگڑی پہننا شروع کر دیا۔ بھارتی 1901 میں بنارس سے واپس آئے اور اتیاپورم پیلس میں شاعر کے طور پر کام کیا۔ اسی سال، ان کے گانے ویویکا بانو میں شائع ہوئے۔ بعد میں انھوں نے سودیسا میتھیرن میگزین میں ایسوسی ایٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی۔ دسمبر 1905 میں بنارس میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس سے واپسی پر، ان کی ملاقات سوامی وویکانند کی روحانی جانشین سسٹر نویدیتا سے ہوئی۔ انھوں نے سبرامنیم بھارتی کو خواتین کی آزادی اور خواتین کے حقوق کے لیے لڑنے کی ترغیب دی۔ عورتوں کی آزادی نے بھارتی کے ذہن کو بہت متاثر کیا۔ بھارتی نے نویدیتا کو شکتی کا مظہر سمجھا اور اسے اپنا گرو تسلیم کیا۔ بعد میں انھوں نے دادا بھائی نوروزی کے تحت انڈین نیشنل کانگریس کے کلکتہ اجلاس میں شرکت کی، جس نے ہندوستانی آزادی کے لیے لڑنے اور برطانوی سامان کا بائیکاٹ کرنے کا مطالبہ کیا۔

سبرامنیم بھارتی کی ادبی زندگی کی شروعات شاعری سے ہوئی۔ انھوں نے تامل زبان میں شاعری کی اور اپنے کاموں میں تحریکِ جنگِ آزادی اور سماجی انصاف کی وکالت کی۔ انھوں نے کئی کتابیں اور گیت لکھے ہیں جن میں پنچالی سپاتھم، کنن پاٹو، کوئل پاٹو، پاپا پاٹو، پتنجلی یوگا سوترا (تمل ترجمہ)، بھگوت گیتا (تمل ترجمہ)، چناسیرو کلیئے، ونایا کرتھمنی ملائی، وِدوتھلائی گانے اور پوتھیا اتھیسوڈی شامل ہیں۔ ان کے مشہور کاموں میں پنچالی سپتھم، کوئل تھوگائی اور 'واکام' شامل ہیں۔ پنچالی سپتھم ایک شاہکار ہے، جس میں ہندوستانی آزادی کی جدوجہد کو بھارت جنگ اور پنچالی کو بھارت ماتا کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ یہ ویاس کے مہابھارت کا ترجمہ ہے۔ اس میں ادبی اور شاعرانہ خوبصورتی موجود ہے۔ ان کے مشہور کاموں میں کوئل پاٹو، پاپا پاٹو، چناسیرو کلیئے، پوتھیا آتھیچوڈی، ونایا کرتھمنی مالائی اور کنن پاٹو شامل ہیں۔ انھوں نے پتنجلی کے یوگا سوترا اور بھگوت گیتا کا تمل زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ سبرامنیم بھارتی کی کتاب پوتھیا اتھیسوڈی ایک تامل قانون کی کتاب ہے۔ یہ 20ویں صدی میں سبرامنیم بھارتی نے اوویار کی کتاب آتھیچوڈی کی طرح خوبصورت پیرائے میں لکھا تھا۔ اس کی ساخت اتھی چوڈی سے ملتی جلتی ہے۔ مجموعی طور پر اس میں 111 ہدایات ہیں۔ یہ مختصر جملے یاد کرنے میں آسان ہیں۔ انھوں نے سودیسمیرن، دی ہندو، بالا بھارتا، وجے، چکرورتی اور انڈیا سمیت کئی رسالوں اور اخبارات کے لیے لکھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے بہت سے قومی ترانے، آزادی کے گیت، بھجن، حکمت کے گیت اور کہانیاں لکھیں۔

سبرامنیم بھارتی نے تحریکِ جنگِ آزادی میں بھی حصہ لیا۔ انھوں نے برطانوی حکومت کے خلاف لڑائی لڑی۔ جب 1908 میں برطانوی حکومت نے سبرامنیم بھارتی کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا تو بھارتی پانڈیچیری چلے گئے، جو اس وقت ایک فرانسیسی علاقہ تھا۔ اور وہ 1918 تک تقریباً دس سال تک رہے۔ پانڈیچیری جلاوطنی کے دوران وہ اروند اور لاجپت رائے جیسے آزادی کے رہنماؤں کے ساتھ رابطے میں رہے۔ بھارتی نے پانڈیچیری کے تامل نوجوانوں کو قوم پرستی کی طرف رہنمائی کی، جس سے برطانوی حکومت کی ناراضگی میں اضافہ ہوا۔ نومبر 1918 میں برطانوی ہندوستان میں دوبارہ داخل ہونے کے بعد قید کیا گیا۔ انھوں نے جیل میں آزادی اور قوم پرستی پر لکھنا جاری رکھا۔

سبرامنیم بھارتی نے ایک صحافی کے طور پر اپنے صحافتی کیریئر کا آغاز نومبر 1904 میں 'سودے سمیرن' سے کیا۔ انھوں نے مئی 1906 میں 'انڈیا' کا آغاز کیا اور انقلابی جوش و جذبے کے ساتھ تامل صحافت کی قیادت کی۔ اپنے موقف کے اظہار کے لیے 'انڈیا' کو سرخ کاغذ پر چھاپا گیا اور اس میں پہلا تامل سیاسی کارٹون پیش کیا گیا۔ اپریل 1907 تک انھوں نے تامل ہفتہ وار ہندوستان اور انگریزی اخبار بالا بھارتم میں اپنا حصہ ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ یہ رسالے اس دور میں بھارتی کی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کا ذریعہ تھے۔ بھارتی اپنے ایڈیشنز میں اپنی نظمیں شائع کرتے رہے۔ ان کے گیتوں میں قوم پرستی سے لے کر خدا اور انسان کے درمیان تعلق کے بارے میں خیالات کا مختلف موضوعات و پیرائے میں احاطہ کیا گیا تھا۔ انھوں نے روسی انقلاب اور فرانسیسی انقلاب پر بھی لکھا۔ 1908 میں انگریزوں نے چدمبرنار کو گرفتار کر لیا۔ بعد میں بھارتی کے روزنامہ 'انڈیا' کے مالک کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ سبرامنیم بھارتی کو بھی گرفتار کیے جانے کا امکان تھا بلکہ وارنٹ بھی جاری کیا گیا تھا، اس لیے وہ پانڈیچیری چلے گئے جہاں انھوں نے تمل روزنامہ انڈیا اور وجے، ایک انگریزی ماہنامہ، بالا بھارتھم، اور ایک مقامی ہفتہ وار، سوریودیام کی تدوین اور اشاعت کی۔ انگریزوں نے ان رسالوں کی اشاعت کو روکنے کی کوشش کی۔ 1909 میں برٹش انڈیا میں انڈیا اور وجے دونوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ پانڈیچیری میں سبرامنیم بھارتی کو تحریک آزادی کے انقلابی ونگ کے رہنماؤں جیسے اربندو اور لالہ لاجپت رائے سے ملنے کا موقع ملا۔ بھارتی نے آریہ اور کرمایوگی جیسے رسالوں کی اشاعت میں اروند کی مدد کی۔ یہ وہ وقت تھا جب انھوں نے ویدک ادب کا مطالعہ شروع کیا۔ 1912 میں ان کی مشہور تصانیف کوئل پاٹو، پنچالی سپتھم اور کنن پاٹو کی تالیف ہوئی۔ انھوں نے پتنجلی کے یوگا سوترا اور بھگوت گیتا کا تمل میں ترجمہ کیا۔

بھارتی کو جدید تامل ادب کے بانیوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ انھیں 'مہاکاوی' (عظیم شاعر) کے قلمی نام سے جانا جاتا ہے۔ پچھلی صدی کے ادبا و شعرا کے برعکس، بھارتی اکثر سادہ الفاظ استعمال کرتے تھے۔ بھارتی نے گرامر کے اصولوں کو توڑا اور تمل کو ایک جدیدیت کی راہ دی، جسے پودھو کویتائی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں جدید خیالات اور تکنیک کا اظہار کیا۔

بھارتی کی شاعری ایک ترقی پسند، اصلاح پسند آئیڈیل کا اظہار کرتی ہے۔ انھوں نے ہندوستانی قوم پرستی، محبت، بچپن، فطرت اور تمل زبان کی عظمت جیسے مختلف موضوعات پر ہزاروں نظمیں لکھیں۔ انھوں نے شری اربندو، بال گنگادھر تلک اور سوامی وویکانند جیسے ہندوستانی قوم پرست مصلحین کی تقاریر کا بھی ترجمہ کیا۔ اپنی مادری زبان تمل میں انھوں نے ایک نظم لکھی ''ہم جتنی بھی زبانیں جانتے ہیں ان میں سے ہمیں تمل جیسی کوئی زبان نہیں ملے گی۔'' بھارتی کو 'قومی شاعر' کہا جاتا ہے کیونکہ انھوں نے جدوجہد آزادی کے دوران قومی جذبات کے ساتھ بہت سی نظمیں لکھیں اور لوگوں کو متحد کیا۔

سبرامنیم بھارتی کا انتقال 38 سال کی عمر میں چنئی میں ہوا۔ ان کی موت سے کچھ مہینے پہلے، انھیں ایک ہاتھی لاونیا نے دھکا دیا تھا۔ مدراس کے علاقے ٹرپلکین کے پارتھا سارتھی مندر میں جب وہ ناریل چڑھا رہے تھے۔ اس واقعے میں انھیں چوٹیں آئیں۔ اگرچہ وہ بچ گئے، لیکن ان کی صحت تیزی سے خراب ہوئی۔ 11 ستمبر 1921 کو رات ایک بجے انتقال ہو گیا۔ ان کی آخری رسومات میں صرف 14 افراد نے شرکت کی۔ سبرامنیم بھارتی کی موت ہندوستانی آزادی کی جنگ کی تحریک اور تامل ادب کے لیے ایک بڑا نقصان تھا۔ سبرامنیم بھارتی کی موت کے بعد بھی برطانوی حکومت نے انڈیا میں ان کے گیتوں پر پابندی لگا دی اور ان کی کتابیں ضبط کر لی گئیں۔ 8 اور 9 اکتوبر 1928 کو مدراس قانون ساز اسمبلی میں ایک تفصیلی بحث ہوئی جس میں ستیہ مورتی اور دیگر نے حصہ لیا۔ سبرامنیم بھارتی نے اپنی زندگی کے آخری سال ٹرپلکین کے ایک گھر میں گزارے۔ اس گھر کو 1993 میں تمل ناڈو حکومت نے خریدا اور تزئین و آرائش کی اور اس کا نام 'بھارتی ایلم' رکھا گیا۔ اتیاپورم میں ان کا پیدائشی گھر اور پانڈیچیری میں ان کی رہائش گاہ کو یادگار کے طور پر برقرار رکھا گیا ہے۔ ان کی جائے پیدائش اتیاپورم میں بھارتی کا سات فٹ اونچا مجسمہ، منی منڈپم اور ان کی زندگی کی تاریخ پر ایک تصویری نمائش بھی لگائی گئی ہے۔ سال 1987 میں مصنفین کا سب سے بڑا قومی ایوارڈ سبرامنیم بھارتی ایوارڈ شروع کیا گیا تھا۔ یہ ایوارڈ حکومت ہند کی انسانی وسائل کی ترقی کی وزارت کی طرف سے ہر سال ادب کے بہترین مصنفین کو دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھارتیار یونیورسٹی کوئمبٹور میں 1982 میں قائم کی گئی تھی۔ ان کے مجسمے کئی مقامات پر نصب کیے گئے ہیں۔ متعدد سڑکوں کے نام ان کے نام پر رکھے گئے ہیں، جن میں چینئی وکوئمبٹور میں 'بھارتیار سلائی' اور نئی دہلی میں 'سبرامنیم بھارتی مارگ' شامل ہیں۔ بہت سے اسکولوں، کالجوں اور تعلیمی اداروں کے نام ان کے نام پر رکھے گئے ہیں۔

بھارتی کا وژن منفرد اور مؤثر ہے۔ ان کا کردار اور ان کا کام آنے والی نسلوں کو متاثر کرتا رہے گا۔ سبرامنیم بھارتی کا مطالعہ اس اعتبار سے بھی بہت اہمیت کا حامل ہے کہ مہاکوی سبرامنیم بھارتی ملک کے اعلیٰ عہدے جیسے: یو پی ایس سی، آئی اے ایس، امتحان کے لیے سب سے اہم موضوعات میں سے ایک ہے۔ اس میں 'ہندوستانی تاریخ - اہم شخصیات' (جنرل اسٹڈیز 1) کے نصاب اور یو پی ایس سی ابتدائی امتحان میں قومی اہمیت کے موجودہ واقعات کے ایک اہم حصے کا احاطہ کیا گیا ہے۔ بھارت کے وزیر اعظم نے ہندوستانی ادب کے معمار: مہاکوی سبرامنیم بھارتی کے 100 ویں سالگرہ پر خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بھارتی کو غیر معمولی شخصیت قرار دیا اور کہا کہ ''قوم کے لیے کثیر جہتی خدمات، سماجی انصاف اور خواتین کو بااختیار بنانے کے لیے ان کے عظیم نظریات کو یاد کرتے ہیں۔'' نیز ہر سال 11 دسمبر کو کثیر لسانیات اور مجاہد آزادی مہاکوی سبرامنیم بھارتی کے یوم پیدائش کے موقع پر 'بھارتی بھاشا دوس' منانے کا اعلان کیا گیا۔

حوالہ جات

1 کتاب (تامل): تامل ادب کی تاریخ
2 مصنف۔ ڈاکٹر ایم اروناچلم و پروفیسر راجہ وردراجا
3 کتاب (تامل): مہاکوی بھارتیار (نظموں کا مجموعہ) مرتب: وائی۔ گووندن
4 کتاب (انگریزی): بھارتی، مصنف: پریما نندا کمار

■

Dr. Mohd Tayyab Ali
Dept. of Urdu, The New College
Peter's Road, Royapettah
Chennai- 600014 (Tamil Nadu)
70612461Mobile No. +9188
tayyabali@thenewcollege.edu.in

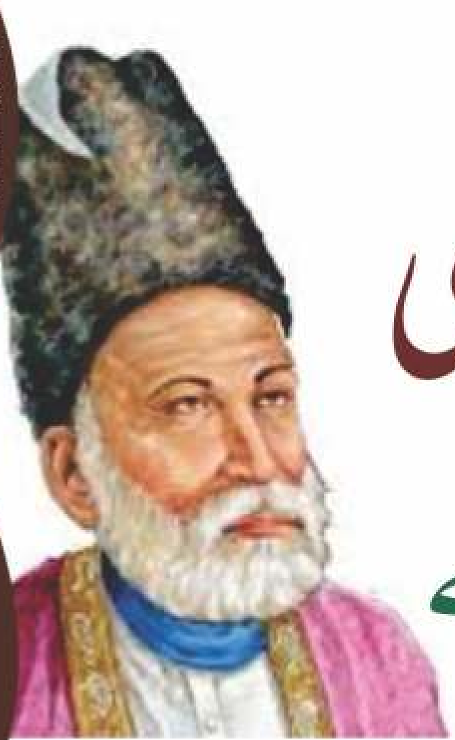

امان اللہ ایم بی

اہل تمل میں غالب شناسی

کلام غالب کے تمل تراجم کے حوالے سے

مرزا غالب اردو کے آفاقی شاعر ہیں۔ ایک ایسا منفرد شاعر جس نے نہ صرف اردو والوں کو بلکہ پوری دنیا کے ادب سے محبت کرنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ غالب نے اپنی زندگی کے نشیب وفراز کو شاعری میں منتقل کیا اور اپنے تجربے دنیا تک پہنچائے۔ غالب کی شاعری کچھ ایسی سچائیوں کو بھی اجاگر کرتی ہے جن کا تمل دنیا کو ابھی تک علم نہیں ہے۔ غالب کی شاعری کے دنیا کی بیشتر زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔ تمل ایک قدیم ترین دراوڑی زبان ہے لیکن اس میں بہت دیر بعد غالب کے منتخب کلام کا ترجمہ ہوا ہے۔ غالب کے فارسی کلام کا انگریزی زبان میں جناب موسیٰ رضا نے ترجمہ کیا ہے انگریزی کی وساطت سے تمل میں لتا رام کرشنن نے 'مرزا غالب : تویٹرن اِدَزْکلِل وِرِی یمُ پُن نگگی' کے نام سے ترجمہ کیا ہے جو 2018 میں کویتا پبلی کیشنز چینئی سے شائع ہوا۔ غالب کی سوانح حیات کا تمل زبان میں سی ایس دیوناد ھن نے 'اردو غزل اَرَسر مرزا غالب' کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ جہاں تک اردو کلام کا سوال ہے یہ مکمل ترجمے زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوئے۔ میرے پیش نظر دو ترجمے ہیں ایک غالب کے اردو کلام 'دیوان غالب' کا راست ترجمہ ہے جو مخطوطے کی شکل میں ہے غیر مطبوعہ ہے جسے ڈاکٹر رفیق پاشا حسینی، سابق ڈائرکٹر، دوردرشن کیندرا، تمل ناڈو نے 'ینپ پریلم' کے نام سے کیا ہے۔ دوسرا وہ ترجمہ جسے پروفیسر شری نواس رنگن، سابق پروفیسر، شعبہ انگریزی، واو چدمبرنار کالج، توتوکڈی، تمل ناڈو نے 'اردو کوبجر کوی کوئل غالبن کوی دیکل' کے نام سے کیا ہے۔ آخر الذکر ترجمے میں غالب کے منتخب کلام کی تشریح بھی شامل ہے۔ یہ کتاب 2014 کو نیو سنچری بک ہاؤز چینئی سے شائع ہوئی۔

غالب کے کلام سے کون محظوظ نہیں ہوسکتا ؟ غالب کی شاعری زمان و مکاں سے ماورا ہے۔ تمل باشندوں کو غالب کے کلام کا چسکا بہت بعد میں لگا۔ تمل تہذیب میں مشاعرہ جیسی محفل کا کوئی تصور نہیں ہے۔ جب یہاں کے باشندے شمال پہنچے تو وہاں انھیں مشاعروں میں شرکت کا اتفاق ہوا تب انھوں نے غالب کو تمل قاری سے متعارف کرانے کے بیڑا اٹھایا۔ غالب کی شاعری سے متاثر ایک تمل صاحب کہتے ہیں:

''میں دس سال تک شمالی ہند میں رہا.. اس دوران مجھے وہاں منعقد ہونے والے 'مشاعرہ' اور ہندی کوی سمّیلن میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ اردو شاعر غالب کی 'غزل' نے مجھے مسحور کر دیا۔ مشاعرے میں امیروں سے لے کر عام دکانداروں تک کی شرکت سے بہت متاثر ہوا۔ ان کا بارہا 'واہ واہ واہ' کہنے کا نرالہ انداز بہت پسند آیا۔''

جناب پروفیسر شری نواس رنگن رقم طراز ہیں:

''اسی پس منظر میں یہ معاملہ میرے ذہن میں آیا اور مجھے تمل میں غالب کے کلام کی تشریح پر اکسایا۔ اگر ہو بہو اس کا ترجمہ پیش کر دیا جائے تو ذائقہ خراب ہوسکتا ہے۔ لیکن تمل لوگ شاید اس عظیم شاعر کی شاعری کو نہیں جانتے۔ ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے جہاں تک ہوسکا میں نے ہر ایک شعر کی مختصر وضاحت اس لیے کی ہے کہ غالب کی شاعری کی بہت سی خصوصیات محض ترجمے کے ذریعے پیش نہیں کی جاسکتی اس لیے میں نے غالب کے صرف بہترین اشعار کا انتخاب کیا اور مختصر سی وضاحت پیش کر دی ہے۔ غالب کی غزلیں جو محبوب کی نزاکت، عشق و رومانوی تکنیک اور دنیا کی فطرت پر مرکوز ہیں، انتہائی قابل تعریف ہیں۔ اردو کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ غالب کی شاعری میں مٹھاس ہے۔ میری تشریحی تحریر میں شہد ہو یا نہ ہو، اہل تمل کو غالب کے ساتھ انسیت ہو تو کافی ہے۔ اس طرح میں یہ سوچ کر آپ کے سامنے یہ ترجمہ پیش کرتے ہوئے امید کرتا ہوں کہ میری محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔''

مرزا غالب کا اگرچہ تعلق ایک بڑے گھرانے سے تھا لیکن وہ تمام عمر غربت کا شکار رہے۔ انگریزی کے بڑے ادیبوں نے غالب کی شاعری کے تراجم اس طرح ترتیب دیے جیسے وہ انگریزی میں ہی تخلیق کیے گئے ہوں۔ آج بھی ان کی شاعری زندگی سے جگمگاتی ہے۔ ایہام گوئی، آپ بیتی، ناامیدی کو آئینہ بنانا مگر امید کو غالب رکھنا، زندگی کو ہر ممکن حد تک حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کرنا، سوچنے پر آمادہ کرنا، وصل کی ہوس کو عشق کی تقدیس میں بدلنا، سوز و گداز، تخیل سے بھرپور، انفرادیت، یہ تمام غالب کی شاعری کی وہ خصوصیات ہیں جنھیں مترجم نے ان پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہوئے غالب کے اشعار کو تمل کے قالب میں ڈھالا ہے۔

جہاں تک دیوان غالب کا تعلق ہے ڈاکٹر رفیق

پاشا حسینی نے غالب کے اشعار کو تمل رسم الخط میں منتقل کردیا ہے تا کہ اہلِ تمل غالب کے اشعار کو اسی آب و تاب کے ساتھ پڑھیں جیسے اردو والے اسے پڑھتے ہیں۔ حسینی صاحب کے ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اشعار کا ترجمہ تمل زبان میں تمل کی تہذیب سے قریب تر کیا ہے۔ اردو میں بحر، قافیہ و ردیف کی پابندی ہے جبکہ تمل شاعری ان روایات سے مبرا ہے۔ انھوں نے اپنے ترجمے میں اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے غالب کے کلام کو تمل کا جامہ پہنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ چند اشعار یہاں بطور نمونہ زیر بحث لائے گئے ہیں ملاحظہ ہوں۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

تمل ترجمہ:

وَرَینتَ چِترَمْ ...
یَارُتَیَ پَتْپُچْ چیرُکّے ایترُتْ
مُرَیِیتُکِرَتْ؟
اووّورُ اووِیَمْمْ،
کَاکِتَ آئیے اَنِیتْرُکِّرَتْ؟

اس شعر کے ترجمے میں 'کاغذی پیرہن' کو تمل میں حاشیہ لکھ کر سمجھایا گیا ہے کہ قدیم زمانے میں کچہری کو کاغذی لباس پہن کر جانے کا رواج تھا۔ دنیا بے ثبات ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کاغذی تخلیق کرنے والے کے خلاف مقدمہ لڑ رہے ہیں۔

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا

تمل ترجمہ:

اُیِرْ پِرِکُّمْ کَکْمْبُ پِرْ کیتُکَاتے!
اِرَوِیپْ پَکَلَاکْ...
مَلَیپِیلُکْ کُتَیْتُ آرِیپْ پَایُوتُوْیِتُمْ؟

'جوئے شیر لانا' اس محاورے کا تمل میں خوب ترجمہ کیا گیا ہے۔ 'تنہائی' میں 'رات کو کاٹنے' کو پہاڑ توڑ کر ندی کو راستہ بنانے کے کام انجام دینے کے مترادف قرار دیا ہے۔

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

تمل ترجمہ:

اَرِوُ ایوُلُوْتَاوُ وَلَیّے وِرِتَّالُمْ
اِیوُ اُرِیپِیوُ آلَمْ
چِکَّاتَ اَنْھَکَا - "وِیرُمْبِیرُوِے "، !

'عنقا' کو تمل میں حاشیہ لکھ کر سمجھایا گیا ہے کہ عنقا ایک خیالی پرندہ ہے جو اپنا بسیرا وہاں رکھتا ہے جو نظروں سے دور تخلیقی دنیا سے تجاوز منتہا جہاں کچھ نہ ہوتا ہے جسے عدم کہتے ہیں۔ شاعری میں علامت کے طور پر مستعمل ہے۔

پروفیسر شری نواس رنگن نے غالب کے شعری مفہوم کو اہلِ تمل میں منتقل کرنے کی سعی کی ہے۔ انھوں نے غالب کے اشعار کو ترجمہ کرنے سے پہلے اس نوعیت کی تمل شاعری سے متعارف کراتے ہوئے غالب کے شعر کی مختصر تشریح کی پھر اس کا تمل ترجمہ پیش کیا ہے۔ شری نواس نے بھی غالب کے اشعار کی قرأت کے لیے انھیں تمل رسم الخط میں تحریر کیا ہے لیکن اس میں وہ کامیاب نہیں نظر آتے ہیں۔ تمل میں اردو کے اشعار کی قرأت گنجلک معلوم ہوتی ہے۔ بہر کیف آپ کی کوشش کی داد دینی چاہیے۔

'کنہ داسن' تمل کے مشہور شاعر گزرے ہیں جنھوں نے زندگی کے ہر جذباتی لمحے کے لیے تمل زبان میں گیت لکھے ان سے متعلق کہا جاتا ہے کہ 'کنہ داسن' اگر تمل ناڈو کے بجائے یورپ یا امریکہ میں پیدا ہوا ہوتا تو شاید وہ ادب میں نوبل انعام یافتہ بن جاتا اور بین الاقوامی سطح پر اپنی پہچان بناتا'۔ کنہ داسن کی مشہور زمانہ گیت تمل میں تیوُمْ تَنْتَ وِیتُ وِیتِیرُکْ (خدا کا دیا ہوا گھر سڑک ہے) کچھ حد تک غالب کے شعر سے قریب نظر آتا ہے۔

عاشق کا گریباں

خدا کی مخلوق میں بعض نسلیں خوش قسمت ہیں۔ انسانی نسل کو ہی لے لیجیے، انسان باقی تمام انواع پر حاوی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شاید فطرت اس کا بدلہ لینا چاہتی ہے۔ خدا انسان کو کچھ بے جان چیزوں کے لیے بھی مجبور کردیتا ہے۔ سائنسی ترقی سے دنیا سمٹ کر انسان کے ہاتھ میں آ رہی ہے۔ اگر وہ چاہے تو دنیا کو تباہ کرسکتا ہے۔ اس طرح قوی و طاقتور انسان کو ایک ہاتھ کپڑا کس طرح بے بس کردیتا ہے تب اس کپڑے کی قسمت ہی کیا ہے۔ غالب نے کہا۔

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

پورندر داسر نے کہا "ایلورُمْ اُیِپِّتُ ایتِرْکَاکْ؟" سب کس کے لیے کام کرتے ہیں؟ اورُ جَانُ وَیِرُتَّکَاکْ، اورُ جَانُ تُنِکَّاکْ" ایک بالشت پیٹ کے لیے کھانا، ایک بالشت کپڑے کے لیے۔ اوویار نے کہا 'اُنپَتُ نَالِ اُتُپَتُ نَانُکُمْلَمْ' بھوک مٹانے کے لیے ایک مٹھی کھانا جسم چھپانے کے لیے چار گرہ کپڑا'۔ سنگم دور کی شاعری ہے کہ "اُنپَتُ نَالِ اُتُپْوِے اِرَنْٹے" پیٹ کے لیے دو دانے جسم کے لیے دو کپڑے۔"

اس شعر کی وضاحت میں مترجم کا کہنا ہے کہ ''غالب اس کپڑے کی قدر میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔ تمل کی کہاوت ہے 'کپڑا آدھا آدمی ہے'۔ 'آتے پَاتِی آلِپَاتِی۔' یعنی شخصیت سازی میں نصف آدمی تو نصف لباس ہے۔ غالب نے محبوب کی دھڑکن کو محبوبہ کے لباس پر موقوف کیا ہے۔ عاشق کی دھڑکنوں کا سبب محبوب کا زیب تن ہے، اور اگر وہ چمک دمک، انداز اور دلکش رنگوں میں آرائش و زیبائش نہیں تو عاشق کیا لطف اٹھائے؟ ایک ہاتھ کپڑا ہی تو محبوب کی عصمت و ذلت پر قادر ہے۔ 'تمل میں یوں ترجمہ کیا ہے۔

کَاتَلِینُ اُتَلَلَّ
کَیبِیلَتُ تُنِ اِتَّنَاوُ،
کَاتَلَیْنُ کَوُرَوُتَّیکُ
کَچِتَمَایُ اَتَکّتیے

مترجم کا کہنا ہے کہ 'غالب کے متذکرہ بالا شعر کی نزاکت کا لطف اٹھائیں کہ عشق کے اظہار میں اس کے انداز بیان کی تعریف کریں۔ شعر پڑھنے کے بعد، اس کی شعریت سے لطف اندوز ہوں یا شاعر کے کمال کی داد دیں ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔'

بصری لذت

اردو شاعری میں عشق ایک اہم موضوع ہے۔ تمل میں عشقیہ شاعری کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ مترجم نے غالب کے درج ذیل شعر کی تفہیم کو تمل میں منتقل کرنے کے لیے جو وضاحت کی ہے ملاحظہ ہو۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

''اس شعر میں غالب نے بتایا ہے کہ عشق کیا ہے۔ بہت سے شاعروں نے عشق کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔ لیکن غالب نے عشق کو آسانی سے سمجھنے کے لیے ایک نیا زاویہ پیش کیا ہے۔ آگ لگانے کے لیے عام طور پر کسی فرد یا کسی آلے کی ضرورت ہوتی

ہے۔لیکن عشق اپنے آپ سے سلگنے کی طاقت رکھتا ہے۔ کسی کے قابو سے باہر ہے۔ اگر عام آگ جلنا شروع ہو جائے تو فائر بریگیڈ اسے بجھانے میں مدد کر سکتی ہے۔ لیکن عشق کی آگ کو کوئی طاقت نہیں بجھا سکتی۔ اگر عشق کی آگ بھڑک جائے تو یہ مشعل شعلہ بن کر جلنے لگے۔ اس کی شدت بڑھ جاتی ہے اور کبھی کم نہیں ہوتی۔ اردو میں 'عشق' کا مطلب لامحدود محبت ہے۔ عشق کی آگ لگانے سے نہیں لگتی۔ ایک بار لگ جانے کے بعد، کوئی تو توانائی ایسی نہیں کہ اسے بجھا سکے۔'' (غالبن کوی دیکل)

تمل ترجمہ

اِیرٗنالُ اِیرِیَاتَ
اَنِیتَّالُمْ اَنِیپَاتَ
اِیجُکتِ کونٗتُمْ
جِیتَّتَ مُتِیاتَ
اِیتو اوزْ تِیپے کَاتِلے
اینکے پیرٗتُ مَنِتَ اِنَمْ؟

خون کے آنسو

'رتھا کنیر' 1954 کی ایک تمل فلم ہے جس کی ہدایت کاری کرشنن پنجو نے کی تھی، دراصل یہ تمل ڈرامہ ہے جسے تھنگراج نے لکھا تھا۔ تھنگراج کے اسی نام کے ڈرامے پر مبنی، فلم میں ایم آر رادھا، سری رنجانی اور ایس ایس راجندرن، چندرا بابو، ایم این راجم اور ایس آر جانکی کے ساتھ معاون کردار ادا کیا ہے۔ یہ فلم تمل سنیما میں بہت پسند کی گئی۔

'رتھا کنیر' کا مطلب بھی خون کے آنسو ہے۔ اس نام کے ساتھ تمل میں آنے والی فلم 'رتّکنیر' کا موضوع بھی جذبات کا اظہار ہے۔ غالب گویا ہیں ۔

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

میں رگوں میں بہتے خون کو خون نہیں سمجھتا۔ خون کا حقیقی کردار تو یہ کہ وہ جذبہ و احساس کی نمائندگی کرے اور آنسو بن کر مقدس آنکھ سے ٹپکے ورنہ تو وہ لہو کیا ہے؟ یہ شعر نہ صرف اردو والوں کے لیے بلکہ اب اہل تمل کے لیے بھی جذباتی طور پر دل کو چھو لینے والا ہے۔ اس شعر کا تصور یہ ہے کہ آنسو خوشی ہوں یا غم کے دونوں جذبات کی حدوں کو چھوتے ہیں۔ اسی کیفیت کو کم و بیش ترو ولور نے یوں کہا ہے ؛ 'اَنبرکُمْ اُنْتو اَتَیکُمْتَالُ

آروَلَرْ پُنْکنیرْ پُوسَلُ تَرُمْ' (دل میں محبت کو بند نہیں کیا جا سکتا، وہ اذیت میں پیارے کے آنسوؤں سے نکلتا ہے۔) غالب کے شعر کا تمل ترجمہ یوں ہے کہ

اِرَتَّ نَالَّتَلُ اوتُکَتَرٗتُ
اُنَمے اِرَتَّمَا؟۔ اِلَّے! اِلَّے!
اُرَجّ مِکُتِیلُ وَلِیُمْ کَنِیرے
اُنَمے اِرَتَّمْ!

آدمی کا انساں ہونا

غالب نے انسانی زندگی کی کیفیات اور نفسیات کو اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ آدمی کو انسان بننے کے لیے جو دلیل پیش کی وہ کمال کی ہے۔ انسانیت پر مضمون آفرینی کا اندازہ اہل تمل نے غالب سے کیسے سمجھا ہے ملاحظہ ہوں:

''روسی شاعر نے کہا کہ آدمی پرندے کی طرح اڑنا اور مچھلی کی طرح پانی میں تیرنا سیکھ لیا ہے۔ لیکن انسان بن کر زندگی گزارنا نہیں سیکھا۔ غالب نے روسی شاعر کے زمانے سے پہلے کی ایک غزل میں اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ لیکن کہنے کا انداز الگ ہے۔ غالب کے اس شعر میں کیا شان ہے! شاعری میں کیا جان ہے!''

غالب کے اشعار کے تمل تراجم سے یہ کیفیت یوں محسوس ہوتی ہے کہ 'چاند پر قدم رکھنا اب کوئی مشکل کام نہیں، سیکڑوں منزلہ عمارت بنانا کوئی مشکل نہیں۔ انسان بہت سے حیران کن مشکل کام آسانی سے انجام دے رہا ہے، لیکن آسان کام کرنا انسان کے لیے مشکل نظر آتا ہے جیسے صبر کرنا، دوسروں کی غلطیوں کو برداشت کرنا، دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنا، چھوٹے احسان کرنا اور دوسروں کو دھوکہ نہ دینا جیسے آسان کام کرنا انسان کے لیے مشکل معلوم ہوتا ہے۔ جب دوسروں کو تکلیف ہو تو دور سے تماشائی بن کر ہنسنا کوئی انسانیت ہے؟ انسانیت کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر ہیں تو ان سب کے بغیر انسان انسانی عظمت کو حاصل کیسے کر سکتا ہے۔ اسی مفہوم کو غالب نے دو مصرعوں میں خوبصورتی سے بتایا ہے کہ اس قسم کی انسانیت کا حصول کتنا مشکل ہے۔''

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

تمل ترجمہ

مَنِتَنْ!
اَرِیَ جِیَلُمْ اَوَنُکُّ اِیلَاکُمْ!
مَنِتَّاکَ وِلَنکُتَلُ...
اَتّانُ اَوَنُکُّ اَرِیَ جِیَلَاکُمْ!

مذکورہ تمل ترجمہ کا مطالعہ ہمیں یہ احساس دلا رہا ہے کہ مترجم نے غالب کے شعر کو کتنی گہرائی سے سمجھا ہے، مترجم رقمطراز ہے:

''آدمی یہ سمجھتا ہے کہ محض آدمی اور جانور میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پتہ نہیں ہم کب انسانیت والے آدمی بن جائیں گے جیسا کہ غالب کی توقع ہے۔ اس شعر میں امید کی کمی نظر آتی ہے۔ اگر امید کو تقویت دینا ہے تو ہر شخص کو چاہیے کہ ہر روز کم از کم کچھ انسانی بنیادوں پر عمل کرنا چاہیے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ غالب کی نظر میں ناانصافی کا بہادری سے مقابلہ کرنا۔ دوسروں کو تکلیف نہ دینا۔ خودغرضی کو دور کرنا۔ سماج کے لیے دن میں کم از کم ایک گھنٹہ مختص کرنا۔ ہسپتالوں میں بیمار لوگوں کی عیادت کرنا۔ سماجی خدمت کے لیے آمادہ ہونا۔ لالچی نہ ہونا وغیرہ اگرچہ یہ تعلیمات اکثر سنی جاتی ہیں، لیکن یہ انسانیت کو ترقی دینے میں کارگر ثابت ہو گی۔''
(غالبن کوی دیکل)

دل ہی تو ہے

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

تمل ترجمہ:

"اِتَیَمْ تَانے اُتُو، وِیَتَنِیے نَرَبّ مُتِیَاتَ
کَلُ اَلّوے"!

اینّے ایلنَمْ جیتّال آیرَمْ تَنْوّے اَلْوین!

اسی شعر کا ایک اور تمل ترجمہ یوں بھی ہے۔

اِتُّ نِرپّ اِنَمْ اِرُکّنْرَ

اِتِیّنْتائے اِتُّ! کَللْگییے!

ویتّھ جولّالْ ویتّے تّتّالْ

آیِرَمْ تَنْویکَلْ اَلْتّوین!

اس شعر کو 'دل ہی تو ہے پتھر نہیں' کے عنوان کے تحت ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس کی تمل تشریح اس طرح کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہوں:

''دل کیا پتھر ہے؟ یہ مت سوچیں کہ آپ اس عنوان کو پڑھنے کے بعد ہمدردی کے بارے میں بات ہوگی۔ غالب نے اس شعر میں دل کا موازنہ ایک مختلف پتھر سے کیا ہے۔ پتھر اتنا ٹھوس ہے کہ اس کے اندر کوئی چیز نہیں رہ سکتی۔ جذبات اس کے اندر سمائے نہیں جا سکتے۔ غالب کے دل میں جب یہ احساسات اترتے ہیں تو وہ احساسات درد کا باعث بنتے ہیں۔ جب کوئی ہمارا مذاق اڑاتا ہے تو اس کا اثر ہمارے دل پر پڑتا ہے تو ہم اس کی وجہ سے روتے ہیں۔ رونا دل کی تکلیف کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ غالب کو قرض کی ایذا رسانی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ غربت میں ادھر ادھر بھٹکتے رہے۔ اردو مشاعروں میں اِدھر اُدھر اُن کی مخالفت بھی ہوئی۔ ان کے دوست ان کا مذاق اڑاتے رہے تو غالب کا دل بھر آیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر غالب نے قلم کو اپنے تجربے کی سیاہی میں ڈبو کر لکھا ہے اور غالب نے کتنی خوبصورتی سے کہا کہ رونا مصائب کا تریاق ہے۔'' (غالبن کوی دیکل)

راہ پرخار

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں

جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

تمل ترجمہ

اینْتّھِی کالْگلِنْ اوچّے کیٹّ

اِتِیَمْ تُنْگمْ کونْتّتُّ!

مُلْ نِرینْتَ پاتِیلْ ہووٹّ کَنْٹ

اَنْتّمْ مَکِلْچ کونْتّتُّ!

اردو کے شارحین غالب نے مذکورہ شعر کی تشریح اپنے انداز سے کی ہے لیکن ایک تمل ادیب جس نے غالب کو سمجھا، غالب کی راہ پرخار کو دیکھ کر متذکرہ بالا شعر کی تمل تشریح یوں کی ہے:

''جب انسان پر مصیبتیں کئی سمتوں سے حملہ آور ہوتی ہیں تو وہ لڑکھڑا جاتا ہے۔ بیماری، قرض، دفتر میں دوست نما دشمنوں کی خیانت، نتائج پر غور کیے بغیر اعمال کی وجہ سے پیدا ہونے والی پریشانیاں، ایسی پریشانیوں میں رہتے ہوئے آدمی کچھ خوف سے کانپ جاتا ہے۔ جب وہ تنہا ہوتا ہے تو وہ سنجیدہ سوچ میں مشغول رہتا ہے لیکن دل میں یہ سوال بے چینی کا سبب بنتے ہیں کہ قرض کی ضامن جائیداد مقبوض تو نہیں ہوجائے گی؟ دشمن سے جان کو خطرہ تو نہیں ہوگا؟ رشتے دار مذاق تو نہیں اڑائیں گے؟ نوکری ہاتھ سے نکل جائے گی؟ نا اہل سمجھ کر کیا بیوی بچے ہم سے دور ہوجائیں گے؟ ایک ایسی گھبراہٹ کا ماحول غالب رہتا ہے تب ہم چلتے ہیں تو کیا ہمارے قدموں کی آہٹ سے ہمیں خوف نہیں پیدا ہوتا؟ انگریزی شاعر الیگزینڈر کہتا ہے 'میں خود اپنے قدموں کی آواز سے ڈر گیا'۔ تو ایسے میں راہ پر کانٹوں کے سوا کچھ نہیں۔ مستقبل کی کوئی امید بھی نہیں ہے۔ ایسے پرخطر ماحول میں یہ تذبذب ہوگا کہ پیر کا خیال رکھنا ہے یا موجودہ پریشانی کا خیال؟ کسی بھی حالت سے گزرنا ہی ہے، تب آپ چلیں گے تو راہ ہموار پائیں گے اور تناؤ کو کم محسوس کریں گے۔ لگتا ہے غالب نے اسی کیفیت کے تجربے سے گزر کر شعر تخلیق کیا ہے۔'' (غالبن کوی دیکل)

الغرض اردو زبان اور اردو شاعری کا جادو ہے کہ اس کے پڑھنے اور سننے والے پر ضرور اثر کرتا ہے۔ غالب کے اشعار کے تمل تراجم اہل تمل پر اتنے اثر انداز ہوئے کہ اس سے تمل شعرا کے اندر اردو غزل سے بھی دلچسپی بڑھنے لگی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمل کے شعرا نے اردو کے کلاسیکی اور جدید شعرا مثلاً میر، مومن، غالب، بہادر شاہ ظفر، داغ، شیفتہ، علامہ اقبال، سیماب اکبر آبادی، ناصر کاظمی، جگر، آنند نرائن ملا اور فیض کا منظوم ترجمہ پیش کیا ہے۔ کوی کو عبدالرحمٰن تمل زبان کے جدید شعرا میں اپنی ایک علاحدہ شناخت رکھتے ہیں۔ آپ کی مادری زبان اردو ہے۔ آپ نے تمل کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا اور اپنی تمل شاعری کی بدولت ملک الشعرا کا خطاب حاصل کیا۔ آپ نے علامہ اقبال، بہادر شاہ ظفر اور فیض احمد فیض جیسے مشہور شعرا کے منتخب کلام کا تمل میں ترجمہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں' تمل شاعری میں صنف غزل اور ہائیکو کو رواج دینے کا سہرا بھی آپ ہی کے سر جاتا ہے۔ اس طرح سے اہل تمل نے جب غزلیں سنیں تو تمل میں 'تمل غزل' کے نام سے اتنے اشعار تخلیق کیے کہ آج سو سے زائد 'تمل غزل' کے شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ایروڈ تمل انبن، شری نواس، چنی ملے ونڈہ بانی وغیرہ تمل کے معروف غزلیہ شعرا ہیں۔ ان میں سے اکثر غالب کی غزلوں سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اگر غالب کا مجموعہ کلام پوری طرح سے تمل عوام میں بہ زبان تمل تشریح کے ساتھ ہاتھ آجائے تو اس سے استفادے کے مواقع میسر ہوسکتے ہیں۔ نیز 'تمل غالب' یا 'تمل غالبیات' کا میدان وسیع ہوتا چلا جائے۔ اب ہمیں مطالعات غالب کے لیے ایک نیا باب وا ہوتا نظر آتا ہے۔

ماخذ و مراجع:

1 اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ، 1999 سنبل نگار، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔

2 The Smile on Sorrow's Lips: Selected Verses from Ghalib's Persian Poems With Urdu and English Poetic Translations, Translated by Moosa Raza, Published by Createspace Independent Pub (24 June 2015)

3 مرزا غالب: تویترن اڈکلل وری یمُ پُن نگئی، لتارام کرشنن، 2018، ناشر کویتا پبلی کیشنز، چنئی۔

4 اردو غزل ار سر مرزا غالب، سی ایس دیوناتھن۔ 2017، یونیورسل پبلی کیشنز، چنئی۔

5 اردو کونجر کوی کوئل غالبن کوی دیکل، شری نواس رنگن، مطبوعہ 2014، ناشر: نیو سینچوری بک ہاؤز لمیٹڈ، چنئی۔

6 دیوان غالب کامل، مرتبہ، کالی داس گپتا رضا۔

7 ینپ پرلیم: ڈاکٹر رفیق پاشا حسینی، (غیر مطبوعہ)

8 تمل زبان میں اردو تخلیقات کے تراجم، ڈاکٹر امان اللہ ایم بی، 'اردو دنیا' ستمبر 2017۔

9 شرح دیوان غالب، پروفیسر یوسف سلیم چشتی، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور 1959۔

10 بیان غالب، شرح دیوان غالب، آغا محمد باقر، کتابی دنیا، دہلی، 2000۔

■

Dr. Amanulla M.B
Chairman of Urdu,
Dept. of Arabic, Persian and Urdu
University of Madras, Chennai - 600005.
Email:dramanullashah2@gmail.com
Mob:9841817272

عائشہ صدیقہ جے

تمل ادب کا شاہکار ’تروکرل‘ میں درسِ اخلاقیات

تمل زبان دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس کا تعلق دراوڑی زبانوں کے خاندان سے ہے۔ تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ دراوڑ قوم نہایت ترقی یافتہ اور مہذب قوم تھی۔ موہنجوداڑو اور ہڑپہ میں کھدائی کے نتیجے میں جو کچھ کتبے دستیاب ہوئے تھے ان پتھروں پر کندہ نقوش میں جس زبان کا نقش ملتا ہے وہ تمل رسم الخط سے قریب ہے۔

ہندوستان میں دراوڑیوں نے جنوب میں بود و باش اختیار کی اور ان کے ساتھ ساتھ ان کی تہذیب، ثقافت اور زبان کا ارتقا جنوبی ہند میں مسلسل ہوتا رہا۔ تمل زبان نے زمانے کا ساتھ دیا اور حسب ضرورت خیالات، نظریات، لفظیات اور سماجی و سیاسی اثرات قبول کیے۔ اسی لیے اس زبان میں جہاں ایک طرف ہندومت، جین مت، بدھ مت، عیسائی مذہب اور مذہب اسلام کے اثرات پڑتے رہے تو وہاں لسانی اعتبار سے بھی سنسکرت سے لے کر جدید ترین زبان اردو تک کے اثرات بھی اس میں ملتے ہیں۔ اس زبان کے بولنے والے شروع سے انصاف پسند، رحم دل، دیانت دار اور انسانی قدروں کے پاسدار رہے ہیں۔

تمل ناڈو کی قدیم حکومتیں چیرا، چولا اور پانڈیا نے ہمیشہ علم و ادب کی قدر دانی اور سرپرستی کی۔ شعرا و ادبا کو آزاد فضا میں پھلنے پھولنے کا پورا موقع فراہم کیا تھا۔ تروکرل کو تمل ادب میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

’تروکرل‘ تمل ادب کی ایک شاہکار تصنیف ہے جسے تروولّور نے تقریباً دو ہزار سال پہلے تصنیف کیا تھا۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ شاہکار دو ہزار قبل مسیح سے کچھ پہلے تصنیف کیا گیا ہے۔ اس مقدس تصنیف کو تمل ادب میں بہت اونچا مقام حاصل ہے۔

> ’تروکرل‘ تمل ادب کی ایک شاہکار تصنیف ہے جسے تروولّور نے تقریباً دو ہزار سال پہلے تصنیف کیا تھا۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ شاہکار دو ہزار قبل مسیح سے کچھ پہلے تصنیف کیا گیا ہے۔ اس مقدس تصنیف کو تمل ادب میں بہت اونچا مقام حاصل ہے۔

تمل قوم کے ہر گھر میں اس تصنیف کو مقدس سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ نصابی کتابوں اور تمل ناڈو کے پبلک ٹرانسپورٹ میں بھی ’تروکرل‘ کے ابیات چسپاں کیے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گویا تمل قوم کی زندگی میں ’تروکرل‘ کا موجود ہونا ان کے لیے بڑی سعادت کی بات ہے وہ اسے اپنے گھر میں رکھنا باعث ثواب سمجھتے ہیں۔ ’تروکرل‘ ایک عظیم اور قدیم شاہکار ہے اس تصنیف پر شارحین نے سیکڑوں کتابیں تصنیف کی ہیں۔

’تروکرل‘ کا ترجمہ نہ صرف ہندوستانی زبانوں میں ہوا بلکہ عالمی زبانوں میں بھی اس کے ترجمے کیے گئے۔ حتیٰ کہ عربی زبان میں بھی ’تروکرل‘ کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

’تروکرل‘ کے جتنی بھی زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں ان میں سے بیشتر انگریزی ترجمے کو سامنے رکھ کر کیے گئے ہیں۔ جہاں تک اردو میں تروکرل کے منظوم اور منثور ترجمے ہوئے ہیں وہ اکثر و بیشتر راست ترجمے ہیں کیونکہ اردو کے ان مترجمین کو تمل زبان سے اچھی خاصی واقفیت تھی۔ تمل چونکہ یہاں کی علاقائی زبان ہے اس لیے یہاں کے مسلمان بھی اس زبان سے آگہی رکھتے ہیں۔

’تروکرل‘ کے اردو مترجمین میں سب سے پہلے پروفیسر عظمت اللہ سرمدی، پروفیسر حسرت سہروردی، مولانا اسماعیل رفیعی، حضرت مختار بدری اور ڈاکٹر امان اللہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سب سے پہلے پروفیسر عظمت اللہ سرمدی نے منتخب اشعار کے منظوم ترجمے کا بیڑا اٹھایا مگر اس کی تکمیل نہیں ہو پائی۔ ’تروکرل‘ کا اردو زبان میں نثری ترجمہ پروفیسر حسرت سہروردی نے سلیس اردو میں ’کرل‘ کے نام سے کیا جسے ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی نے 1965 میں شائع کیا، جس کو اردو میں اولین ترجمے کا اعزاز حاصل ہے۔

اس کے علاوہ مولانا اسماعیل رفیعی پرنامبٹی نے

'تروکرل' کے منتخب ابواب کا منظوم اردو ترجمہ ثلاثیات کی ہیئت میں کیا ہے، مگر اس کو وہ پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکے جس کا تذکرہ علیم صبا نویدی کی کتاب 'تمل ناڈو میں اردو' میں ملتا ہے۔

علاقہ کرشنگری کے مختار بدری نے 'تروکرل' کا مکمل منظوم ترجمہ 'لفظ لفظ گہر' کے نام سے کیا ہے جسے تمل ولرچی ایکم، چنئی کے مالی تعاون سے شائع کیا گیا۔ تروکرل کے ہر شعر کو انھوں نے اردو میں قطعہ کی شکل میں ڈھالا ہے۔

ڈاکٹر امان اللہ ایم بی نے 'تروکرل' کا تمل زبان سے براہ راست اردو میں 'مخزن حیات' کے نام سے 2022 منظوم ترجمہ کیا ہے۔

یہ چاروں ترجمے اپنی نوعیت کے منفرد ترجمے ہیں۔ ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تصنیف کتنی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کی 80 زبانوں میں اس کے ترجمے کیے گئے ہیں۔

'تروکرل' قدیم زمانے کے ادب پاروں میں سے ایک بے مثال ادب پارہ ہے۔ مورخین کا خیال ہے کہ 'تروکرل' کا زمانہ دوسری صدی بعد مسیح کا ہے۔ کچھ محققین کا خیال ہے کہ اس کا تعلق پہلی صدی قبل مسیح سے ہے۔ بدقسمتی سے تروکرل کے مصنف کے متعلق تفصیلات بہت زیادہ معلوم نہ ہوسکیں۔ مصنف کا نام بھی بطور قیاس دیا گیا ہے۔ تروولو ران نایاب اور عظیم شخصیتوں میں سے ایک تھے جن کی روحانی ہمہ گیری مذاہب و ملل سے بلند تھی اور کسی بھی قسم کے تعصب میں ملوث نہیں تھی۔

تروولور کی تمام تر شاعری اخلاقی تعلیمات اور انسانی نفسیات کی بھرپور عکاسی کرتی ہے جس میں بھٹکے ہوئے انسانوں کو عملی جد و جہد کی تاکید کے ساتھ ساتھ برائیوں سے بچنے کی تنبیہ بھی کی گئی ہے۔ 'تروکرل' اگر چہ ایک مقدس ادب پارہ ہے لیکن یہ تصور حیات کا ایک مکمل ضابطہ بھی ہے۔ اسی لیے اس میں زندگی کے ہر مسئلے کو عملی سطح پر بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ 'تروکرل' تین حصوں ارم (اخلاقیات)، پورول (حکومت، معاشرہ، سماج)، انھم (یعنی محبت) پر مشتمل ہے۔ زمین اور آسمان کے درمیان کا کوئی ایسا موضوع نہیں ہے جو اس ادب پارے کا حصہ نہ بنا ہو۔

1330 کرلوں (ابیات) پر مشتمل اس تصنیف کو 133 عناوین میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر عنوان کے تحت دس دس اشعار لکھے گئے ہیں جن میں اچھائیوں کی تعریف، گھریلو زندگی، بیوی کا کردار، اولاد، محبت، مہمان نوازی و تواضع، احسان مندی، مساوات، خودی، اخلاق کی پاسداری، بدکاری، حسد اور شک، استغنا، غیبت، بیہودگی، برائی سے گریز، سخاوت، عظمت، رحم، دغا بازی، چوری سے پرہیز، راست بازی، غصہ سے احتراز، مردم آزاری، ادراک، اچھی صحبت، بری صحبت سے احتراز، رحم دلی وغیرہ شامل ہیں۔

اس شاہکار کا پہلا حصہ اڑتیس ابواب پر مشتمل ہے جس میں گھریلو اور مجرد زندگی میں انسان کے فرائض پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ دوسرا حصہ ستر ابواب پر مشتمل ہے جس میں حکومت کرنے کے مختلف طریقوں اور نوعیتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جس کو تحقیق اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس میں صرف شہزادوں اور ان کے مصاحبوں ہی سے خطاب نہیں کیا گیا ہے بلکہ ایسی ایسی فائدہ مند باتیں بتائی گئی ہیں جن سے عوام بھی مستفیض ہو سکتے ہیں۔

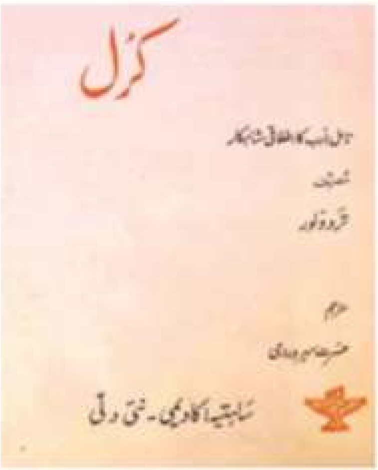

> **'تروکرل' قدیم زمانے کے ادب پاروں میں سے ایک بے مثال ادب پارہ ہے۔ مورخین کا خیال ہے کہ 'تروکرل' کا زمانہ دوسری صدی بعد مسیح کا ہے۔ کچھ محققین کا خیال ہے کہ اس کا تعلق پہلی صدی قبل مسیح سے ہے۔ بدقسمتی سے تروکرل کے مصنف کے متعلق تفصیلات بہت زیادہ معلوم نہ ہوسکیں۔ مصنف کا نام بھی بطور قیاس دیا گیا ہے۔ تروولور ان نایاب اور عظیم شخصیتوں میں سے ایک تھے جن کی روحانی ہمہ گیری مذاہب و ملل سے بلند تھی اور کسی بھی قسم کے تعصب میں ملوث نہیں تھی۔**

تمل قوم کے نزدیک تروولور تمل ادب کا وید ہے۔ جو مقام ہندوؤں کی مقدس کتاب 'وید' کو حاصل ہے وہی مقام تمل قوم میں 'تروکرل' کو بھی حاصل ہے۔ تمل بولنے والے تروکرل کو اپنا لسانی وقار سمجھتے ہیں کیونکہ اس میں نہ صرف اخلاقیات کا درس دیا گیا ہے بلکہ دنیا میں زندگی گزارنے کے آداب بھی سکھائے گئے ہیں۔

'تروکرل' میں علم کی اہمیت پر جو زور دیا گیا ہے اس کا اندازہ اس کرل سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

کرل 400 کا ترجمہ ملاحظہ کریں:

''علم کا نہ ہونا سب سے بڑا نقصان ہے۔ جو شخص علم سے عاری ہوتا ہے دنیا کبھی اس کی قدر نہیں کرتی۔ جاہل اپنے ہی ہاتھوں سے چند ایسی مصیبتوں کا شکار ہوجاتے ہیں جو وہ اپنے دشمنوں کو بھی نہیں پہنچا سکتے۔''

انسان کے پھول جیسے دل میں بسیرا کرنے والے خدا کے چرنوں سے چمٹنے والا ہی زندہ جاوید ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو نفرت اور خواہشات سے بلند تر خدا کے چرنوں میں بسیرا کرتے ہیں ہمیشہ دنیا کی مصیبتوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

تمل قوم کے نزدیک تروولور تمل ادب کا وید ہے۔ جو مقام ہندووں کی مقدس کتاب 'وید' کو حاصل ہے وہی مقام تمل قوم میں 'تروکرل' کو بھی حاصل ہے۔ تمل بولنے والے تروکرل کو اپنا لسانی وقار سمجھتے ہیں کیونکہ اس میں نہ صرف اخلاقیات کا درس دیا گیا ہے بلکہ دنیا میں زندگی گزارنے کے آداب بھی سکھائے گئے ہیں۔

'تروکرل' کے 'باب اخلاقیات' میں تروولور نے آج سے تقریباً دو ہزار سال پہلے ایسی نایاب باتیں بتائی ہیں جن پر عمل پیرا ہوکر انسان ایک کامیاب زندگی گزار سکتا ہے۔

'تروکرل' کا تیسرا باب محبت پر مشتمل ہے۔ محبت ہر شخص کا ذاتی تجربہ ہو یا نہ ہو مگر ہر ذہن میں محبت کا ایک دھندلا یا واضح تصور ضرور موجود ہوتا ہے۔ ولوور ایک ایسا فنکار ہے جس کے کلام میں عشق کا تصور مختلف صورتوں میں پوری فنکارانہ آب وتاب کے ساتھ موجود ہے۔

میرا زیر بحث موضوع چونکہ اخلاقیات ہے اس لیے میں اخلاقیات کے باب کے تحت اپنی بات کو آگے بڑھانا چاہوں گی۔ 'باب اخلاقیات' میں تروولور کہتے ہیں کہ اچھے اخلاق آدمی کو خیر کی جانب لے جاتے ہیں۔ راست بازی سے بڑھ کر کوئی بھی چیز تروولور کے نزدیک اچھی نہیں ہے۔ اچھے کام کرنے کے لیے ہمیشہ مستعد رہنے کی تاکید کرتے ہیں دل کی صفائی تمام نیکیوں کا حاصل ہے۔ علاوہ اس کے سب دکھاوا ہی دکھاوا ہے۔ حسد، حرص اور غصہ یہ ایسی مخرب اخلاق چیزیں ہیں جن پر قابو پا کر ہی انسان اچھائی حاصل کرسکتا ہے، تروولور کہتے ہیں:

کرل 131 - کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

اچھے کام کے لیے کسی خاص وقت کا انتظار نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ یہی نیک کام مرنے کے بعد آخرت کی دولت بن جاتے ہیں۔ جو شخص اچھے کام کرتا رہے گا آنے والے کل میں یہی عمل اس کے کام آئیں گے۔

اچھے اخلاق انسان کی بلندی کے ضامن ہوتے ہیں اس لیے اخلاق کی حفاظت لازمی ہے۔ ہمیشہ اپنے اخلاق پر نظر رکھنے کی تروولور نے تاکید کی ہے کیونکہ دنیا میں اس سے بڑھ کر انسان کا کوئی وصف ہو نہیں سکتا۔ اچھے اخلاق، اچھے خاندان کا پتہ دیتے ہیں اور برے اخلاق کو اختیار کرنے سے اچھے خاندان پر بھی آنچ آجاتی ہے۔ اچھے اخلاق سے خوشبوؤں کے چشمے ابلتے ہیں جبکہ بد اخلاقی ناختم ہونے والی مصیبتوں سے انسان کو دوچار کرتی ہے۔ اقبال مندی جو اخلاق کا پہلا زینہ ہے ہمیشہ اچھے انسانوں کا استقبال کرتی ہے۔

تروولور صبر کا دامن تھامے رکھنے کی تلقین یوں کرتے ہیں، ملاحظہ کیجیے۔

کرل 152 جس کا ترجمہ یوں ہے:

با اخلاق انسان کی زبان سے کسی بھی حالت میں برے الفاظ نہیں نکل سکتے، چاہے دنیا اس پر کتنا ہی ظلم ڈھائے۔ با اخلاق لوگ صبر کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے چاہے ان کے ساتھ بُرا برتاو کیوں نہ کیا جاتا ہو۔ تروولور اس ضمن میں صبر کے ساتھ درگزر کرنے کا مشورہ بھی دیتے ہیں۔

تروولور نے 'کرل' میں اخلاقیات کے درس میں جو پیغام دیا ہے اس کے چند اشعار نمونے کے طور پر پیش کر رہی ہوں، ملاحظہ کیجیے۔

کرل 108 کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے:

''کسی کے احسانات کو بھلا دینا اچھے اخلاق کا شیوہ نہیں ہے، لیکن ان کے نقصانات کو فوراً بھول جانا بڑی بات ہے جو کسی اور سے پہنچے ہوں۔''

تروولور برائی کے گریز کے عنوان کے تحت یہ اخلاقی درس دیتے ہیں کہ عقل مندوں کی نظر میں وہی شخص قابل ستائش ہے جو برائی کا جواب بھلائی سے دیتا ہے۔ ایک اور کرل میں وہ یہ درس اس طرح دیتے ہیں۔

کرل 217 کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے۔

''مصیبت اور برائی اس شخص کے قریب تک نہیں آتی جو راستی کا دامن تھام لیتا ہے۔''

تروولور کے اخلاقی درس کی ایک اور مثال دیکھیے۔

کرل 103 کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

''کسی پر احسان کی امید پر احسان کرنا احسان کا مذاق اڑانا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کیا یہ دنیا بادل کے احسان کا بدلا ادا کرسکتی ہے۔''

اسی طرح ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ جو شخص حاجت مندوں کی حاجت روائی کرتا ہے وہی سرخ رو ہوتا ہے اس دنیا میں بھی اور آنے والی دنیا میں بھی۔

ان کے علاوہ بھی تروکرل میں اخلاقیات پر مشتمل ایک ایسا خزانہ پوشیدہ ہے جس پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جاسکتی ہے۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ تروولور کی تصنیف میں کامیاب زندگی گذارنے کے ایسے اقوال موجود ہیں جن کی طرف محققین کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

تروکرل میں اخلاقیات پر مشتمل ایک ایسا خزانہ پوشیدہ ہے جس پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جاسکتی ہے۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ تروولور کی تصنیف میں کامیاب زندگی گذارنے کے ایسے اقوال موجود ہیں جن کی طرف محققین کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ماخذ ومصادر

- مدراس میں اردو: نصیر الدین ہاشمی۔ حیدرآباد دکن 1938
- دکن میں اردو: نصیر الدین ہاشمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 1985
- کرل: پروفیسر حسرت سہروردی، ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی، 1965
- تمل ناڈو میں اردو: علیم صبا نویدی۔ تمل ناڈو اردو پبلی کیشنز، مدراس 1998
- ہسٹری آف تمل لٹریچر: ڈاکٹر شری نیواسن تمل ورلی ایلم چنئی
- لفظ لفظ گہر: حضرت مختار بدری، تمل ورلی ایلم، چنئی
- مخزن حیات: ڈاکٹر امان اللہ ایم۔ بی۔ شعبہ اردو مدراس یونیورسٹی، چنئی 2022
- تاریخ ادب اردو تمل ناڈو: علیم صبا نویدی، تمل ناڈو اردو پبلی کیشنز، چنئی 2017

■

Ayesha Siddiqua J
Asst Prof. Dept of Urdu
TAW College for Women
Solur-635814
Ambur (Tamilnadu)
Mob.:9994468456
ayeshadoulath555@gmail.com

اعزاز افضل

دبستانِ بنگال کا منفرد شاعر

شہاب ظفر اعظمی

اعزاز افضل قادرالکلام شاعر تھے۔انھوں نے کئی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ غزلیں، نظمیں، قطعات، مراثی، زخم صدا،ان پڑھ آندھی،قلم برداشتہ اور بہہ رہی ہے فرات آنکھوں سے، کے نام سے منظرعام پر آچکے ہیں۔ ان کی مدت حیات،شاعری اور شہرت کو دیکھتے ہوئے یہ سرمایہ بہت مختصر لگتا ہے۔ایسا لگتا ہے انھوں نے کمیت کے بجائے کیفیت پر توجہ دی ہے اور اردو کو مختصر مگر غیر معمولی شعری سرمایہ عطا کیا۔اسی لیے ان کی شاعری کا کوئی ایسا حصہ بمشکل ملے گا جسے غیر ضروری یا بھرتی کا قرار دیا جائے۔میری نگاہ میں اعزاز افضل بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ان کی غزلوں پر کلاسیکی اسلوب کا گہرا اثر ہے۔ان کی غزلوں میں لطیف جذبات، وجدانی احساسات، انسانی نفسیات اور زندگی کی گہری حقیقتوں کا ادراک وانعکاس ملتا ہے۔

اچھی اور معیاری شاعری کی تین خوبیاں ہوتی ہیں۔اول یہ کہ اسے پڑھتے ہی طبیعت میں انشراح و انبساط پیدا ہوتا ہے۔دوسری یہ کہ قاری یا سامع کے احساسات خفتہ میں بیداری آتی ہے اور تیسری یہ کہ وہ ذہنی سطح پر فکری ارتعاش کا سبب بن جاتی ہے۔زخم صدا اور ان پڑھ آندھی کی شاعری یہ یقین دلانے میں کامیاب نظر آتی ہے کہ اس کا شاعر فکری جہان اور شاعری میں احساس جمال کے رول سے نہ صرف بہت اچھی طرح واقف ہے بلکہ ان کے استعمال پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ دبستان وحشت سے تعلق، رنگ لکھنوی و پرویز شاہدی کی شاگردی کے باوجود اعزاز افضل نے اپنے لیے ایک الگ راہ نکالی ہے جو کلاسیکی اقدار کی پاسداری کے ساتھ ساتھ عصری حسیت اور نئی آگہی کے تقاضے بھی پورا کرتی ہے اور یہ راہ ان کی شاعری میں ابتدائی زمانے سے ہی ملنے لگتی ہے۔چنانچہ محض 16-15 سال کی عمر میں لکھی ہوئی ان کی غزل کے اشعار میں نہ صرف ان کا اعتماد،تیور اور منفرد رنگ دکھائی دینے لگتا ہے بلکہ تخیل اور لفظوں کے حسن استعمال کا وہ سلیقہ بھی ملتا ہے جو آنے والے دنوں میں ایک منفرد شاعر کی بشارت دیتا ہے۔آپ بھی چند شعر دیکھیں۔

نہ چھیڑو اس قدر مجھ کو کہ کھل جائے زباں میری
گزرتی جارہی ہیں حد سے اب خاموشیاں میری
بسے گا پھر سے گلشن میں مرا اجڑا ہوا مسکن
نہ جائے گی نہ جائے گی یہ کوشش رائیگاں میری
نہیں ممکن کہ مل جائے کسی سے میرا شعر افضل
انوکھا ہے بیاں میرا، نرالی ہے زباں میری

اور واقعی آنے والے دنوں میں ان کی شاعری نے اپنے لہجے،موضوعات اور اسلوب کی انفرادیت سے ایسا سماں باندھا کہ نہ صرف علامہ جمیل مظہری،ل احمد اکبر آبادی اور محمد حسن جیسے اکابرین نے انھیں سراہا بلکہ معاصرین میں سالک لکھنوی، علقمہ شبلی، قیصر شمیم، رونق نعیم اور مظہر امام نے بھی ان کی انفرادیت کا اعتراف کیا۔حرف صدا اور ان پڑھ آندھی کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ ایک زندہ اور متحرک شاعر ان کا خالق ہے۔اس نے ہمیشہ ادب کے صحت مند رویوں کو لبیک کہا ہے۔اس نے ترقی پسندی کو بھی بنظر استحسان دیکھا اور جدیدیت کے تازہ کار جھونکوں کو بھی خوش آمدید کہا۔اس نے ہمیشہ مثبت ادبی نظریات کے لیے اپنے دامن کو کشادہ رکھا اور یہ یقین کیا کہ غزل میں زندگی کی دمک اور دھمک دونوں پیش کی جاسکتی ہے۔ اعزاز افضل نے غزل میں جو کچھ لکھا ہے جذبے کی صداقت کے ساتھ لکھا ہے۔ان کے احساسات کسی عالم تخیل کی چیز نہیں ہیں بلکہ ان کے آس پاس زندگی کی سطح پر کھیلنے والی لہریں ہیں۔وہ کہتے ہیں۔

مجھ سے پنہاں نہیں شہروں کی حقیقت افضل
لوگ ویرانوں میں رہتے ہیں درو بام کے ساتھ
اللہ راس لائے تمھیں یہ سبک روی
ہم بھی بہت تھے تیز خرام اے مسافرو
مجھے قبلہ رخ بٹھا کر مرے ہاتھ اٹھانے والو
یہ یقین بھی دلادو کہ دعا قبول ہوگی
صداقتوں کی رہ گزر طویل ہے نہ مختصر
یہ قرب وبعد اپنے اپنے حوصلے کا کام ہے
عقل ہر راہ کو گل پوش کیے دیتی ہے
چاہتی ہے کہ کوئی نقش کف پا نہ بنے
طوفاں کو یورشوں سے بچاتے رہے چراغ
دامن کی سازشوں پہ کسی کی نظر نہ تھی

اعزاز افضل کے ان اشعار کو یا ان کے فن کو سمجھنے کے لیے چند باتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔اعزاز افضل ترقی پسند تحریک کے ساتھ 1936 میں پیدا ہوئے،ترقی پسندی ان کے دل ودماغ میں ساتھ ساتھ پلتی بڑھتی رہی، انھوں نے مشینی شہر کو ظاہری رنگ وآہنگ کے ساتھ اقداری اور فکری طور پر بھی بدلتے ہوئے دیکھا۔ عملاً اور پرجوش اشتراکی احباب کی دوہری انقلاب پسندی دیکھی۔ذاتی زندگی میں انھیں اپنی اہلیہ سے بے پناہ محبت تھی۔ یہ محبت عشق کے حدود کو چھو رہی تھی کہ 1960 میں ان کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔انھوں نے یہ غم بڑے صبرو ضبط کے ساتھ برداشت کیا۔ انھوں نے زندگی سے جو امیدیں وابستہ کی تھیں وہ شاید پوری طرح بر نہ آسکیں۔ وہ اصول پرست، راست باز اور

تصورات پر مر مٹنے والے شاعر ہیں اور دنیا کو اسی نگاہ سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر افسوس دنیا شاعر کی نگاہ سے نہیں چلتی اس لیے شاعر کو حقیقت سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ وہ جھوٹ، بے ایمانی، ریاکاری، اخلاقی جرم اور داخلی کرب کو اپنے شعروں کے پردے میں چھپانا چاہتا ہے۔ وہ اپنے لہو سے کلام میں رنگ بھرتا ہے اور زمانے بھر کی تلخیاں اپنے دل و دماغ میں اتار کر اور اپنے آپ کو جلا کر آبادیوں کو روشن کرتا ہے۔ احساس اور جذبے کی اس اندوہناک کیفیت کے بطن سے شاعری کی روشنی پھوٹتی ہے جو معانی کے طلسمی خزانے بے نقاب کرتی ہے۔ اعزاز افضل کی شاعری معانی کے ایسے ہی خزانوں سے مالا مال ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

بڑا احسان ہے دار و رسن کا
میں اونچا ہو گیا ہوں اپنے سر سے
مانا منزل دور تھی، رستے میں پیچ و خم بھی تھے
تم اکیلے تو نہیں تھے ساتھ آخر ہم بھی تھے
شام بلا کا سلسلہ اور طویل ہو تو ہو
جاگے ہوؤں کو رات صبح نے کیوں جگا دیا

علامہ شبلی نعمانی نے شعر کو 'مواد اور صورت' کا مجموعہ بتایا ہے۔ یعنی شعر میں بس دو چیزیں ہوتی ہیں مواد یعنی موضوع اور صورت یعنی طرز ادا۔ موضوعات میں جدت اور اچھوتے پن کی تلاش مشکل ہوتی ہے کہ شاید ہی کوئی فکر، موضوع یا خیال ایسا ہو جو بیان نہ کیا گیا ہو۔ فکر کی جدت کا راز طرز ادا یا اسلوب بیان کی جدت میں مضمر ہے۔ چنانچہ ہر بڑے شاعر نے اسلوب کی جدت سے فکر میں نیا پن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالب نے جب کہا تھا کہ۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

تو اس کا اشارہ اسی جانب تھا کہ شاعر اپنے ہر شعر میں جہان معنی پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اعزاز افضل نے اپنی غزلوں میں الفاظ کے انتخاب و استعمال میں جو احتیاط برتی ہے وہ اسی طلسم خانۂ معنوی سے مربوط ہے۔ انھوں نے اپنی ہر غزل میں لفظوں کی حرمت کا خیال رکھا ہے۔ انھوں نے نہ صرف الفاظ کی اہمیت کو سمجھا ہے بلکہ ان کی جذباتی، احساساتی سطح تک رسائی حاصل کی ہے۔ انھوں نے الفاظ کو نہ صرف گنجینۂ معنی کا طلسم بنایا ہے بلکہ ان کے اندرون میں جھانک کر اس میں جہان معنی پیدا کیے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ الفاظ کا سپاٹ استعمال معنی کی دنیا کو محدود کر دیتا ہے اور غزل کا شعر محض سادہ بیان یعنی Flat Statement نہیں ہوتا۔ غزل کے شعر کی خوبی اس کی تہہ داری ہے جو الفاظ کے ایمائی، اشاراتی اور رمزیہ استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ اب درج ذیل اشعار دیکھیے کہ اعزاز افضل نے اس میں جدت اسلوب سے معنی کے کیسے کیسے جہان پیدا کیے ہیں۔

دیکھا تو ہر جبیں پہ لکھا تھا خوش آمدید
آواز دی تو بند ہر اک دل کا در ملا
غربت میں جو کھلا ہوا زنداں کا در ملا
بے خانماں یہ سمجھے کہ رہنے کو گھر ملا
دیکھنے والے کا انداز نظر تو دیکھو
اپنا چہرہ مرے چہرے پہ سجا دیتا ہے

ان اشعار میں موضوعات نئے نہیں ہیں مگر شاعر کا طرز اظہار نیا ہے۔ اس لیے شعروں میں ایک طرح کی جدت نظر آتی ہے اور قارئین کو یہ اشعار اپنی طرف ملتفت کر لیتے ہیں۔ افضل ان شاعروں میں ہیں جو جانتے ہیں کہ الفاظ بجائے خود کچھ نہیں ہوتے، ان میں جان ڈالنا، انھیں زندگی کا لباس پہنانا اور ان میں تہہ داری پیدا کرنا فنکار کا کام ہے۔ افضل نے ان الفاظ کے بطن میں جھانک کر ان کی حقیقت اور مزاج سے شناسائی حاصل کی ہے۔ ان کے بدلتے معانی اور کیف و کم پر غور کیا ہے اور تب زندگی کی سفاک حقیقتوں کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر شعری اظہار کی زبان دی ہے۔ اسی لیے ان کے الفاظ محض الفاظ نہیں رہ جاتے وہ نبض زیست کی دھڑکن بن جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں زندگی کے کرب و بلا، انتشار و اختلال، جبر و حوادث اور ستم کی جو زندہ تصویریں ملتی ہیں وہ ان کی لفظ شناسی کی ہی دین ہیں۔

یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ اعزاز افضل نے نئی طرز اور نئے اسلوب و اظہار کی دھن میں کبھی اشعار کو مغلق اور مشکل لفظیات سے گراں بار نہیں ہونے دیا۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کا دور دیکھ کر کچھ لوگ یہ خیال کر سکتے ہیں کہ ترقی پسند تھے اس لیے ان کی شاعری میں نعرہ، پروپیگنڈا ضرور ہوگا، یا جدیدیت سے متاثر ہوئے تو اشعار کو چیستاں بنا دیتے ہوں گے۔ ایسا بالکل نہیں ہے۔ اعزاز افضل نے شاعری کے لیے نہ تو خطابی اور سادہ بیانیہ زبان استعمال کی ہے جس پر شعر برائے شعر کا گمان ہو اور نہ ایسی علامتی و چیستانی زبان استعمال کی ہے کہ معنی کی تہہ داری اور خیال کی پیچیدگی شعر کی ترسیلی قوت میں رکاوٹ بن جائے۔ افضل صاحب اپنے سادہ اور سلیس اشعار میں بھی فصاحت کا وہ کمال پیش کرتے ہیں جس سے شعر کو شعر منثور کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ مثال کے لیے یہ اشعار دیکھیے۔

نیند میں بھی چادر کا اتنا پاس ہے تم کو
کچھ تو پاؤں پھیلاؤ، اس طرح نہیں سوتے
کیسی رات آئی ہے نیند اڑ گئی سب کی
منزلیں تھکتی ہیں قافلے نہیں سوتے
اگر زحمت نہ ہو تو اک ذرا نیچے اتر آؤ
بلندی سے قد و قامت کا اندازہ نہیں ہوتا

ابن رشیق نے کتاب العمدہ میں لکھا ہے کہ اچھا شعر وہ ہے جسے سن کر یہ محسوس ہو کہ ایسا ہم بھی کہہ سکتے ہیں مگر جب کہنا چاہیں تو عاجز رہ جائیں اور شبلی نے انیس کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے فصاحت کا درجۂ کمال یہ بتایا ہے کہ مصرعہ یا شعر کی صرفی ترتیب قائم رہے یعنی اس کی نثر نہ کی جا سکے۔ اب اعزاز افضل کے مذکورہ اشعار دیکھیے۔ شاعر کی شائستہ بیانی اور سلاست نہ صرف ان میں سہل ممتنع کی خصوصیات پیدا کر رہی ہے بلکہ انھیں شعر منثور کی صفات سے بھی مزین کر رہی ہے۔

اعزاز افضل کے مذکورہ اشعار سے یہ غلط فہمی بھی نہیں ہونی چاہیے کہ انھوں نے غزل میں رمزیت، ایمائیت اور تہہ داری پیدا کرنے کے لیے پیکر تراشی، محاکات، صنائع اور تشبیہات و استعارات سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے ان سب کا استعمال غزل میں تغزل، تہداری اور معنویت پیدا کرنے کے لیے کیا ہے مگر اس سلیقے سے کہ شعریت اور فنکاری مجروح نہ ہو۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیے۔

جب کسی دل میں نہ پائے بام و در
شہر کو دشتِ بلا کہنا پڑا
روز ساحل کی جگہ منجدھار رکھ جاتا ہے کون
ایک دریا ہر ندی کے پار رکھ جاتا ہے کون
زندانیوں کے شور سلاسل کو کیا ہوا
خاموش کیوں ہو اے در و دیوار کچھ کہو
جنوں کی آبلہ پائی کا حاصل لکھ دیا جائے
کسی زنداں کی پیشانی پہ منزل لکھ دیا جائے
اہل جنوں کا رقص مسلسل کب رکتا ہے روکے سے

زندانوں میں شور سلاسل کل بھی تھا اور آج بھی ہے

کل تک جو بادہ خوار تھے ہیں آج محتسب
اڑتی ہے خاک مئے کدۂ روزگار میں

ان اشعار میں ساغر، مقتل، جنوں، ستم، لہو کی دھار، منجھدار، خاک، دریا، بادہ خوار، مے کدہ وغیرہ جیسے استعارے اور ایوان تصور، دشت بلا، یاران قدح، جامہ دری، خارزار جنوں، شور سلاسل، جنوں کی آبلہ پائی، رقص مسلسل اور دور شیشہ شکنی جیسی تراکیب حسن استعمال کے اعتبار سے نہ صرف نئی ہیں بلکہ احساسات وجذبات کی تجسیم کرنے میں معاون بھی ثابت ہوتی ہیں۔ غیر مرئی اشیا کی تجسیم کرنا اور پھر ان میں تحرک پیدا کرنا خاصا جانکاہ عمل ہے۔ اس کے لیے استادی اور خلاقی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اعزاز افضل نے اپنے معاصرین میں سب سے الگ راہ نکالی ہے اور اپنا نیا شناخت نامہ تیار کیا ہے تو اس کی وجہ لسانی تازگی لیے ان کا اپنا اسلوب ہے جو ان کی لفظیات اور زبان کے خلاقانہ استعمال سے پیدا ہوا ہے۔ ان کے یہاں لسانی تشکیلات کا گہرا شعور ملتا ہے مگر اس شعور کا تعلق زبان کی توڑ پھوڑ سے نہیں ہے بلکہ زبان کے اُس جدلیاتی نظام سے ہے جو فن پارے کو وسیع اور ہمہ گیر بناتا ہے۔

اعزاز افضل نے اپنی شاعری میں الفاظ، اصطلاحات اور تراکیب کو مہارت سے جدید پیکر عطا کر کے غزل کی مروجہ فضا کو کسی حد تک تبدیل کرنے کی سعی کی ہے۔ یہی خوبی ان کی غزلوں میں یکرنگی اور سپاٹ پن کے بجائے بوقلمونیت اور تنوع پیدا کر دیتی ہے۔

اعزاز افضل کی شاعری جہاں اسلوب اور لہجے کی سطح پر اپنی انفرادیت کا احساس دلاتی ہے وہیں موضوعاتی اور فکری سطح پر بھی اپنی تازگی اور توانائی کا احساس دلاتی ہے۔ ان کی شاعری میں جدید دور کے انسان کی مجروح اور پیچیدہ سائیکی کا گہرا اثر ہے۔ تنہائی، عدم تحفظ، زندگی کی بے معنویت، خوف کی نفسیات، مشینی زندگی کی جبریت، عہدنو کی اضطرابی کیفیت، بنیادی ضرورتوں کا جبر اور تہذیبی شکست وریخت آزادی کے بعد عہدنو کے ایسے محرکات تھے جو ہر باشعور آدمی کے دل ودماغ کو الجھن میں ڈال رہے تھے۔ اعزاز افضل جیسے فنکاروں نے ان باتوں کا کچھ زیادہ ہی اثر قبول کیا اس لیے ان کی شاعری میں اس قسم کے محسوسات کا اظہار ملتا ہے اور بعض جگہ بڑی شد ومد کے ساتھ ملتا ہے۔ مگر ان کی فکر قنوطی نہیں ہے اس لیے ان کی شاعری منفی رویوں کی شاعری ہرگز نہیں۔ بلکہ یاس اور قنوطیت کے دھندلکے میں بھی امید کی چاندنی چٹکاتی ہے اور زندگی کی بے معنویت کو تازہ معنویت عطا کرتی ہے۔

زنداں میں سر کو دعوت زانو نہ دیجیے
دیوار ہی میں بنتا ہے در، یہ نہ بھولیے

اے خیرہ سری نادم ہیں بہت آشفتہ بیانی پر اپنی
سورج کی ان الجھی کرنوں کو ہم گیسوئے جاناں کہتے ہیں

یعنی اگر چہ حالات مایوس کن ہیں، مسائل پیچیدہ اور عہد الجھا ہوا ہے لیکن اسے اسی طرح سلجھایا جاسکتا ہے جیسے گیسوئے جاناں۔ انسان چاہے تو زنداں کی دیوار میں بھی اپنے سر کی ٹکر سے دروازہ بنا سکتا ہے۔ انسان کی ہمت اور حوصلہ وہ طاقت ہے جو ہر مسئلے کو چٹکیوں میں حل کرسکتی ہے۔ دراصل اعزاز افضل کو انسان اور اس کی طاقت پر مکمل اعتماد ہے۔ وہ ارتقائے آدم اور عظمت انسان کے قائل ہیں۔ وہ پستیِ آدم کو بھی رفعت انسان کہتے ہیں۔

ہوتے ہیں ہزاروں خلد بریں ہر دانۂ گندم سے پیدا
اس شان زوال آدم کو ہم رفعتِ انساں کہتے ہیں

انسان کی سرشت میں ہے وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہا ہے۔ انسان کا یہی جذبۂ ارتقا ہے جو اسے منزل بہ منزل آگے بڑھاتا رہا ہے۔ تبھی تو اقبال نے کہا تھا کہ۔

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہہ کامل نہ بن جائے

اعزاز افضل جب انسان کا یہ جذبۂ ارتقا دیکھتے ہیں تو ان کی جبین عقیدت سلام کرتی ہے۔ دیکھیے۔

مری ارتقا کی منزل نہیں مہر وماہ افضل
ہے بلند کہکشاں سے مری شاخ آشیانہ

ایک کشت گندم میں کتنے خلد اگتے ہیں
آدمی کی پستی بھی کیا بلند پستی ہے

پا تو لیں ذرا قابو، گردشِ زمیں پر ہم
اے فلک دکھائیں گے تجھ کو آسماں اپنا

خواب فروغ داغ دل دیکھ رہا تھا کل بشر
آج زمیں کے پاؤں پر چاند نے سر جھکا دیا

احترام آدمیت کا یہ تصور کم از کم یہ ضرور ثابت کرتا ہے کہ اعزاز افضل ایک بیدار اور دردمند شاعر ہیں۔ وہ ایک خاص فلسفۂ حیات رکھتے ہیں جو کہیں سے مستعار نہیں بلکہ ان کے ذاتی فکر وتدبر اور دردمند دل کا نتیجہ ہے اور جس کی اساس عظمت آدم اور مثبت انداز فکر پر ہے۔

لیکن کمال فن یہ ہے کہ اپنے ان خیالات وافکار کا اظہار کرتے وقت وہ رعنائی خیال، لطافت، شعریت اور تخلیقیت کا دامن ہاتھوں سے نہیں جانے دیتے۔ فلسفیانہ خشکی اور سپاٹ پن کا ان کے یہاں گزر نہیں۔ انھوں نے اپنے افکار اور اسلوب میں ایک خوبصورت ہم آہنگی برقرار رکھی ہے جو ان کے شعروں کو نہ صرف غنائیت اور موسیقیت عطا کرتی ہے بلکہ سطحیت اور سپاٹ پن سے بھی دور رکھتی ہے۔

اعزاز افضل پر لکھنے والے اکثر ناقدین نے ان کی شاعری میں عشق کے موضوع سے انکار کیا ہے۔ مگر میرا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کی شاعری میں عشقیہ موضوعات کم ہی سہی مگر ملتے ضرور ہیں۔ ظاہر ہے 'عشق' غزل کا اولین موضوع ہے، اس کے بغیر کوئی شاعر اپنی شاعری کی تکمیل کیسے کر سکتا ہے۔ بقول غالب۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

عشق ومحبت، ہجر ووصال اردو غزل کی وہ روشن اور بے مثال علامات ہیں جن سے روایتی شاعری کا کوئی باب خالی نہیں ہے۔ غزل میں ایسے جذبات واحساسات کو لفظوں اور علامتوں کے پیکر میں کامیابی کے ساتھ ڈھالنا کوئی آسان کام نہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ترجیحی طور پر نہ سہی مگر اعزاز افضل نے یہ کام بخوبی انجام دیا ہے۔ ان کے عشقیہ اشعار فرسودہ رومانی مفروضے سے یکسر الگ عشق کے عصری اور روحانی تجربوں سے ماخوذ ہیں۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیں۔

جس قدر میں نے مٹائے تری یادوں کے نقوش
دل بے تاب نے اتنا ہی تجھے یاد کیا

آج اک عمر پہ یوں دل نے تجھے یاد کیا
دفعتاً نیند سے جیسے کوئی پیاسا جاگے

آج دل ہے کہ سر شام بجھا لگتا ہے
یہ اندھیرے کا مسافر بھی تھکا لگتا ہے

وہ کیا کریں گے جن کو نہیں اعتبار حسن
ہم تو گزار لیں گے ترے انتظار میں

ہجر، یادیں، انتظار، اعتبار اور دل بے تاب جیسے عشق کے تلازمات کو اعزاز افضل نے جس حسن وخوبی کے ساتھ برتا ہے وہ کلاسیکی دروبست کا احساس دلاتا ہے۔

عشق زندگی کا مرکز و محور ہے، اس کا احساس کسی شاعر کے یہاں نہ ہو ایسا کیسے ممکن ہے؟ اعزاز افضل کے یہاں بھی یہ جذبہ ہے مگر انھوں نے اپنے جمالیاتی احساس کے ذریعے اس جذبے کی حدود کو وسیع کرتے ہوئے اس میں وسعت و بالیدگی پیدا کی ہے اور عرفان نفس سے کام لے کر ذاتی جذبے کو آفاقی و ہمہ گیر جذبہ بنا دیا ہے۔ لہٰذا ان کی شاعری میں نہ سطحی اور عمومی باتوں کا اظہار ہوا ہے اور نہ معشوق کے لب و رخسار، بوس و کنار اور اس کی برائیوں کا بیان ہوا ہے۔ ان کے یہاں معشوق ایک طاقت، امنگ اور امید بن کر نمودار ہوتا ہے جو عاشق کو مضبوط اور حوصلہ مند بناتا ہے تاکہ وہ غم دوراں کو بہ آسانی اٹھا سکے۔ اسی لیے تو وہ کہتے ہیں۔

یوں تو رہنے کو پریشانی خاطر ہی رہی
تیری زلفوں کو مگر میں نے بکھرنے نہ دیا
زندگی موت سے بدتر تھی پرائے وعدۂ دوست
لذت کشمکش شوق نے مرنے نہ دیا

مگر یہ بھی سچ ہے کہ ان کی شاعری میں عشق کے انسلاکات ثانوی درجہ رکھتے ہیں۔

اعزاز افضل عشق، عظمت آدم اور انسان سے وابستہ موضوعات کے علاوہ جن مضامین کو شعری پیکر میں ڈھالتے ہیں وہ ہیں قدروں کا زوال، مادی مہارت، زمانے کی بے چہرگی، مکر و فریب، سیاست کا سرد و گرم اور قول و فعل کا تضاد وغیرہ۔ وہ فکری اعتبار سے ترقی پسند تھے اور ایک بہتر، پر امن، خوشگوار معاشرے کا خواب دیکھتے تھے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ زندگی اور معاشرہ عام انسان کے ساتھ اچھا سلوک کم ہی کرتا ہے۔ عام اور وضع دار انسان کی پوری زندگی آزمائشوں میں گزرتی ہے۔ زندگی کے ایسے ہی تلخ تجربات نے افضل کی شاعری میں ایک قسم کا طنزیہ لب و لہجہ پیدا کر دیا ہے۔ لفظوں کے فنکارانہ استعمال سے انھوں نے ذہن و دل میں چھپی آگ کو نشتر کی طرح قاری کے ذہن و دل تک پہنچانے میں کامیابی حاصل کی۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیں۔

یہ آپڑے ہیں کہاں تجربوں کی دھوپ میں ہم
اب اعتبار کسی چھاؤں پر نہیں ہوتا
طوفاں کی یورشوں سے بچاتے رہے چراغ
دامن کی سازشوں پہ کسی کی نظر نہ تھی

اے زندگی بتا تجھے ٹھہرائیں کہاں ہم
تو آگہی ہے خانہ خرابوں کے شہر میں
وہ لوگ میری طرز سفر جانچ رہے ہیں
منزل کی طرف جن کو ہمکنا بھی نہیں آتا

ان اشعار میں طنز کی کاٹ کہیں ہلکی اور کہیں تیکھی بہت تیکھی ہے، جو آہستہ آہستہ احتجاج میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مگر خوبی یہ ہے کہ طنزیہ و احتجاجی آہنگ کے باوجود شاعر نے کہیں بھی لطافت بیان کو مجروح ہونے نہیں دیا ہے۔

طنز کا انسان کی انا سے گہرا رشتہ ہے۔ انسان کی انانیت اسے کسی کے آگے سرنگوں نہیں ہونے دیتی تو اس کے جذبات طنزیہ شکل میں سامنے آتے ہیں۔ اگر اعزاز افضل کی شاعری میں طنزیہ لب و لہجہ اپنے ہم عصر شعرا سے ہٹ کر ملتا ہے تو اس کی وجہ ان کی انفرادیت ہے جو پھیل کر انانیت تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر افضل کی انا بیراگی نہیں ہے وہ خاص واردات اور خاص تجربات کی انا ہے۔ اس انا کے اجمال میں باشعور، حساس اور صورت حال سے غیر مطمئن سماج کی تفصیل پوشیدہ ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیں۔

خرد بھی اک مقام ہے، جنوں بھی اک مقام ہے
جہاں سفر کی شام ہو وہیں مرا قیام ہے
ہم سے شوریدہ سری میں بھی نہ چھوٹا بانکپن
کج کلاہان خرد سے کج کلاہانہ ملے
وقت کی دھوپ ہمیں جذب نہ کر پائے گی
ہم وہ قطرے ہیں جو سورج کو نگل جائیں گے
چلو فلک سے ذرا رفعتِ زمیں دیکھیں
زمیں پہ رہ کے بہت اوج آسماں دیکھا

ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اعزاز افضل کی شاعری بظاہر بہت سلیس اور سیدھی سادی ہے مگر بین السطور بہت گمبھیر اور تفکیری ہے۔ بقول افضل۔

فکر پروردۂ آغوش زمیں ہے لیکن
میرے الفاظ میں ڈھل جائے تو الہام لگے

اعزاز افضل کے شعری سرمائے میں نظمیں، قطعات اور مراثی بھی ہیں، جہاں ان کی فنکاری کی مزید جہتیں روشن ہوتی ہیں۔ مگر میری گفتگو ان کی غزلیہ شاعری تک محدود ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری کا مطالعہ مجھے یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ اعزاز افضل کا شعری اظہار پختہ اور رچا ہوا ہے۔ کلاسیکیت، ترقی پسندی اور جدیدیت کے امتزاج سے انھوں نے اعلیٰ درجے کی فنکاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کے لہجے اور افکار میں صلابت اور پختگی ہے۔ وہ اپنی شاعری میں راست اور عریاں اظہار سے گریز کرتے ہیں مگر ابہام اور رمز کی وہ صورت بھی نہیں جو شعر کو چیستاں بنا ڈالے۔ اسلوب پرکشش اور اظہار جاذب ہو تو شعر خود بخود فن کا اعلیٰ نمونہ بن جاتا ہے۔ اسی لیے تو علامہ جمیل مظہری نے ان کی ابتدائی شاعری کو ہی دیکھ کر کہہ دیا تھا کہ ''ان کے اشعار میں جو رعنائی گہرائی اور گیرائی ہے وہ ان کی انفرادیت کی ضامن ہے'' اور ممتاز نقاد محمد حسن نے انھیں 'اردو شاعری کی تیسری آواز' قرار دیا تھا۔ خود اعزاز افضل کو اپنی شاعری کی انفرادیت کا یقین تھا اسی لیے جب انھوں نے کہا تھا کہ ''شاعری جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو ساحری بن جاتی ہے'' تو یقیناً ان کی نگاہ میں اپنی شاعری بھی تھی جس نے ساحری کی منزل تک رسائی حاصل کر لی تھی۔

وحشت کی وراثت، پرویز شاہدی کی شاگردی اور سالک لکھنوی، علقمہ شبلی، قیصر شمیم اور رونق نعیم جیسے منفرد رنگ و آہنگ والے شعرا کی موجودگی میں اپنے لیے ایک الگ راہ نکالنا اور دبستان بنگال کی تاریخ میں اپنی واضح شناخت قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں، مگر افضل کی شاعری نے یہ کام کر دکھایا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تاریخ و تنقید کے کوتاہ بیں مورخین و ناقدین کی نگاہیں ان کی تابناکی تک رسائی حاصل نہیں کر پاتیں۔ مگر اب وقت بدل رہا ہے، حاشیے پر لکھنے والے ناقدین و محققین بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ وقت ضرور آئے گا جب ایک دبستان تک محدود کر دیے گئے اعزاز افضل جیسے معتبر، منفرد اور ممتاز شعرا بھی شعر و ادب کی نمائندگی کریں گے اور مرکزی تاریخ میں اپنا نمایاں مقام حاصل کریں گے۔ وہ وقت آئے گا اور ضرور آئے گا۔ اعزاز افضل نے یوں ہی نہیں کہا تھا کہ۔

خاک ہی سہی لیکن ہے تو یہ جہاں اپنا
دیجیے زمیں ہم کو، رکھیے آسماں اپنا
پا تو لیں ذرا قابو گردش زمیں پر ہم
اے فلک دکھائیں گے تجھ کو آسماں اپنا

■

Shahab Zafar Azmi
Dept of Urdu
Patna University
Patna- 800005 (Bihar)
Mob.:8863968168
shahabzafar.azmi@gmail.com

محمد آدم

ڈپٹی نذیر احمد

آثار و افکار

مولانا کا نام نذیر احمد تھا۔ ان کی ولادت 1830 میں ضلع بجنور کی تحصیل نگینہ کے ایک گاؤں ریہڑ پرگنہ افضل گڑھ نانہال میں ہوئی۔ ان کی تاریخ پیدائش کے متعلق محققین میں اختلاف رہا ہے لیکن 1830 ہی راجح ہے۔ نذیر احمد کے نانا قاضی غلام علی شاہ کے انتقال کے بعد خاندانی جھگڑے کی وجہ سے ان کی والدہ اپنے سسرال بجنور منتقل ہو گئیں۔ اس وقت نذیر احمد کی عمر محض 4 برس تھی۔ نذیر احمد کا تعلق بڑے علمی جاہ وحشمت والے گھرانے سے تھا، آپ کا رشتہ شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے خلیفہ، معروف بزرگ شاہ عبد الغفور اعظم پوری کے خاندان سے تھا۔ آپ کے والد مولوی سعادت علی معلم اور باوضع بزرگ تھے انھوں نے اپنے سسرال میں ہی سکونت اختیار کر لی تھی۔ آپ کے اجداد ایک زمانے تک مسندِ قضا پر فائز رہے لیکن حالات کچھ ایسے ہوئے کہ مالی طور سے کمزور ہو گئے۔

مولوی نذیر احمد کی خدمات ادبی، دینی اور ایڈمنسٹریٹو (آفیسر) تینوں میدانوں میں ہے، لیکن ادبی دنیا میں انھیں جو شہرت دوام حاصل ہوئی وہ کسی اور میدان میں نہیں مل سکی، اگرچہ انھیں عالم، مقرر اور مترجم کی حیثیت سے بھی بڑے احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اردو ادب میں مولانا کی عظمت کئی پہلوؤں سے تسلیم کی جاتی ہے۔ اردو میں ناول نگاری کی بنیاد ڈالی، سب سے پہلے خواتین کے لیے ادب کی تشکیل کی، عورتوں کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دی اس طرح انھوں نے تانیثیت کا منشور بھی مرتب کیا اور انڈین پینل کوڈ کا ترجمہ 'تعزیرات ہند' کے نام سے کیا جو سرکاری حلقوں میں بہت مقبول ہوا، اس کے علاوہ قانونِ انکم ٹیکس اور قانونِ شہادت کا بھی ترجمہ کیا، قرآن مجید کا بامحاورہ اور سلیس زبان میں اردو ترجمہ کیا، جو بہت مقبول ہوا، جس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے اور آج بھی ہو رہے ہیں۔ ان کی ایک کتاب 'مطالب القرآن' اس میں اسلامی عقائد کی تشریح کی گئی ہے، ان کی کتاب الحقوق و الفرائض 3 جلدوں پر مشتمل ہے جلد اول میں حقوق اللہ، جلد دوم میں حقوق العباد اور تیسری جلد میں آداب و اخلاقیات سے بحث کی گئی ہے، انھوں نے ایک پادری کی کتاب 'امہات المؤمنین' کے جواب میں 'امہات الامہ' لکھی۔ ان کے ناول مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، فسانہ مبتلا، ابن الوقت، ایامیٰ اور رویائے صادقہ کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ انگریزی حکومت نے انھیں 1897 میں شمس العلماء کا خطاب دیا۔ 1902 میں ایڈنبرا یونیورسٹی (برطانیہ) نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔ 1910 میں پنجاب یونیورسٹی نے ڈی۔ او۔ ایل کی ڈگری تفویض کی۔ ریاست حیدرآباد نے انھیں غیور جنگ کے خطاب سے بھی نوازا تھا جسے انھوں نے قبول نہیں کیا۔

نذیر احمد نے ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے والدِ محترم جناب مولوی سعادت علی سے حاصل کی۔ وقت کے جید عالم دین مولانا نصر اللہ خان جنھیں عربی زبان پر قدرت حاصل تھی اور آپ ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر بھی فائز تھے، ان سے عربی، صرف ونحو اور منطق وفلسفے کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ نذیر احمد کو محض نو برس کی عمر میں تحصیل علم کی غرض سے دہلی بھیجا گیا۔ اورنگ آبادی مسجد کے مدرسے میں داخل ہو گئے جہاں انھیں بہترین اساتذہ ملے، 1857 کے خلفشار میں انگریزوں نے اس مسجد بلکہ پورے محلے پنجابی کٹرہ کو ہی نیست ونابود کر دیا یہ پنجابی مسلمانوں کا ایک خوشحال محلّہ تھا۔ اس وقت پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن اسی جگہ پر واقع ہے۔ وہ مسجد بھی ریلوے کی توسیع کی نذر کر دی گئی۔ نذیر احمد نے اسی مسجد کے متولی، مستند اور معتبر عالم دین مولانا عبدالخالق محدث اور میاں نذیر حسین محدث وغیرہ سے درس لیا۔ مولانا عبدالخالق کا انتقال 1845 میں ہو گیا۔ شاہ عبدالعزیز مکہ ہجرت کر گئے۔ اب اس ادارے کی آبیاری سید السادات، استاد الاساتذہ میاں نذیر حسین محدث دہلوی (1805-1902) نے ہی 1842 سے 1857 تک کی۔ اور اس آب وتاب کے ساتھ اس مدرسے کی ذمے داریاں سنبھالی کہ چاردانگ عالم میں اس کی شہرت نے اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑ دیے۔ اس وقت پورے عالم اسلام میں علم حدیث کا اس سے بڑا کوئی ادارہ موجود نہیں تھا۔ یہ وہی عہد زریں ہے جب نذیر احمد نے حصول تعلیم کی غرض سے اس ادارے کا رخ کیا۔

اردو، عربی اور فارسی پر تو مولانا کو مادری زبان کی طرح قدرت حاصل تھی، اس کے علاوہ انھیں انگریزی،

تیلگو بھی اچھی خاصی آتی تھی، قیامِ حیدرآباد کے دوران مولانا نے تیلگو کتابیں سبقاً سبقاً پڑھیں، اس کے علاوہ انھوں نے پنڈت 'کنج من' سے باضابطہ سنسکرت بھی سیکھی تھی۔ ڈپٹی نذیر احمد کی بیشتر کتابیں بہت مقبول ہوئیں۔ ان کی کتابوں کا انگریزی کے علاوہ پنجابی، کشمیری، مراٹھی، گجراتی اور بنگلہ وغیرہ زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا۔

دلی کالج میں کوئی تقریب گرم تھی اتفاق سے اسی دن ٹہلتے ہوئے نذیر احمد دلی کالج جا پہنچ گئے۔ عربی کے ایک مشہور عالم مفتی صدرالدین آزردہ (پ 1789، 16 جولائی 1868) زبانی امتحان لینے وہاں تشریف فرما تھے۔ بھیڑ میں شامل نذیر احمد پھسل کر گر پڑے۔ پرنسپل نے دیکھا تو بڑھ کے دل جوئی کی اور یونہی پوچھ لیا کہاں اور کیا پڑھتے ہو؟ نذیر نے جواب دیا'' پنجابیوں کے کٹرے کی مسجد میں معلقات پڑھ رہا ہوں (عہد جاہلیت کے عرب شعرا کے قصائد کا ایک مجموعہ جو سبعہ معلقہ کہلاتا ہے)۔

پرنسپل صاحب نے موٹی سی کتاب کا نام سنا اور حیرت سے ان کے چھوٹے سے قد کو دیکھا نذیر احمد کا ہاتھ پکڑا اور مفتی صاحب کے سامنے لے جا کے کھڑا کر دیا اور ان سے کہا ''مفتی صاحب یہ لڑکا کہتا ہے میں معلقات پڑھتا ہوں۔ ذرا امتحان لے کر تو دیکھیں'' مفتی صاحب کے سوالات کا نذیر احمد نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ بالآخر پوچھا گیا'' کالج میں پڑھو گے؟'' نذیر احمد نے اپنے سابقہ حالات کے پیش نظر سوال کیا'' یہاں مجھے کیا کیا کام کرنا پڑے گا؟'' جواب ملا'' پڑھنا ہوگا۔ اور کیا کرنا ہوگا؟'' مولانا خوشی سے آمادہ ہوگئے۔ چار روپے مہینہ وظیفہ مقرر ہوا۔ خود داخلہ لیا اور اپنے بھائی کو بھی داخل کرا دیا۔ دلی کالج میں انھوں نے عربی، فلسفہ اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ اس طرح نذیر احمد 1845 میں دلی کالج کی عربی جماعت میں داخل ہوئے۔ اس زمانے میں سید احمد خاں فارسی، منشی ذکاء اللہ حساب اور پیارے لال انگریزی کی جماعتوں میں زیر تعلیم تھے۔ اب معاشی اور ذہنی سکون کے ساتھ علم حاصل کرنے کا موقع میسر آیا تو تیز رفتاری سے ترقی کی منزلیں طے کرنے لگے۔ اپنے شوق محنت ولگن اور کوشش سے اپنی جماعت والوں میں سب سے ممتاز ہوگئے۔ کالج میں داخلے کو کچھ ہی دن گزرے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ دونوں بھائیوں کو آٹھ روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ اسی رقم میں اپنی گزر بسر بھی کرنی تھی اور اپنے خاندان کی کفالت بھی۔ 1854 میں ان کی تعلیم مکمل ہوتی اس سے پہلے ہی ملازمت کی فکر دامن گیر ہوگئی۔

نذیر احمد نے اپنی پہلی نوکری کا آغاز بحیثیت مدرس، ضلع گجرانوالہ کیا، مگر دہلی تہذیب کے پروردہ نذیر احمد کو پنجاب کی فضا اس نہ آئی اور دوسری ملازمت کے لیے کوششیں شروع کردیں۔ بہرحال کانپور میں 80 روپے ماہوار پر ڈپٹی انسپکٹر مدارس کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوگیا لیکن کیپٹن فلر سے ان بن کی وجہ سے

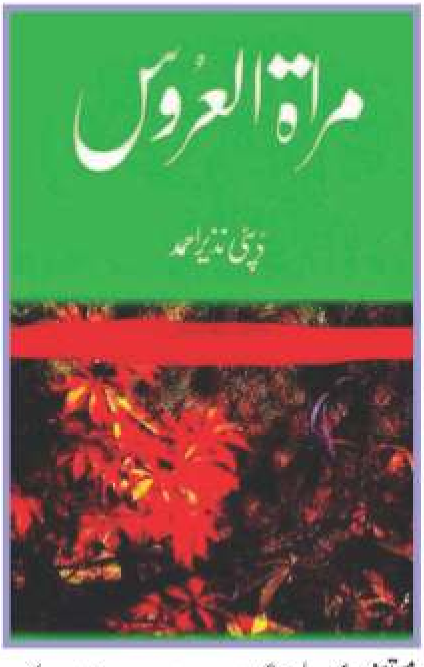

مستعفی ہوکر دہلی آگئے اس دوران 1857 کا دردناک خونی سانحہ وقوع پزیر ہوا۔ نذیر احمد نے خداداد ذہانت اور انتھک کوششوں سے انگریزی میں اچھی مہارت واستعداد پیدا کر لی اور سرولیم کے ایماں پر انھیں ڈپٹی انسپکٹر کے ساتھ ساتھ ترجمے کی ذمے داریاں بھی تفویض کی گئیں۔ اس طرح انڈین پینل کوڈ کا ترجمہ (تعزیرات ہند) کے نام سے معرض وجود میں آیا جو سرکاری حلقوں میں بہت مقبول ہوا اور آج بھی استعمال ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اسی کے صلے میں آپ کو 1861 میں تحصیلدار مقرر کیا گیا اور کانپور بھیج دیا گیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے قانونِ انکم ٹیکس اور قانونِ شہادت کا بھی ترجمہ کیا۔ بعدازاں ڈپٹی کلکٹر کا امتحان اول نمبر سے پاس کر کے 1863 میں ڈپٹی کلکٹر ہوئے، گورکھپور، جالون اور اعظم گڑھ وغیرہ میں اپنی ملازمت کرتے رہے۔

سرسالار جنگ اول، نظام دکن نے نذیر احمد کی شہرت سن کر ان کی غیر معمولی صلاحیت کے پیش نظر اور سرسید احمد خاں کے توسط سے انھیں ریاست حیدرآباد دکن میں ملازمت کی پیشکش کی۔ نذیر احمد 27 اپریل 1877 کو حیدرآباد پہنچے۔ نواب محسن الملک کے یہاں مقیم ہوئے اور وہاں بحیثیت ناظم بندوبست ان کا تقرر ہوا۔ یہاں ان کی تنخواہ 1250 روپے تھی، انھیں دفاتر کا معائنہ اور کارکردگی کی مفصل روداد پیش کرنے کی ذمہ داری دی گئی۔ نذیر احمد نے بڑی محنت ولگن سے کام کیا اس لیے انھیں ترقی ملتی گئی اور ان کی تنخواہ 1750 روپے ماہانہ ہوگئی۔ کچھ ہی عرصے بعد سمت شمال کے منصرم صدر تعلقہ دار بنا دیے گئے۔ یہاں انھوں نے بہت سے عزیزو اقربا کو اہم مناسب اور عہدوں پر فائز بھی کروایا۔ سرسالار جنگ اول کے آخری زمانے میں نذیر احمد مجلس مال کے رکن مقرر ہوئے۔ اس دوران انھوں نے نظام دکن کے بچوں کو پڑھانے کی ذمے داری نبھائی۔ اس طرح 1877 سے 1885 تک تقریباً آٹھ برسوں تک مولوی نذیر احمد حیدرآباد میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ سالار جنگ نظام حیدرآباد کی یکم فروری کو وفات کے بعد وزارت واقتدار کی کش مکش شروع ہوئی اور ہر طرف سازشوں کے جال بچھ گئے۔ وہاں کے حالات تیزی سے بدلے تو نذیر احمد بددل ہوکر 25 فروری 1885 کو مستعفی ہوکر دہلی آگئے۔ نظام سرکار کی جانب سے مولوی نذیر کی خدمات کے اعتراف میں ماہانہ چھ سو روپے پنشن مقرر کی گئی جو انھیں تاحیات ملتی رہی۔

حیدرآباد میں ملازمت کے دوران تصنیف وتالیف کا جو سلسلہ منقطع ہوگیا تھا دہلی واپس آنے کے بعد انھیں وہ موقع دوبارہ فراہم ہوا۔ سبکدوشی کے بعد مولوی نذیر احمد نے اپنی زندگی تصنیف وتالیف کے لیے وقف کردی۔ اس کے بعد ان کی ناول نگاری کا دوسرا دور شروع ہوا اور یکے بعد دیگرے چار ناول (محصنات یا فسانہ مبتلا، ابن الوقت، ایامی اور رویائے صادقہ) لکھے۔ انھوں نے علی گڑھ تحریک میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک سے ان کے روابط بہت پرانے تھے۔ مولوی نذیر احمد نے میدان خطابت میں اپنی بلند آہنگی، مسحور کن آواز، علمی، اصلاحی انداز اور پرجوش خطابت سے عوام وخواص کو مسحور کیا۔ نذیر احمد کے خطبات، ان کی غیر معمولی ذہانت، وسعت معلومات ومطالعہ، حقیقت

پسندی اور زمانہ شناسی ان کی خطابت کا طرۂ امتیاز ہیں۔
اردو ادب میں وہ ناول نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کی کتابیں: مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، فسانہ مبتلا، ابن الوقت، ایامی اور رویائے صادقہ کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ذیل میں ان کی اہم تصانیف کا مختصر اور جامع تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

مراۃ العروس (1869) اردو زبان کا پہلا سب سے مشہور ناول ہے۔ مولوی نذیر احمد دراصل اپنی بچیوں کی تربیت کے لیے ایک ایسی کتاب تحریر کرنا چاہتے تھے جسے پڑھ کر ان کے اخلاق و کردار میں شائستگی اور اعمال میں درستگی پروان چڑھ سکے۔ اسی مقصد سے انھوں نے قلم برداشتہ لکھنا شروع کیا اور اپنی بڑی بیٹی سکینہ کو دو چار صفحے لکھ کر دے دیتے اور جب وہ اسے پڑھ لیتیں تو مولوی صاحب آگے لکھ کر دے دیتے اور جب یہ کتاب اپنے تکمیل کو پہنچی تو اردو میں ناول نگاری کی ابتدا ہو چکی تھی۔ اس ناول میں دہلی کے متوسط شریف مسلمان گھرانوں اور ان کی مستورات کے سماجی اور اخلاقی حالات کا مفصل حال پیش کیا ہے۔ اس ناول کا مقصد مسلمان بچیوں کی اخلاقی اور امور خانہ داری میں اصلاح ہے۔ ناول کی خصوصیات میں عورتوں کی امتیازی زبان اور کردار نگاری ہے۔ اس ناول کے کردار اکبری اور اصغری آج بھی بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے اہم کردار: اکبری، اصغری، دور اندیش خان، خیر اندیش خان، اکبری اور اصغری کی ساس، ماما عظمت، محمد عاقل، محمد کامل، محمد فاضل۔ سیٹھ ہزاری مل، تماشا خانم، حسن آراء، جمال آرا، شاہ زمانی بیگم، سلطانی بیگم، سفہن، جیمس صاحب، کٹنی وغیرہ ہیں۔ نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں اس بات کا پورا التزام کیا ہے کہ قصہ سبق آموز و دلچسپ ہو۔ ساتھ ہی گھریلو مسائل، امور خانہ داری اور رشتوں کی نفسیات سے متعلق اصلاحات ممکن ہو سکیں۔ 'مراۃ العروس' کا انگریزی ترجمہ 1903 میں لندن سے شائع ہوا۔ حکومت نے اس ناول پر مولانا کو ایک ہزار روپے کے انعام سے نوازا تھا۔

بنات النعش (1873) نذیر احمد کا دوسرا ناول ہے یہ دراصل 'مراۃ العروس' کا دوسرا حصہ ہے۔ جس کا نام 'بنات النعش' ہے۔ اس میں نذیر احمد کا وہی انداز، وہی زبان، وہی موضوع ہے۔ اس کا مرکزی کردار حسن آراء ہے، جو اصغری کے قائم کیے اسکول میں تعلیم پا کر زندگی

مراۃ العروس (1869) اردو زبان کا پہلا سب سے مشہور ناول ہے۔ مولوی نذیر احمد دراصل اپنی بچیوں کی تربیت کے لیے ایک ایسی کتاب تحریر کرنا چاہتے تھے جسے پڑھ کر ان کے اخلاق و کردار میں شائستگی اور اعمال میں درستگی پروان چڑھ سکے۔

میں کامیابی حاصل کرتی ہے۔ اس ناول کے ذریعے نذیر احمد نے خانگی زندگی میں عورتوں کی قدر و قیمت اور مردوں کی زندگی کو بنانے اور سنوارنے میں ان کے کردار کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کردار کے ذریعہ نذیر احمد نے معلومات عامہ کی تعلیم بھی دی ہے۔ مراۃ العروس کا مرکزی کردار اصغری خانم نے بچیوں کی تعلیم و تربیت کا ذمہ اٹھاتے ہوئے اپنے گھر پر ہی انھیں مختلف علوم اور امور خانہ داری سے متعلق تعلیم دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس ناول میں نذیر احمد نے تعلیم نسواں کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ اس میں ناول نگار نے مختلف سائنسی مضامین مثلاً رنگوں کی خصوصیات، زمین کا حجم، علم التاریخ، علم الجغرافیہ، اجرام فلکی وغیرہ سے متعلق معلومات کو کہانی کی شکل میں پیش کیا ہے۔

توبۃ النصوح (1877) تیسرا ناول ہے۔ اس ناول کو مولوی نذیر کا شاہکار کہا جاتا ہے۔ اس ناول کا موضوع اولاد کی تربیت ہے۔ جس میں واضح کیا گیا ہے کہ اولاد کی محض تعلیم ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کی تربیت بھی ضروری ہے۔ یہ ناول مکالمے کی شکل میں ہے۔ اس ناول میں گھریلو ناچاقیوں کو ختم کرنے اور اپنے بچوں کو کیسے راہ راست پر لائیں، اس کی طرف واضح اشارے موجود ہیں۔ کتاب بارہ فصلوں پر مشتمل ہے۔ ہر فصل کا عنوان الگ ہے۔ مقصدیت سے بھرپور اس ناول میں وعظ، پند و نصیحت اور بیان پر زور زیادہ ہے۔ ناول کا مرکزی کردار نصوح خواب میں اپنی موت اور اپنا حشر دیکھتا ہے، بیدار ہونے پر یہ کیفیت اس پر غالب

آجاتی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے گھر اور معاشرے کی اصلاح کے لیے کیا کیا جتن کرتا ہے، وہ اس ناول کا موضوع ہے۔ 1884 میں 'توبۃ النصوح' کا ترجمہ سر ولیم میور کے دیباچے کے ساتھ شائع ہوا۔

'فسانہ مبتلا' 1885 (محصنات، اصل نام) نذیر احمد کا چوتھا مشہور معاشرتی اور اصلاحی ناول ہے۔ اس میں پرانا جاگیر دار طبقہ دکھایا گیا ہے جس کی مضبوط علامت غیرت بیگم ہے۔ مبتلا جو اس طبقے کی نمائندگی اپنے عیاش رویے سے کرتا ہے۔ 'ہریالی' رذیل پیشے سے تعلق رکھنے کے باوجود سلیقے میں غیرت بیگم سے بہتر ہے۔ اس ناول میں نذیر احمد نے ذات پات کا جاہلانہ نظام اور ایک سے زیادہ شادیوں کے مضر اثرات و مسائل کو بڑے سلیقے اور منطقی انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک ماہر حکیم و نباض کی طرح معاشرے کی تمام خرابیوں اور مسائل کی حقیقت کو واضح کرتے ہیں۔ جہاں 'ایامی' میں بیواؤں کے نکاح اور دوسری شادی کی ضرورت پر زور دیتے ہیں وہیں اس ناول میں بلاوجہ تعدد ازدواج کی سرزنش کرتے ہوئے اس کی خامیوں اور منفی اثرات کا تجزیہ کیا ہے۔ وہ اس حقیقت کو بھی واضح کرتے ہیں کہ شادی کی بلاضرورت خواہشات جنسی بے راہ روی ہے۔ اس ناول میں نذیر احمد نے نچلے متوسط طبقے کی پیشکش کے ساتھ ان کی اصلاح چاہی۔ وہ نچلے اور بالائی طبقے کے درمیانی فرق کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ مبتلا اور عارف اس ناول کے کلیدی کردار ہیں جن کے درمیان بحث و مباحثے کے ذریعے نذیر احمد نے اس شرعی مسئلے کی عصری معنویت کو واضح کیا ہے۔ مبتلا عقد ثانی کے حق میں تمام تر شرعی مسائل پر روشنی ڈالتا ہے جب کہ عارف اس سے اختلاف کرتا ہے اور اپنے دلائل پیش کرتا ہے۔ ناول کچھ اس انداز سے آگے بڑھتا ہے کہ مبتلا کا عقد ثانی ہو جاتا ہے اور مروجہ سماجی پس منظر میں اس کے برے نتائج سامنے آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ناول قاری پر یہ تاثر قائم کرتا ہے کہ کثرت ازدواج میں شرعاً کوئی عذر نہ صحیح مگر سماجی و معاشی نقطہ نگاہ سے اس کی برائیوں سے ہوشیار رہنا ضروری ہے اور بلاضرورت دوسری شادی سے بچنے میں ہی عافیت ہے۔

ابن الوقت 1888 'ابن الوقت' نذیر احمد کا پانچواں اور بہت ہی مشہور ناول ہے، جس میں مغربی تہذیب و تمدن کی نقالی پر طنز کیا گیا ہے۔ کچھ لوگوں کے خیال

میں اس میں سرسید احمد خان کو تضحیک کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ مگر ڈپٹی نذیر احمد نے اس کی تردید کی ہے کیوں کہ وہ خود سرسید کی تحریک سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ سرسید کے مشن میں ان کے معاون رہے بلکہ اس کی تبلیغ اور ترویج کے لیے ہمیشہ سرگرم رہتے تھے۔ وہ سرسید کی تمام علمی کاوشوں کے قدرداں تھے اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے اہم قومی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ بنیادی طور پر اس ناول میں ابن الوقت کی کہانی بیان کی گئی ہے جو انگریزی تہذیب وتمدن کا دل دادہ ہے، تقلید مغرب کو باعث شرف جانتا ہے۔ وضع قطع، نشست و برخاست، گفتار و کردار ہر پہلو سے اس کی شخصیت مغربی معاشرے کی چلتی پھرتی تصویر نظر آتی تھی۔ یہ ناول دراصل 1857 کی تحریک آزادی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس تحریک کے دوران جہاں بہت سے ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں پر انگریزی حکومت کا عتاب نازل ہوا وہیں بہت سے صاحب اقتدار بھی اس کی چپیٹ میں آئے۔ ان ہی میں ایک افسر مسٹر نوبل ہیں جو انتہائی زخمی حالت میں ابن الوقت کو مل گئے اور وہ ان کی اچھی تیمارداری کرکے مسٹر نوبل کی جان بچاتا ہے۔ اس خدمت سے خوش ہوکر ابن الوقت کو جاگیر و ملازمت اور منصب عطا کیا جاتا ہے۔ ابن الوقت اس کے بعد پوری طرح مغربی معاشرت کی تقلید میں گم ہوجاتا ہے۔ لیکن نوبل صاحب کے ولایت جاتے ہی بعض وجوہات کی بنا پر حکومتی افسران کے عتاب کا شکار ہوجاتا ہے۔ انگریزی تہذیب ومعاشرت کی اندھی تقلید اخراجات میں اضافے کا سبب بن جاتا ہے۔ اور قرض کی وجہ سے جائداد تک کو فروخت کرنے کی نوبت آجاتی ہے۔ 'ابن الوقت' ایک مکمل معاشرتی ناول ہے، اس ناول کے ذریعے یہ واضح پیغام بھی دیا گیا ہے کہ علوم وفنون سے استفادہ اپنی جگہ ضروری ہے لیکن مغربی معاشرت سے بے جا مرعوبیت اور اندھی تقلید حماقت ونادانی ہے۔

ایامیٰ (1891) نذیر احمد کا چھٹا ناول ہے۔ آزادی بیگم اس ناول کا مرکزی کردار ہے وہ ایک روشن خیال خواجہ صاحب کی بیٹی ہیں۔ ماں بادی بیگم قدامت پسند عورت ہے جسے اپنی بیٹی کی بنیادی اور فطری ضرورتوں سے زیادہ سماج کے نام نہاد رسوم کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ لفظ ایامیٰ سورۂ نور کی آیت 32 سے لیا گیا ہے 'ایامیٰ' کا لغوی معنی مرد بے زن یا زن بے مرد یعنی غیر شادی شدہ کے ہیں۔ یہاں اس لفظ سے بیوہ مراد لی گئی ہے۔ اس ناول میں نذیر احمد نے ایک مسلمان بیوہ کی کہانی کو بنیاد بنا کر بیواؤں کی دردناک زندگی اور ان کے مسائل کو بیان کرتے ہوئے اس کا حل بھی پیش کیا ہے۔ یہ اصلاح معاشرہ پر مبنی یہ ناول ہے۔

مولوی نذیر احمد نے بیوہ عورت کے تمام مسائل کو 'آزادی بیگم' کی زبانی بیان کیا ہے۔ ناول میں نذیر احمد نے عورت کی پیدائش سے لے کر موت تک کی داستان کو نفسیاتی انداز میں عورت کے احساس ونفسیات کو حقیقی پیرائے میں بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ نذیر کو سفاک حقیقت نگاری پر ملکہ حاصل ہے۔ مولوی نذیر نے اس بات کو بھی بخوبی واضح کیا ہے کہ شوہر کے انتقال کے ساتھ عورت کی جنسی ضروریات کا خاتمہ نہیں ہوجاتا۔ نکاح ثانی کو نذیر احمد نہ صرف بیواؤں کے مسائل کے حل کے طور پر پیش کیا ہے اور عورتوں کو جائداد میں باضابطہ حصہ نہ ملنے، شادی کی مشکلات وغیرہ مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

نذیر احمد نے انگریزی اور ہندوستانی سوسائٹی کا موازنہ بھی کیا ہے۔ اس ناول کا پلاٹ گٹھا ہوا ہے، مگر بعض جگہوں پر 'آزادی بیگم' کی تقریر نے اس کے توازن کو مجروح کردیا ہے۔ کردار نگاری میں ڈپٹی نذیر نے مختلف طرح کی فنی تدبیریں اختیار کی ہیں۔ کبھی انھوں نے خود کرداروں کا تفصیلی تعارف کرایا تو کبھی کرداروں کے مزاج اور ان کی خاصیتوں پر روشنی ڈالی۔

'رویائے صادقہ' 1894 ڈپٹی نذیر احمد کا ساتواں اور آخری ناول 'رویائے صادقہ' ہے۔ اس ناول میں مرکزی کردار صادقہ ہے جو سچے خواب دیکھتی ہے۔ ناول کی ہیروئن صادقہ کے بارے میں یہ بات مشہور ہوجاتی ہے کہ اس پر جنات کا اثر ہے۔ اسی وجہ سے بائیس برس تک اس کی شادی نہیں ہوپاتی۔ بالآخر علی گڑھ کالج کے طالب علم سید صادق سے اس کا رشتہ طے پاتا ہے۔ ناول کا اہم ترین کردار صادق ہر مسئلے کو عقلی دلائل کی بنیاد پر حل کرنے میں یقین رکھتا ہے۔ بے جا تعقل پسندی کی وجہ سے صادق مذہب کے سلسلے میں الجھنوں کا شکار ہوجاتا ہے۔ اسی دوران صادقہ ایک ایسا خواب دیکھتی ہے جس خواب میں ایک بزرگ صادق کے تمام سوالوں کا جواب دیتے ہیں اور اس کا ذہن الجھنوں سے نجات پاجاتا ہے۔ اس ناول کا مقصد مسلم معاشرے میں موجود غلط رسوم وعقائد کی اصلاح ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ وہ بامقصد اصلاح کے ذریعے مردوزن میں تعلیم کو عام کرکے ایک بہترین مثالی معاشرے کی تشکیل چاہتے تھے۔ ان کے تمام ناول اصلاحی اور بامقصد ہیں۔ نذیر احمد کے ناول زندگی کا رشتہ ادب سے اور ادب کا رشتہ زندگی سے استوار کرتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں زندگی کے مسائل کا حل نظر آتا ہے اور قاری کو ان کے ناول سے افسانوی لطف وانبساط بھی حاصل ہوتا ہے۔ متوسط طبقے کے گھرانوں کی جیتی جاگتی اور بے لاگ تصویر ان کے ناولوں میں نظر آتی ہے کہیں اور ملنا بہت مشکل ہے۔ اردو ناول نگاری کے موجد نذیر احمد کے سامنے ناول کے فنی اصول و قوائد نہیں تھے یعنی اس وقت تک ناول کے فن اور اصول کا تعین نہیں ہوا تھا اس لیے نذیر احمد نے اس صنف کو اپنی فہم وفکر کے مطابق ایک مخصوص سمت عطا کی۔ معاشرے کی بداخلاقی، بے راہ روی، مغرب کی اندھی تقلید، مذہب سے دوری، شادی بیاہ، تعلیمی مسائل اور اولادوں کی تربیت وغیرہ مضامین کو موضوع بحث بنا کر ناول کی شکل میں ادب اور سماج کی غیر معمولی خدمت سرانجام دی۔ آج بھی نذیر احمد کے ناولوں سے نئی نسل عبرت حاصل کرسکتی ہے اور بلاشبہ عصر حاضر میں بھی نذیر احمد کے ناولوں کی معنویت مسلم ہے۔ ان کی ایک اہم کتاب امہات الامہ بھی ہے جس کا تعارف مناسب معلوم ہوتا ہے۔

'امہات الامہ' 1897 پادری معظم احمد شاہ شائق کی کتاب 'امہات المومنین' کے رد میں لکھی اہم کتاب ہے۔ مولوی نذیر کی زندگی کی یہ آخری تصنیف ہے۔ مذکورہ کتاب میں پادری نے ازواج مطہرات کے کردار کشی کی تھی۔ مولوی نذیر نے امہات الامہ میں اسی کتاب کا مفصل جائزہ لیا ہے اور علمی اور عقلی تنقید کی روشنی میں مسیحی پادری کے اعتراضات کا معقول جواب دیا۔

تاہم انھوں نے بعض جگہوں پر مقدس ہستیوں کے ناموں کے ساتھ ضروری آداب والقاب نہیں لکھے اور بعض فقرے جو کہ لسانی اعتبار سے درست تھے لیکن انھیں ہتک آمیز سمجھ لیا گیا۔ نتیجتاً کتاب شائع ہوتے ہی دہلی کے مسلمانوں میں اس پر غم وغصے کا ماحول بن گیا۔

نذیر احمد کی تحریر وتقریر کا اسلوب سادہ، رواں،

بے تکلف و بے ساختہ ہے۔ ان کا انداز مکالماتی ہونے کے ساتھ ساتھ بامحاورہ بھی ہے انھیں عورتوں کی زبان لکھنے میں کمال کی مہارت حاصل تھی۔ نذیر کی لفظیات اور انداز بیان میں دہلی کی ٹھیٹ ٹکسالی زبان اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ نذیر احمد کی تحریروں میں محاورات کے عمدہ اور برملا استعمال کے سبب عمدہ تاثیر پیدا ہوگئی ہے لیکن کئی دفعہ محاورات کی بہتات سے ان کی زبان غیر رواں اور بوجھل بھی ہوجاتی ہے۔ اس دور کی مناسبت سے عربی فارسی لفظیات کے بکثرت استعمال کی وجہ سے بھی کئی دفعہ ان کی تحریر ادق ہوجاتی ہے۔ نذیر احمد کا اصل کمال یہ ہے کہ انھوں نے مافوق الفطری رنگوں، کرداروں اور فضاؤں سے الگ سے گرد وپیش کی دنیا سے زندگی کے وہ حقیقی کردار جو قابل اعتنا نہیں تھے انہی کرداروں میں حقیقت واصلیت کا رنگ بھرا اور ایسی شاہکار افسانوی دنیا تخلیق کی جس کے سب گرویدہ ہوگئے۔ یہ بھی انہی کا کمال ہے کہ جب ساری دنیا بادشاہوں، شہزادوے، شہزادوں، جنوں اور پریوں کی خیالی دنیا کے قیدی تھے۔ اہل علم اور عوام وخواص ابھی تک مقفی ومسجع عبارتوں کے سحر میں تھے، حکومت بدل رہی تھی بادشاہ غلام ہو رہے تھے ایسے میں نذیر احمد نے مذہبی پیرائے میں عوام کو زندگی سے جوڑنے کی کامیاب کوشش کے لیے جس زبان وبیان کی ضرورت تھی ڈپٹی نذیر احمد نے اس کا استعمال کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کی انشاپردازی اپنے عہد کے ادیبوں میں سب سے زیادہ مضبوط انداز میں اپنی بات کہنے کا سلیقہ رکھتی ہے۔ ان کی تحریر وتقریر ظرافت وزندہ دلی کے جواہرات سے پر ہیں جو اکثر آپ کو زیر لب مسکرانے پر مجبور کردیتا ہے۔ ساتھ ہی وہ اپنی تحریر وتقریر میں طنز سے بجھے ہوئے تیروں کو چلانے سے وہ ہرگز نہیں چوکتے۔

نذیر احمد نے بہت سی علمی اور مذہبی کتابیں بھی تحریر کی ہیں ساتھ ہی انھوں نے بہت سے عمدہ تراجم بھی چھوڑے ہیں۔ وہ دور جب کہ وطن عزیز مغربی علوم وفنون سے واقف ہی ہو رہا تھا اور دوسری زبانوں سے ترجمے کے لیے اصطلاحات موجود نہیں تھیں۔ نذیر احمد نے انگریزی کتابوں اور علمی اصطلاحات کو اردو میں ترجمہ کیا جبکہ ان کے پاس تراجم کی روایت موجود نہیں تھی پھر بھی جس حسن وخوبی سے انھوں نے ترجمہ نگاری کے کام کو سرانجام دیا وہ غیر معمولی ہے۔ مولانا کی عربی،

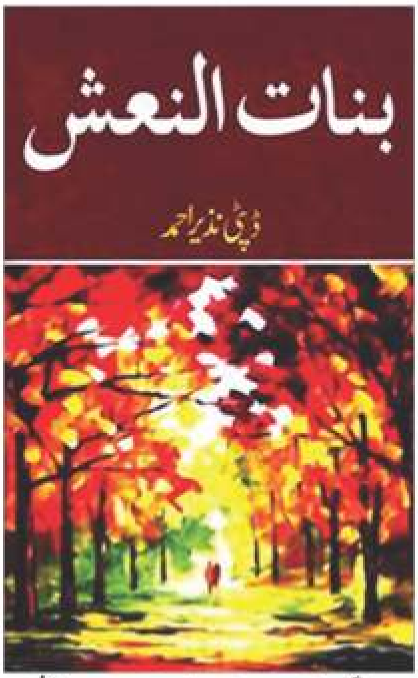

فارسی، انگریزی اور دوسری زبانوں پر دسترس نے انھیں انگریزی کو اردو اصطلاحات کے قالب میں ڈھالنے میں مدد کی۔ ان کی علمی عظمت واہلیت اور بیان پر ان کی قدرت ترجمہ قرآن میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ انھوں نے قرآن مجید کا آسان اور بامحاورہ ترجمہ 1805 میں کیا۔ ڈپٹی صاحب کے ترجمے میں محاوروں کی بہتات ہے، ان کی کثرت، کبھی کبھی حسن کی بجائے عیب بن گئی۔ عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال اس دور کی مناسبت سے بکثرت ہوا ہے۔ ایک بہترین ترجمہ ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس کی لاتعداد اشاعت سے لگایا جاسکتا ہے جو آج تک طبع ہو رہے ہیں۔ روزنامچہ مصائب غدر' ولیم اڈوارڈس' کی سرگزشت 1857 ہے جو اس نے انگریزی میں روزنامچہ کی حیثیت سے لکھ کر چھپوایا تھا جس کا ترجمہ بھی ڈپٹی نذیر احمد نے مصائب غدر کے نام سے کیا ہے۔ جہاں مولوی نذیر احمد نے 'تعزیرات ہند' کے نام سے (انڈین پینل کوڈ) بہترین ترجمہ کیا۔ اس اہم کارنامے پر انھیں ہزار روپے کا انعام بھی دیا گیا، اس کتاب کے گیارہ ترجمے ہوئے لیکن نذیر احمد کا ترجمہ سب سے بہتر قرار پایا۔ وہیں، ضابطہ فوجداری، قانون انکم ٹیکس 1861، قانون شہادت 1863 اور سموات 1876 جیسے اہم ترجمے پیش کرکے مولانا نے عوام وخواص کے لیے بڑا کام سرانجام دیا۔ اس کے علاوہ مولوی صاحب نے بہت سی درسی اور مذہبی کتابیں تحریر کیں جن میں سے کچھ کتابیں اس طرح ہیں 'مواعظ حسنہ' الحقوق والفرائض (تین جلدیں) اجتہاد، منتخب الحکایات، تاریخ دربار تاج پوشی، مذہبی اور درسی کتابوں میں چند پند، نصاب خسرو، صرف صغیر، مبادی الحکمت، رسم الخط، مابغنیک فی الصرف، غرائب القرآن ساتواں جہازی سائز ایڈیشن، اتمام حجت، اجتہاد، ادعیۃ القرآن، دہ سورۃ ہفت سورۃ، صرف صغیر، رسم الخط، مبادی الحکمت، (مبادیات منطق پر مختصر رسالہ) نصاب خسرو (الفاظ یاد کرنے کی تدبیر کے لیے اٹھائیس صفحوں پر مشتمل نظم)۔ اس کے علاوہ بہت سے لیکچر جن کی تعداد 44 بتائی جاتی ہے دہلی اور لاہور سے متفرق اور دو جلدوں میں شائع ہوئے۔ بڑے عمدہ موضوعات پر ان کی تقریریں ہیں۔ ان کے اندر بہت سی خوبیوں کے ساتھ چند خامیاں بھی تھیں لیکن ان کی پوری زندگی طالب علموں اور علمی کاموں کے لیے وقف تھی۔ کتابیں نہیں تھی تو خود تیار کیں۔ عوام وخواص اور اساتذہ کے لیے مثالی شخصیت تھے۔ مولوی نذیر احمد پر بالآخر دائیں جانب فالج کا حملہ ہوا، حکیم اجمل خاں نے ان کا علاج کیا لیکن آپ 3 مئی کی درمیانی رات جمعہ کے دن 1912 کو دہلی میں وفات پاگئے اور نئی دہلی ریلوے اسٹیشن اور نبی کریم دہلی سے قریب 'باقی باللہ' قبرستان میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

حوالہ جاتی کتب

1 آثار الصنادید: سرسید احمد خان
2 اردو کا پہلا ناول نگار: اویس احمد ادیب بی اے (آنرز) ہندوستانی اکیڈمی 1934 الہ آباد
3 حیات النذیر: سید افتخار عالم بلگرامی طباعت 1912
4 ڈپٹی نذیر احمد (کتابیات): ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی
5 ڈپٹی مولوی نذیر احمد کی علمی خدمات: ڈاکٹر ماجد الاسلام
6 ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی: مرزا فرحت اللہ بیگ
7 نذیر احمد (ادب کے معمار): نور الحسن نقوی، ساہتیہ اکادمی 1984
8 واقعات دار الحکومت دہلی: بشیر الدین احمد دہلوی
9 نذیر احمد کے ناول: ڈاکٹر اشفاق محمد خاں 1979 مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

Dr. Mohammad Adam
Assistant Professor (Contractual), Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025
Mob.: 9871716440
adam904@gmail.com

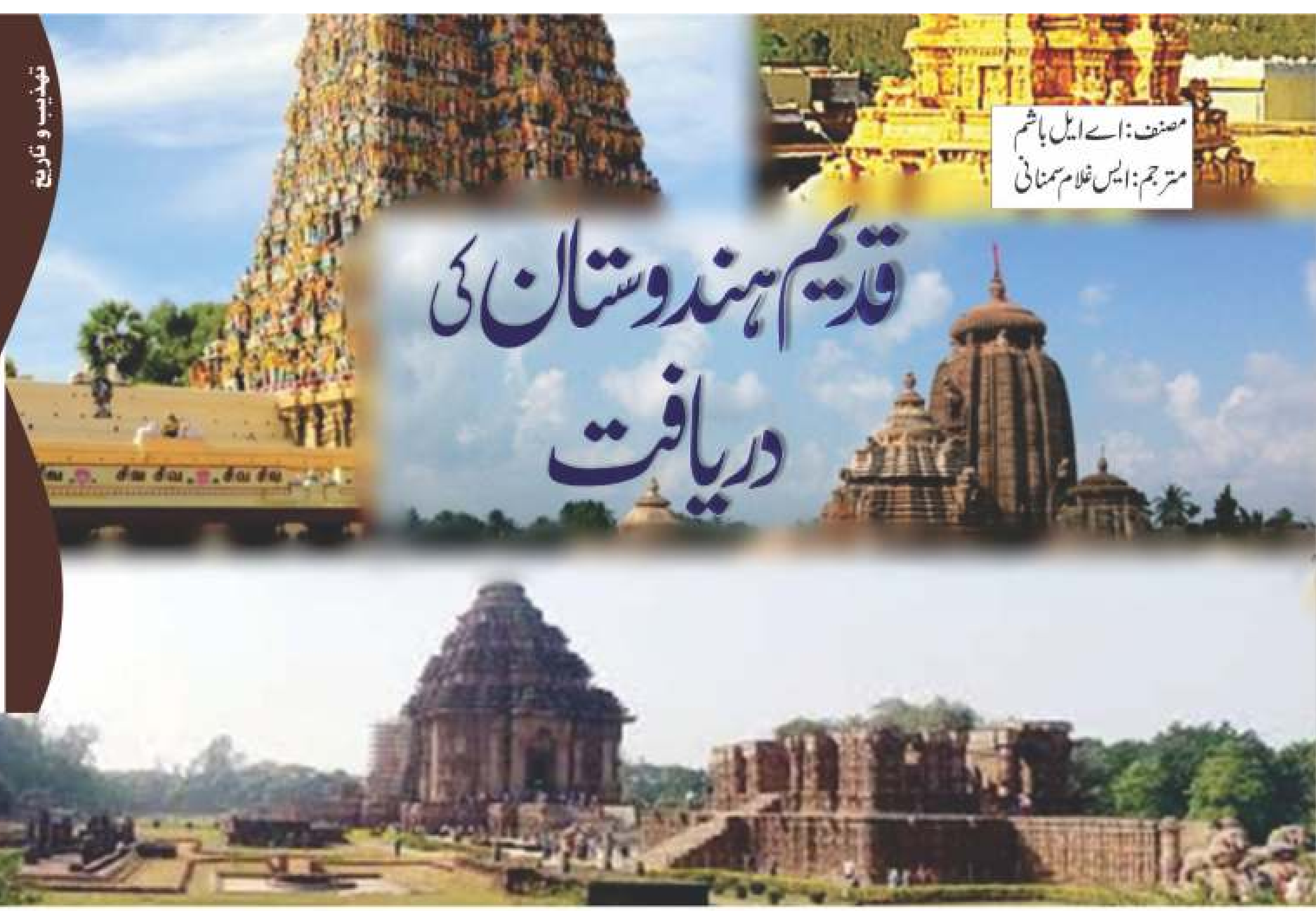

مصنف: اے ایل باشم
مترجم: ایس غلام سمنانی

قدیم ہندوستان کی دریافت

ہندوستان کی قدیم تہذیب مصر، عراق و عرب اور یونان کی تہذیبوں سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس کی روایات اس وقت تک مسلسل برقرار رہی ہیں، ماہرین آثار قدیمہ کی آمد سے قبل مصر یا عراق کے کاشتکار کو اپنے آبا واجداد کے تمدن کا کوئی علم نہیں تھا اور یہ بھی مشکوک ہے کہ اس کا یونانی ہمعصر بھی قدیم ایتھنس کی شان و شوکت کے متعلق خواب جیسے خیالات کے علاوہ بھی کچھ رکھتا تھا، دونوں ہی ملکوں میں ماضی سے تقریباً مکمل انقطاع رہا، برعکس اس کے یورپ کے جو سیاح ابتدا میں ہندوستان آئے وہ ایک ایسے تمدن سے روشناس ہوئے جسے اپنی قدامت کا پورا شعور تھا۔ یہ ایک ایسا تمدن تھا جسے اپنی قدامت کے سلسلے میں غلو تھا اور جس کو یہ غرہ تھا کہ اس میں کئی ہزار سال سے کوئی بھی اصولی تبدیلی نہیں واقع ہوئی ہے آج بھی ان قصوں اور کہانیوں میں جو کہ معمولی سے معمولی ہندوستانی جانتا ہے ایسے خیالی سرداروں کے نام ملتے ہیں جو تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح میں رہے ہیں اور راسخ العقیدہ برہمن اپنی روزانہ کی عبادات میں ایسی مناجاتیں پڑھتا ہے جو اس سے بھی پہلے منظوم کی گئی تھیں، دراصل ہندوستان اور چین دنیا میں قدیم ترین مسلسل تمدنی روایات رکھتے ہیں، اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر تک یورپ کے لوگوں نے ہندوستان کے قدیم ماضی کا مطالعہ کرنے کے سلسلے میں کوئی خاص کوشش نہ کی اور اس کی ابتدائی تاریخ کا علم ان کو صرف یونانی اور لاطینی مصنّفین کی تصانیف کے مختصر اقتباسات سے ہوتا تھا۔ اس جزیرہ نما میں صرف چند لگن رکھنے والے مبلغین نے معاصر ہندوستانی زندگی کی گہری واقفیت اور یہاں کی بولیوں پر بھرپور قدرت حاصل کی مگر انھوں نے بھی حقیقتاً کوئی کوشش ان لوگوں کے تمدن کے تاریخی پس منظر کو سمجھنے کی نہیں کی جن میں وہ تبلیغ و اشاعت کا کام کر رہے تھے۔ انھوں نے اس تمدن کو اس کی ظاہری ہیئت کے بموجب قبول کر لیا اور اس کو بہت قدیم اور غیر معتبر سمجھ لیا۔ ان کا ہندوستان کے ماضی کا مطالعہ صرف اس طریقۂ غور و فکر تک محدود تھا جو کہ ہندوستانیوں کو نوح کی اولاد اور انجیل مقدس کی معدوم سلطنتوں سے وابستہ کر دیتا تھا۔

دریں اثنا چند مسیحیوں نے ہندوستان کی کلاسیکی زبان سنسکرت پر قدرت کاملہ حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ان میں سے فادر ہینکسلڈن نے جنھوں نے 1699 سے لے کر 1732 تک مالابار میں کام کیا۔ پہلی سنسکرت قواعد کی کتاب ایک یورپی زبان میں ترتیب دی جو اگرچہ مخطوطے کی شکل ہی میں رہی لیکن اس کا استعمال اس کے بعد والوں نے کیا۔ دوسرا نام ہے فادر کورٹا وکا جو کہ اول طالب علم ہے جس نے کہ سنسکرت اور دوسری یورپی زبانوں کے درمیان ایک ہم رشتگی کا پتہ لگایا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندوستان کے برہمن جافیت کے لڑکوں کی اولاد ہیں جس کے بھائی مغرب کی طرف ترکِ سکونت کر کے چلے گئے تھے، بایں ہمہ ان یسوعیوں نے اپنے مطالعہ کے باوجود ہندوستان کے ماضی سے کوئی حقیقی واقفیت نہیں حاصل کی، علم الہند کی بنیادیں آزادانہ طور پر ہندوستان کے ایک دوسرے حصے میں دوسرے ہاتھوں کے ذریعے رکھی گئیں۔

1783 میں اٹھارہویں صدی عیسوی کے ذہین ترین انسانوں میں سے ایک شخص سر ولیم جونز (1746 تا 1794) کلکتہ میں سپریم کورٹ کے جج کی حیثیت سے آیا، اس زمانہ میں وارن ہسٹنگز، ہندوستان کا گورنر

جنرل تھا جو خود بھی مسلم اور ہندو دونوں ہی تمدنوں سے گہرا تعلق خاطر رکھتا تھا۔ جونز ایک ایسا ماہر السنہ تھا جو عبرانی، عربی، فارسی اور ترکی کے ساتھ ساتھ پہلے ہی سے اہم تر یورپی زبانوں کو جانتا تھا، مزید برآں اس نے اس نامکمل مواد کی مدد سے جو اس زمانہ میں یوروپ میں میسر آسکتا تھا۔ چینی زبان کی شدبد بھی حاصل کر لی تھی، ہندوستان آنے سے قبل اس نے فارسی اور دیگر یورپی زبانوں کا باہمی رشتہ سمجھ لیا تھا۔ اس نے اٹھارہویں صدی عیسوی کے اس متشدد نظریہ کو مسترد کر دیا کہ یہ ساری زبانیں عبرانی سے نکلی ہوئی ہیں جو منارہ بابل میں مسخ ہو گئیں، اس متشدد عقیدہ کی بجائے جونز نے یہ نیا خیال ظاہر کیا کہ فارسی اور یورپی زبانیں ایک ایسی مشترکہ زبان کے بطن سے وجود میں آئی ہیں جو عبرانی نہیں ہے۔ ان معدودے چند انگریزوں میں سے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے بنگال کا نظم و نسق انجام دیتے تھے، صرف ایک شخص چارلس ولکنس (1749 تا 1836) ہی ایک ایسا فرد ہے جس نے کسی نہ کسی طرح سنسکرت سیکھ لی، ولکنس اور بنگالی پنڈت دوستوں کی مدد سے جونز نے اس زبان کو سیکھنا شروع کیا، یکم جنوری 1784 کو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کا قیام جونز کی تحریک پر عمل میں آیا اور وہ خود ہی اس کا صدر ہوا، اس سوسائٹی کے جرنل مسمّی 'ایشیاٹک ریسرچز' میں ہندوستان کے ماضی کو عدم سے وجود میں لانے کے پہلی مرتبہ صحیح اقدامات کیے گئے، نومبر 1784 میں انگریزی میں ایک سنسکرت تصنیف کا براہِ راست پہلا ترجمہ ولکنس کی 'بھگوت گیتا' مکمل ہوا۔ 1787 میں ولکنس نے دوسرا ترجمہ 'ہتوا پدیش' کا پیش کیا۔ اس کے بعد 1789 میں ولکنس نے کالی داس کی شکنتلا کا ترجمہ کیا جس کی بیس سال کے عرصے میں پانچ انگریزی اشاعتیں ہوئیں، اس کے بعد 1792 میں انھوں نے 'گیت گووند' کا ترجمہ کیا اور پھر منو کی کتاب قانون کا (یہ جونس کے مرنے کے بعد 1794 میں انسٹی ٹیوٹس آف ہندولاٗ کے نام سے شائع ہوئی) اس کے بعد ایشیاٹک ریسرچز میں متعدد کم اہمیت والے تراجم شائع ہوئے۔

اس طرح جونز اور ولکنس صحیح معنوں میں علم الہند کے ابوالآبا تھے، کلکتہ میں ان کی پیروڈی ہنری کول بروک (1765 تا 1837) اور ہوریس ہیمین ولسن (1789 تا 1860) نے کی، ان رہنماؤں کی مولفات میں فارسی کے ایک فرانسیسی عالم انکوتل دووپران (Anqwill Dupphon) کی خدمات کو بھی شامل کرنا ضروری ہے جس نے 1786 میں سترہویں صدی عیسوی کے ایک فارسی نسخے سے چار اپنشدوں کا ترجمہ شائع کیا، مکمل مخطوطہ کا ترجمہ جو پچاس اپنشدوں پر مشتمل ہے، 1801 میں منظر عام پر آیا۔

ان تراجم کی بنا پر یوروپ میں سنسکرت ادب سے دلچسپی بڑھنا شروع ہوئی، 1795 فرانسیسی جمہوریہ کی سرکار نے اکولی ڈس لینگس اور پینتالیس ورٹیس (Ecoledes Langues Orien Tales Vivantes) قائم کی اور وہاں الگزنڈر ہملٹن (1762 تا 1824) جو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے بانی اراکین میں تھا اور جو 1803 میں پیس آف ایمنس (Peac of Aiens) کے خاتمے پر فرانس میں پیرول پر مقید تھا، یورپ میں سنسکرت کی تعلیم دینے والا پہلا شخص تھا۔ ہملٹن ہی سے پہلے جرمنی نژاد سنسکرت داں فریڈرخ شلگل نے یہ زبان سیکھی، 1814 میں پہلی بار کالج ڈفرانس (College Defrance) میں سنسکرت کی پہلی یونیورسٹی چیئر قائم ہوئی اور اس پر لیونا رووی چیزی متمکن رہے جب کہ 1818 سے جرمنی کی بڑی دانش گاہوں نے پروفیسر شپ بھی قائم کرنا شروع کر دی، برطانیہ میں سب سے پہلے سنسکرت کی تعلیم 1805 ہرٹ فورڈ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تربیتی کالج میں دی گئی۔ سنسکرت کی سب سے پہلی انگلش چیر بوٹن پروفیسر شپ آکسفورڈ میں قائم ہو کر 1832 میں پر ہوئی جب یہ اعزاز ایچ ایچ ولسن کو بخشا گیا جو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کا اہم رکن رہ چکا تھا، اس کے بعد متعدد چیرز لندن، کیمبرج اور ایڈنبرا میں قائم ہوئیں اور پھر یوروپ اور امریکہ کی مختلف دانش گاہوں میں قائم ہوئیں۔

1816 میں بویریا کے ایک باشندے فرانز بوپ (1791 تا 1867) نے سرولیم قونز کے اشارات کی بنیاد پر سنسکرت اور یورپ کی کلاسیکی زبانوں کے مشترکہ سرچشمے کا پتہ لگانے میں کامیابی حاصل کی اور اس طرح تقابلی لسانیات ایک علیحدہ علم ہو گیا، 1821 میں فرانسیسی سوسائٹی ایشیاٹک (Societe Asiatique) کا قیام پیرس میں عمل میں آیا۔ اس کے دو سال بعد لندن میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی قائم ہوئی۔ اس آغاز سے قدیم ہندوستانی ادب کی تدوین و مطالعہ کا کام پوری انیسویں صدی عیسوی میں پھیل گیا، انیسویں صدی عیسوی کے یورپ میں ماہرین علم الہند کا غالباً سب سے بڑا کارنامہ وہ ضخیم سنسکرت جرمن لغت ہے جس کو عام طور پر 'سینٹ پیٹرسبوگ لکسی کان' کہا جاتا ہے اور جو کہ جرمن علما اوٹو بوتھ لنگ اور ریوڈالف راتھ کی مرتبہ ہے اور جس کو روسی امپریل اکادمی آف سائنسز جستہ جستہ 1852 سے لے کر 1875 تک شائع کرتی رہی، سنسکرت کے مطالعہ میں انگلستان کا عظیم ترین اضافہ رگ وید کی شاندار اشاعت اور 'مشرق کی مقدس کتابیں' Sacred Books of The East کے ثقہ مخشی تراجم کے سلسلوں کی اشاعت ہے۔ ان دونوں ہی کی تدوین عظیم جرمن نژاد سنسکرت کے عالم فریڈرخ میکس ملر (1823 تا 1900) نے جس نے اپنی کارکردگی کی زندگی کا بیش ترین حصہ آکسفورڈ میں تقابلی لسانیات (Comparative Philogy) کے پروفیسر کی حیثیت سے گزارا۔

دریں اثنا قدیم ہندوستانی تمدن کا مطالعہ ایک دوسری سمت میں بڑھ رہا تھا، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے ابتدائی سارے کام تقریباً مکمل طور پر ادبی اور لسانی تھے اور انیسوی صدی کے زیادہ تر ماہرین علم الہند مخطوطات پر کام کر رہے تھے، بہرحال انیسویں صدی عیسوی کی ابتدا میں بنگال سوسائٹی نے اپنی تھوڑی بہت توجہ ہندوستان کے ماضی کی ماڈی یادگاروں کی جانب منعطف کرنا شروع کی کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے پیمائش کنندگان نے مندروں، غاروں اور خانقاہوں کے متعلق اطلاعات فراہم کیں، ساتھ ہی ساتھ کچھ پرانے سکے اور ان مخطوطات کے مندرجات کی نقول پیش کیں جو بہت پہلے دستبرد زمانہ کی نذر ہو گئے تھے، موجودہ مخطوطات کی تعبیر کی مدد سے پرانے مخطوطات کی تعبیر بھی بتدریج ہونے لگی یہاں تک کہ 1837 میں ایک ذہین و ہوشیار مبتدی یعنی کلکتہ کی ٹکسال کے ایک افسر اور ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے سکریٹری جیمز پرنسپ نے سب سے ابتدائی براہمی دور کے ایک مخطوطہ کی تشریح و تعبیر کیے اور شہنشاہ اعظم اشوک کے پتھروں پر کندہ فرمانوں کو پڑھنے میں کامیابی حاصل کی، اس تعبیر و تشریح کے میدان میں پرنسپ کے ساتھیوں میں راول انجینئرز کا ایک نوجوان افسر الگزنڈر کننگھم تھا جو ہندوستانی آثار قدیمہ کے ابوالآبا کہا جاتا ہے، 1831 میں

ہندوستان آنے کے بعد کننگم کو اپنے فوجی فرائض ادا کرنے کے بعد جو بھی وقت ملتا تھا اس کا ایک ایک لمحہ اس نے قدیم ہندوستان کی مادی یادگاروں کے مطالعہ کے لیے وقف کردیا، جب 1862 میں ہندوستانی حکومت نے آرکیالوجیکل سروے کی ایک آسامی قائم کی تو اس پر کننگم کا تقرر ہوا۔1885 میں اپنی سرکاری خدمات سے سبکدوش ہونے کے وقت تک اس نے مکمل یکسوئی کے ساتھ ہندوستان کے ماضی کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی، اگر چہ اس نے کوئی حیرت انگیز دریافتیں نہیں کیں اور اگر چہ موجودہ آثار قدیمہ کے معیار کے

مطابق ان کا طریقہ کار غیر ترقی یافتہ اور بھدا تھا لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ وسر ولیم جونز کے بعد علم الہند اس میدان کے کسی اور رہ پیما کے مقابلہ میں جنرل سرالگز نڈر کننگم کا زیادہ ممنون ہے، کننگم کو متعدد دوسرے رہنماؤں کی مدد حاصل تھی اور اگر چہ حکومت کی ناکافی اور قلیل امداد کی وجہ سے آرکیالوجیکل سروے کی سرگرمیاں انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں تقریباً ختم ہوگئیں لیکن پھر بھی 1900 تک بہت سی عمارات کا سروے کیا جاچکا تھا اور بہت سے کتبات پڑھے جاچکے تھے اور ان کا ترجمہ بھی ہوچکا تھا۔

صرف بیسویں صدی عیسوی میں ہی آثار قدیمہ کی کھدائی کا کام بڑے پیمانے پر شروع ہوا، ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن کی ذاتی دلچسپی کا ممنون ہونا چاہیے کہ 1901 میں آرکیالوجیکل سروے کی اصلاح ہوئی اور اس میں وسعت پیدا کی گئی اور ایک نوجوان ماہر آثار قدیمہ جان (جو بعد 'سر جان' ہوا) مارشل کو اس کا ڈائرکٹر جنرل مقرر کیا گیا، ہندوستان کا طول وعرض رکھنے والے ایک ملک کے لیے محکمۂ آثار قدیمہ اب بھی افسوسناک حد تک مختصر اور مفلس تھا لیکن مارشل نے متعدد ماہر معاونین کی خدمات حاصل کیں اور اس کے پاس کھدائی کے لیے اس پیمانہ پر مالی وسائل تھے جو اس سے قبل نہیں تھے، پہلی بار ہندوستان کے قدیم شہروں کے نشانات منصۂ شہود پر آنے لگے، علم آثار قدیمہ نے اپنا کام سروینگ (Surveying) اور قدیم یادگاروں کے تحفظ سے ممیز ہوکر صحیح معنوں میں شروع کردیا،

سر جان مارشل کی سربراہی میں آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کی عظیم ترین فتح بلاشبہ تہذیب سندھ کی دریافت تھی، ہندوستان کے قدیم ترین شہروں کی پہلی علامات کننگم نے دریافت کیں جنھوں نے عجیب وغریب ناقابل شناخت مہریں پنجاب میں ہڑپا کے مضافات میں پائیں،1922 میں آرکیالوجیکل سروے کے ایک ملازم آر ڈی بنرجی نے مزید کچھ مہریں سندھ میں موہن جوداڑو کے مقام پر پائیں اور اس امر کو تسلیم کیا کہ یہ عظیم تر قدامت ماقبل آریائی تہذیب کی یادگار ہیں، سر جان مارشل کے زیر ہدایت 1924 سے لے کر ان کی سبکدوشی کے وقت یعنی 1931 تک ان مقامات کی باقاعدہ کھدائی ہوتی رہی، کھدائی کا کام مالی عسرت اور دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے معرض التوا میں پڑ گیا، لیکن جنگ کے معاً بعد سر آر، ای، ماریٹر وہیلر کی مختصر الوقت سربراہی میں ہڑپا کے مقام پر مزید اہم دریافتیں ظہور پذیر ہوئیں، اگر چہ یہ مقامات اب بھی کسی طور سے پوری طرح صاف نہیں کیے جاسکے ہیں۔

ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے، بہت سے مٹی کے تودے جن کی کھدائی نہیں ہوئی ہے، ہندوستان کے ماضی کے تاریک گوشوں پر کافی روشنی ڈال سکتے ہیں اور اب بھی بہت سے نہایت ہی اہم نادر مخطوطات دور رس کتب خانوں میں کرم خوردہ ہورہے ہیں، ہمیں ہندوستان، پاکستان اور لنکا ایسے غریب ملک ہیں جنھیں بری طرح سے مالی امداد کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنے غریب عوام کے معیار زندگی کو بلند کرسکیں لیکن اس وقت بھی جو کچھ وسائل ان ممالک کو فراہم ہیں ان ممالک کے محکمہ جات آثار قدیمہ پورے طور پر اس بات کی کوشش کررہے ہیں کہ اپنے ماضی کے رخ سے نقاب اٹھائیں۔

پچھلی صدی عیسوی میں خود ہندوستانیوں نے بھی بہت سے قابل قدر کارنامے انجام دیے، بالخصوص سنسکرت داں اور ماہر علم کتبات ڈاکٹر بھاؤداجی، ڈاکٹر بھگوان لال اندراجی، ڈاکٹر راجندر لال مترا اور عظیم سر آر، جی، بھنڈارکر، اس اعتبار سے علم الہند کے ضمن میں پہلی ابتدا خود ہندوستانیوں کی طرف سے ہوئی۔ ہند کے ماہرین اس وقت بڑی تیزی سے عظیم مہابھارت کی پہلی تنقیدی اشاعت میں مصروف ہیں اور انھوں نے ضخیم پونا سنسکرت لغت پر کام شروع کردیا ہے جو مکمل ہونے کے بعد ساری دنیا میں غالباً علم لغت پر سب سے بڑا کام ہوگا، اس وقت محکمۂ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر جنرل ایک ہندوستانی (ڈاکٹر اے گھوش) ہیں اور آج ایک یوروپی ماہر علم الہند اہل ہند کا مددگار اور دوست نقاد کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ ایسے وقت میں جب کہ ایشیا میں ایک صدی اور اس کے نصف پر یورپی تسلط کے خلاف ردعمل ہورہا ہے اور ایک نیا تمدن جو مشرق و مغرب کے تمدنی وتہذیبی عناصر کا ایک مرکب ہوگا جنم لے رہا ہے، ایک یورپی طالب علم علم الہند کے میدان میں اپنا مفید کردار ادا کرسکتا ہے۔

■

ماخذ: ہندوستان کا شاندار ماضی، **مصنف:** اے ایل باشم، **مترجم:** ایس غلام سمنانی، **سنہ اشاعت:** 1982، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مرزا جعفر حسین

لکھنؤ کے عمارات و باغات

لکھنؤ کو باغوں اور مرغزاروں کا شہر کہا جاتا تھا۔ فرمانروایانِ اودھ کو خوش نما باغات لگانے اور بلند و بالا، حسین و جمیل، مستحکم و استوار عمارتیں بنوانے کا بہت شوق تھا۔ آصف الدولہ نے لکھنؤ آتے ہی اپنے عالیشان محل موسومہ 'دولت خانہ' میں اقامت فرمائی تھی۔ یہ محل مچھی بھون قلعہ کے نزدیک تیار کرایا گیا تھا۔ مچھی بھون کا قلعہ مسمار ہو گیا لیکن 'دولت خانہ' در و دیوارِ شکستہ کی شکل میں اب تک موجود ہے اور شیش محل کے نام سے موسوم ہے۔ اس محل کی عظمتِ پارینہ کے نشانات بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک موجود تھے جن کو دیکھنے اور نوابانِ شیش محل کے درباروں میں شرکت کرنے کا شرف صدہا مرتبہ راقم کو حاصل ہوا تھا۔ نوابانِ شیش محل کے مورثِ اعلیٰ نواب حکیم مہدی کو غازی الدین حیدر کے دربار میں تقرب حاصل تھا۔ ان کا محل چار باغ میں اس مقام پر تھا جہاں آج ریلوے اسٹیشن موجود ہے۔ اس اسٹیشن کی تعمیر کے لیے حکیم مہدی کی املاک حاصل کی گئی تھی اور بالعوض شیش محل دیا گیا تھا۔ یہ محل دولت خانۂ آصفی کا ایک حصہ تھا۔ اس کے کھنڈرات اب بھی پرانی عظمتوں کی یاد دلاتے ہیں اور نوابانِ شیش محل کے ورثا اسی میں آباد ہیں۔ ذی مقدرت حضرات اپنے اپنے مقام ہائے سکونت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

آصف الدولہ کو سیر و شکار کا شوق تھا۔ اس ذوق کی آسودگی کے لیے انھوں نے بیا پور میں ایک محل بنوایا تھا اور چنہٹ میں ایک کوٹھی موسومہ نزہت بخش تعمیر کرائی تھی۔ بیسویں صدی کے اوائل تک ان عمارتوں کے آثار موجود تھے۔ امتدادِ زمانہ سے ان پر کیا گزری اور اب کیا حالت ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ اس جلیل القدر حکمران کی ممتازِ زمانہ یادگاریں بڑا امام باڑہ اور رومی دروازہ اب تک موجود ہیں۔ آصف الدولہ اپنے اسی امام باڑے میں مدفون ہیں اور ان کی قبر اب تک زیارت گاہ بنی ہوئی ہے۔ پچاس ساٹھ برس قبل تک ہم لوگ برابر وکٹوریہ پارک گھومنے کے لیے جاتے تھے اور اسی دوران اس امام باڑے کی زیارت کے لیے رومی دروازے سے گزرتے ہوئے جایا کرتے تھے۔ یہ شوق زیارت اس لیے زیادہ تھا کہ اس زمانے میں امام باڑے پر زبوں حالی طاری ہونا شروع ہو گئی تھی۔ جدید اصلاحات کے بعد اب اس کی حالت سدھر گئی ہے اور یہ عدیم المثال عمارتیں اپنی فنکاری و صنعت کاری کی عظمتوں سمیت برقرار ہیں۔ آصف الدولہ کے زمانے کا ایک باغ موسومہ 'عیش باغ' بھی تھا جس کی تعریفیں راقم نے اپنے بزرگوں سے سنی تھیں لیکن اب وہاں ایک بڑا محلہ آباد ہے اور اسی کے وسط میں چھوٹی لائن کا ریلوے اسٹیشن تعمیر ہے جو ایک زمانے میں بڑی اہمیت کا مالک تھا۔ یہ اہمیت اس ریلوے لائن کے چار باغ تک بڑھ جانے کے سبب سے بہت کم ہو گئی ہے۔

اسی زمانے کی یادگاریں لا مارٹینر کی عمارتیں بھی ہیں جن میں مارٹن صاحب کی کوٹھی عجائبات میں شمار کی جاتی تھی۔ آصف الدولہ کو یہ عمارات اتنی پسند آئیں کہ انھوں نے فی الفور خریداری کا ارادہ کر لیا تھا لیکن قیمت کے سلسلے میں ہنوز گفتگو جاری تھی کہ نواب کا انتقال ہو گیا۔ مارٹن کی یادگار لا مارٹینر کالج انگریزوں کے زمانے میں اپنے شباب پر تھا اور بڑی شہرت کا مالک تھا۔ عمارتوں کی داشت و پرداخت بھی توجہ سے ہوتی تھی لیکن پہلی سی توجہ اب نہیں ہے۔

سعادت علی خاں نے اپنے دورِ اقتدار میں غالباً تعداد کے اعتبار سے بہت زیادہ عمارات بنوائی تھیں خود اپنی اقامت کے لیے فرحت بخش اور حیات بخش کوٹھیاں تعمیر کرائی تھیں جو اب بھی چھوٹی چھتر منزل اور موجودہ ہائی کورٹ کی عمارت کے درمیان موجود ہیں۔ لال بارہ اپنے دربار کے لیے تعمیر کرائی تھی اور ٹیڑھی کوٹھی انگریز ریذیڈنٹ کی سکونت کے لیے بنوائی تھی۔ غدر کے بعد یہ عمارات بھی انگریزی حکومت کے قبضے میں آ گئی تھیں فرحت بخش اور متعلقہ عمارات میں اب محکمہ صحت کے ڈائرکٹر کا مرکز اور دیگر دفاتر ہیں، ٹیڑھی کوٹھی میں چیف کورٹ آف اودھ کے چیف جج رہا کرتے تھے لیکن اب وہاں ٹرانسپورٹ کے دفاتر ہیں اور پرانی ہیئت بالکل نظر نہیں آتی۔ ان عمارات کے علاوہ سعادت علی خاں نے دریا پار دل آرام کوٹھی، دلکشا کوٹھی تعمیر کرائی تھی اور موتی محل کی اصل عمارت بھی انھیں کی حیات میں مکمل ہو چکی تھی۔ دل آرام کوٹھی اور دلکشا کوٹھی کے نمایاں آثار میرے عنفوان شباب تک موجود تھے۔ ممکن ہے کہ دلکشا میں اب بھی کچھ کھنڈرات نظر آ جائیں لیکن اب وہاں پورا محلہ آباد ہے اور ایک بڑی کالونی بن گئی ہے۔ موتی محل کی تکمیل غازی الدین حیدر نے کر دی تھی اور یہ مقام اب بہت اچھی حالت میں ہے۔ عمارات میں اضافے ہوئے ہیں اور باغ بھی اچھی حالت میں ہے تو اس کا رقبہ بہت کم ہو گیا ہے۔

متذکرہ بالا عمارات کے علاوہ کوٹھی نور بخش اور خورشید منزل بھی سعادت علی خاں ہی کی طرف منسوب تھیں اور چار باغ بھی انھیں کا لگوایا ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں ایک دوسرے سے متصل چار باغ تھے اسی لیے یہ نام دیا گیا۔ اودھ کے حکمرانوں کو اپنے گھوڑوں کے لیے بھی عالیشان عمارات بنوانے کا ذوق تھا۔ سعادت علی خاں نے چوپڑ اصطبل بنوایا تھا جو بڑی شہرت کا مالک تھا۔ واجد علی شاہ کے دور میں سلاخوں والا اصطبل مشہور تھا۔ غدر کے بعد اسی اصطبل میں دیوانی کچہری قائم ہوئی تھی جہاں مجھے برسوں وکالت کرنے کا شرف حاصل تھا۔ اب اس عمارت کا کوئی نشان باقی نہیں ہے اور نئی عمارت بن کر قریب قریب تیار ہو چکی ہے۔

سعادت علی خاں نے اپنے مقبرہ کا کوئی انتظام اپنی زندگی میں نہیں کیا تھا۔ وفات کے بعد وہ اسی علاقے میں مدفون ہوئے جہاں ان کی بیگم کا مزار اب تک چھتر منزل کے حدود میں موجود ہے۔ یہ عمارت ان کے جانشین غازی الدین حیدر نے بنوائی تھی۔ یہ پہلے حکمران تھے جنھوں نے دلی کی سلطنت کا قلادۂ اطاعت دور کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ ان کی بہترین اور ممتازِ زمانہ تعمیر شاہ نجف ہے جو حضرت علیؑ کے مزارِ مبارک کی اصلی شبیہ ہے۔ بادشاہ اور ان کی بیگم اسی متبرک

عمارت میں مدفون ہیں اور خود انھیں کے عطیات کی بدولت شاہ نجف اب بھی مقتدر حیثیت کا مالک ہے۔ غازی الدین حیدر کے بعد نصیر الدین حیدر سریر آرائے سلطنت ہوئے تھے انھوں نے حضرت گنج کے علاقے کی بنیاد ڈالی تھی اور خود اپنے لیے ایک کربلا ڈالی گنج پار میں بنوائی تھی جہاں وہ مدفون ہیں۔ یہ کربلا بہت بڑے رقبے میں واقع ہے لیکن اس کی ترقی وفلاح کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ حالات روز بروز خراب ہوتے رہے تھے۔ موجودہ صورت حال بہر حال بہتر ہے۔

آخری تین تاجدار محمد علی شاہ، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ تھے۔ محمد علی شاہ کا تعمیر کردہ امام باڑہ جو چھوٹا امام باڑہ کے نام سے موسوم ہے اور جہاں وہ خود مدفون ہیں ایک انتہائی اور سجی سجائی دُلہن کہلانے کا مستحق ہے۔ انھوں نے اپنی حیات میں اس امام باڑے کی بقا اور فلاح کا اتنا مکمل انتظام کر دیا تھا کہ اُس کا کاروبار بڑے اور منظم پیمانے پر اب تک برقرار ہے۔ زمانے کی ستم شعاریوں نے بہت کچھ دخل اندازی کر دی ہے لیکن پھر بھی اس امام باڑہ کی عظمت بہت بڑی حد تک برقرار ہے۔ البتہ محل وقوع میں نظارگی کا جو حسن و جمال بادشاہ نے اس امام باڑے میں پیدا کرنا چاہا تھا وہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا اور ان کا انتقال ہو گیا۔ اس امام باڑے کے ایک جانب عالیشان اور بہت خوبصورت جامع مسجد ہے۔ بادشاہ نے دوسری جانب ست کھنڈا تعمیر کرانے کا ارادہ کیا تھا۔ سات منزل کی ایک کے اوپر دوسری منزل اور ساتویں منزل کے اوپر عالیشان قبہ بن جانے کے بعد امام باڑے کا حسن دوبالا ہو جاتا لیکن چند منزلوں سے زیادہ عمارت نہیں بن سکی۔ اس کے منہدم کھنڈرات اب تک موجود ہیں۔ بعض لوگوں کو ست کھنڈے کا نام بھی یاد ہے لیکن اس کے معرضِ وجود میں آنے کا حال دنیا بھول چکی اور غالباً آثار منہدم ہو جانے کے بعد ست کھنڈے کا نام بھی فراموش ہو جائے گا۔

امجد علی شاہ کی زیادہ تر توجہ حضرت گنج کے علاقے پر مبذول رہی۔ وہاں کی پرانی عالیشان عمارتیں انھی کی کرم گستری کا نتیجہ تھیں اور سبطین آباد کا ایسا عظیم المرتبت علاقہ انھیں کی بدولت معرض وجود میں آیا تھا۔ یہاں ان کی ابدی خواب گاہ ہے جس کا احترام کرتے ہوئے اُن کے بعد ان کے جانشین واجد علی شاہ نے یہ تمام عمارات بنوائی تھیں جن کے داخلے کا عظیم الشان صدر دروازہ اب تک مال روڈ کے اوپر اپنی عظمت پارینہ کی یاد دلاتا ہے لیکن گذشتہ ساٹھ ستر برس میں پے در پے جو شرمناک و عبرتناک واقعات و حالات رونما ہوئے وہ سبطین آباد کے حالِ زار پر ہم کو خون کے آنسو رلاتے ہیں اور کہنا پڑتا ہے کہ اچھا ہوا واجد علی شاہ اس سرزمین پر دفن نہیں ہوئے۔ اس آخری تاجدار نے چھتر منزل اور قیصر باغ کی عمارات اپنی مایۂ ناز یادگاریں چھوڑی تھیں۔ ایک کو چھوٹی چھتر منزل کہا جاتا ہے کہ غفلت و جہالت کی بدولت منہدم ہو گئی۔ اصلی چھتر منزل انگریزوں کے دور میں یونائیٹڈ سروس کلب کے استعمال میں آتی تھی لیکن اب فلاح عامہ کا کاروبار وہاں جاری ہے اور معالجات ایجاد کرنے کا مرکزی محکمہ کامیابی کے ساتھ تجربات میں مشغول ہے۔ قیصر باغ اپنی اصل چہار دیواری میں بہت کچھ کھو چکا ہے۔ اس کے شمالی اور جنوبی صدر دروازے ایک مدت قبل ختم ہو چکے تھے۔ اس کے چاروں طرف جو خوش نما اور دیدہ زیب راستے مشرقی انداز میں بنائے گئے تھے وہ ملیا میٹ ہو چکے ہیں۔ میری طالب علمی کے زمانے تک چھتر منزل سے قیصر باغ تک اور قیصر باغ کے مغربی پھاٹک کی سمت بھی نیز مشرق میں مینا بازار گیٹ تک دو رویہ مہندی کے درختوں کی جھاڑیاں موجود تھیں جو خوش نمائی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ نئی سڑکوں کی تعمیر میں ہمارا مشرقی انداز خوش نمائی فنا کے گھاٹ اتر گیا۔ قیصر باغ کی عمارتیں اودھ کے تعلق داروں کو تقسیم کر دی گئی تھیں اس لیے محفوظ اور اپنی اصلی رنگ و صورت میں ہیں۔ وسطِ قیصر باغ میں سفید بارہ دری ہے جس کا نام بادشاہ نے ''قصر عزا'' رکھا تھا یہاں تعلق دارانِ اودھ کی انجمن کا دفتر ہے اور بڑی حد تک اچھی حالت میں ہے۔ لیکن میں نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا کہ وہ چھوٹی سنگ مرمر کی سفید بارہ دری جو اب بنارسی باغ میں نصب ہے ابتداءً قیصر باغ ہی میں تھی اور جو چاروں پتھر والے پریوں کے مجسمے وہاں ہیں وہ بھی اسی بارہ دری کے چاروں جانب نصب تھے۔ واجد علی شاہ بیشتر راتوں کو موسم گرما میں اسی چھوٹی بارہ دری میں آرام فرما لیتے تھے۔ انتزاع سلطنت کے بعد راتوں کو بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو جاتے تھے اور آنے والے زار و قطار روتے تھے لہٰذا انگریزی حکومت نے اس بارہ دری کو بنارسی باغ منتقل کر دیا جہاں شہریوں کا پہنچنا دشوار ہو گیا تھا۔

شاہانِ اودھ سے متعلق مندرجہ بالا واقعات کا تاریخی پس منظر میں مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ آصف الدولہ کے بعد ان کے جانشینوں نے وسط لکھنؤ کے علاقوں کو ترقی دینے کی کوشش کی تھی اور آخری دور تک یہ توجہ مشرقی منزل تک پہنچ گئی تھی۔ پرانی آبادی بہر حال مغربی علاقوں ہی تک محدود رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ کی پرانی معاشرت کا اثر اب تک مغربی لکھنؤ میں بڑی حد تک موجود ہے۔

شہر کے باغات اور مرغزاروں کی تعداد انھیں ناموں تک ختم نہیں ہوتی جو متذکرہ بالا حالات میں پیش کیے گئے ہیں۔ میرے لڑکپن بلکہ عنفوان شباب تک عالم باغ، صفدر باغ، سندر باغ، بندریا باغ، ڈالی باغ، بنارسی باغ، سکندر باغ، کمپنی باغ اور دیگر چند باغات کا تفریح گاہوں میں شمار تھا اس زمانے میں رؤسا ،شرفا ،عوام اور تمام شہری علاوہ تاجروں اور دکانداروں کے شام کو ہوا خوری کے لیے نکلتے تھے۔ ہر محلے میں یا اس کے قریب کوئی بڑا باغ یا مرغزار تھا۔ آبادی بڑھی اور نئے محلے تعمیر ہوئے تو ان باغات کے نام پر محلے تعمیر ہو گئے۔ جیسے چار باغ، نظر باغ، عیش باغ، عالم باغ، صفدر باغ، سندر باغ، ڈالی باغ، بندریا باغ وغیرہ۔ بنارسی باغ میں زندہ عجائب گھر کھلا اور سکندر باغ میں محکمۂ نباتات قائم ہو گیا۔ بادشاہ باغ میں کیننگ کالج قائم ہوا۔ جس زمانے میں مجھے وہاں تعلیم حاصل کرنے کا شرف حاصل تھا ایک بڑے رقبے میں امرود وغیرہ کے باغات موجود تھے۔ لیکن اب ان کی جگہ عمارات تعمیر ہو گئی ہیں۔ اسی باغ میں ایک بارہ دری اور ایک عالیشان کوٹھی تھی جو کبوتر والی کوٹھی کہلاتی تھی۔ بارہ دری اندر اور باہر سے بہت خوبصورت تھی۔ اس پر اسی زمانے میں ادبار آنا شروع ہو گیا تھا۔ میرے زمانے میں یہاں علوم مشرقیہ کی تعلیم ہوتی تھی۔ بعد ازاں یہاں چار خانہ قائم ہو گیا تھا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے وجود میں آنے کے بعد پہلے وائس چانسلر کبوتر والی کوٹھی میں رہا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس کی شکل بدلی اور اب وہاں رجسٹرار کے دفتر سے متعلق کمرے تعمیر ہو گئے ہیں۔ گذشتہ پچاس برس میں دیکھتے دیکھتے پرانے طرز کے تمام باغ اور لالہ زار ختم ہو گئے اور نئے نئے پارک معرضِ وجود میں آ گئے ہیں۔ اس طرح ہماری مشرقی تہذیب کے ظاہری نمونے بھی اب شہر میں نظر نہیں آتے۔

■

ماخذ: قدیم لکھنؤ کی آخری بہار، **مصنف:** مرزا جعفر حسین، **دوسری اشاعت:** 2023، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

محمد شریف

عبدالغنی شیخ کے افسانوں میں لداخ کی تہذیب و معاشرت

اردو زبان وادب کے معروف محقق، تاریخ داں، افسانہ نگار، ناول نگار، انشاپرداز، سوانح نگار عبدالغنی شیخ مختصر علالت کے بعد 20 اگست 2024 کو سری نگر میں اس دار فانی سے دار بقا کی طرف کوچ کر گئے۔ان کی وفات واقعی یہاں کی ادبی دنیا کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے۔عبدالغنی شیخ کا نام اردو زبان وادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔وہ مقامی، ملکی اور بین الاقوامی سطح کے جانے مانے قلمکار اور درجنوں کتابوں کے مصنف کے ساتھ ساتھ ایک عظیم انسان بھی تھے۔ وہ جموں و کشمیر اور لداخ کی سرحدوں سے باہر بھی علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔انھوں نے اپنی پوری زندگی اردو کی بقا اور لداخی تہذیب کی بازیافت کے لیے وقف کردی تھی۔

عبدالغنی شیخ کی مختصر کہانیاں لداخ کے ثقافتی، سماجی اور سیاسی منظرنامے کو بڑے دلنشیں اور متاثر کن انداز میں پیش کرتی ہیں۔ان کی تحریریں عموماً شناخت، روایت اور تبدیلی جیسے موضوعات پر مبنی ہوتی ہیں، جن کے ذریعے لداخی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بہت گہرائی سے بیان کیا جاتا ہے۔عبدالغنی شیخ کی مختصر کہانیوں کے ذریعے نہ صرف لداخ کے ثقافتی ورثے کو محفوظ کیا گیا ہے بلکہ اسے وسیع دنیا کے سامنے پیش کیا گیا ہے، جس سے روایت اور جدیدیت کے درمیان پل بنایا گیا ہے۔عبدالغنی کے افسانوں کے تجزیے سے اس بات کا انکشاف بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے کتنی باریک بینی سے اپنے علاقے کی چھوٹی چھوٹی اور اہم باتوں کو پیش کر کے اردو زبان وادب کے قارئین کو اپنی تہذیب و معاشرت سے روشناس کرایا ہے۔

عبدالغنی شیخ 5 مارچ 1936 کو لداخ کے ضلع لیہہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام قادر شیخ اور والدہ کا نام ساجدہ بیگم تھا۔ابتدائی تعلیم لیہہ کے مقامی اسکول سے حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان بھی اسی اسکول سے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ جب 1951 میں اس اسکول کا درجہ مڈل سے ہائی اسکول کیا گیا تو وہ لیہہ ہائی اسکول کے پہلے میٹرک پاس طالب علم کہلائے۔اس کے بعد عبدالغنی شیخ نے کشمیر یونیورسٹی سے 1960 ادیب فاضل اور بی اے آنرس کے امتحانات امتیازی پوزیشن کے ساتھ پاس کیے۔ 1975 میں راجستھان یونیورسٹی سے ایم اے ہسٹری کی سند حاصل کی۔علاوہ ازیں انھوں نے انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونی کیشن دہلی سے صحافت میں پانچ ماہ کی ٹریننگ بھی حاصل کی۔

عبدالغنی شیخ نے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد ڈیڑھ ماہ کے لیے بطور کلرک کی نوکری اختیار کی اور پھر 1952 میں سرینگر میں ویٹرنری اسٹاک اسسٹنٹ کی ٹریننگ حاصل کرنے چلے گئے۔ وہاں ایک سال تک قیام کیا۔ 1954 میں انھوں نے اپنے کیریئر کا آغاز اینمل ہسبنڈری میں بحیثیت اسٹاک اسٹنٹ کیا۔

1958 کو عبدالغنی شیخ کا بطور ہیڈ ماسٹر ضلع لیہہ کے ایک گاؤں تمسگام میں تقرر ہوا جہاں انھوں نے تقریباً چار سال تک اپنے فرائض انجام دیے۔اس کے بعد لیہہ میں ان کا تبادلہ ہوا اور لیہہ اسکول میں ایک سال قیام کے بعد ان کی تقرری لیہہ کے مرکزی فیلڈ پبلسٹی محکمہ میں بطور فلیڈ پبلسٹی آفیسر ہوئی۔اس کے بعد انھوں نے 1970 میں پریس انفارمیشن بیورو سرینگر میں بطور انفارمیشن اسسٹنٹ جوائن کیا۔اس کے علاوہ وہ دوسرے عہدوں پر بھی فائزہ رہے۔20 نومبر 1992 قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر اسلامیہ پبلک ہائی اسکول لیہہ میں بطور پرنسپل کام کیا۔

عبدالغنی شیخ کو بچپن سے ہی علم وادب کا ذوق تھا اور بچپن سے مطالعہ ان کا مشغلہ بن چکا تھا۔ساتویں جماعت میں انھوں نے کچھ نظمیں لکھیں اور 'پیام تعلیم'

عبدالغنی شیخ کی مختصر کہانیاں لداخ کے ثقافتی، سماجی اور سیاسی منظرنامے کو بڑے دلنشیں اور متاثر کن انداز میں پیش کرتی ہیں۔ان کی تحریریں عموماً شناخت، روایت اور تبدیلی جیسے موضوعات پر مبنی ہوتی ہیں، جن کے ذریعے لداخی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بہت گہرائی سے بیان کیا جاتا ہے۔

میں پہلی بار ان کا لطیفہ چھپا جس سے استادوں کی طرف سے کافی داد ملی۔ 1957 میں عبدالغنی شیخ کی پہلی کہانی 'لوسر اور آنسو' ماہنامہ 'دیش' سرینگر میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ اسی سال لڑکیوں کے لیے ایک ڈراما 'جھانسی کی رانی' کے عنوان سے بھی لکھا۔ گاندھی جی کی صد سالہ برسی پر گاندھی جی کی حیات اور کارناموں پر ان کے پیش کردہ مسودے پر کلچرل اکادمی نے انھیں انعام سے نوازا۔ 1971 میں ان کی ایک اور کہانی 'مسکراہٹ' ہمارا ادب میں شائع ہوئی۔ جس کا بعد میں انگریزی اور ہندی میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔

عبدالغنی شیخ ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں وہ بہ یک وقت مورخ، تبصرہ نگار، سوانح نگار، خاکہ نگار، ناول نگار، افسانہ نگار، ادیب ہونے کے ساتھ فلسفہ تعلیم پر نظر رکھنے والے کی حیثیت سے ادبی دنیا میں جانے جاتے ہیں۔ ایک طرف انھوں نے اردو فکشن کو ایک نیا روپ دیا تو دوسری طرف لداخ کی تاریخ کو زندہ رکھنے میں اہم کارنامہ انجام دیا۔ جان محمد آزاد عبدالغنی شیخ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''عبدالغنی شیخ لداخ کی دشت و سنگ سنسان برفانی سرزمین کی پیداوار ہیں۔ آپ کا بچپن اور لڑکپن لیہہ اور اس کے آس پاس کے اسی ماحول میں گزرا۔ آپ نے زوجیلا کے اس پار رہنے والے جفاکش اور تیرہ نصیب لوگوں کے درد کو اپنے وجود میں تحلیل کیا اور اپنے افسانوں اور ناولوں میں اس کا بھرپور اظہار کیا۔''

(جان محمد آزاد: جموں وکشمیر کے اردو مصنفین، عبدالغنی شیخ، میکاف پرنٹرس دہلی، 2004، ص203)

عبدالغنی شیخ نے لداخ کے حوالے سے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں 'لداخ: تہذیب و ثقافت، لداخ کی سیر، لداخ محققوں اور سیاحوں کی نظر میں، دو راہا، زوجیلا کے آر پار، ایک ملک دو کہانی، وہ زمانہ، دل ہی تو ہے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اردو دنیا کو لداخ کی تاریخ، ادب، طرز معاشرت، رسم و رواج، رہن سہن سے واقف کرانے میں عبدالغنی شیخ نے اہم کردار ادا کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے گزشتہ آدھی صدی سے زیادہ مدت سے لداخ میں اردو ناول اور افسانے کی شمع روشن رکھی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے افسانے، ناول، تنقید، تاریخ، خاکے، ادبی اور علمی مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان کی تخلیقات اور مضامین اردو کے مختلف رسائل آجکل، شمع، بیسویں صدی، شاعر، بانو، اردو دنیا، ایوان اردو، ہمارے ادب، شیرازہ، تعمیر، جدید فکر و فن، سبق اردو، پمپوش، دیش وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں۔ جان محمد آزاد نے اپنی کتاب 'جموں وکشمیر کے اردو مصنفین' میں عبدالغنی شیخ کے بارے میں یوں تحریر کیا ہے:

''پچھلی ایک دہائی کے دوران عبدالغنی شیخ نے ادیب کے علاوہ لداخیات کے ایک مقتدر محقق کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کی ہے۔ اس دوران آپ کے افسانے اور کہانیاں ملک کے کثیر الاشاعت رسائل میں شائع ہوئیں۔ شمع (دہلی) میں آپ کے نصف درجن افسانے شائع ہوئے۔ آپ کے فن میں اب خون جگر کی نقش گری صاف جھلکتی ہے آپ کی اختصار پسندی اور قطعیت آپ کے فن کی دو بڑی خصوصیات ہیں۔ ادھر لداخ کے کلچر اور اس کی تاریخ پر آپ کے درجنوں مضامین پابندی سے 'شیرازہ' اور 'تعمیر' میں شائع ہوتے رہے ہیں ان مضامین کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ آپ لداخیات کے موضوع پہ ایک اتھارٹی کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔''

(جان محمد آزاد: جموں وکشمیر کے اردو مصنفین، عبدالغنی شیخ، میکاف پرنٹرس، دہلی 2004، ص206)

عبدالغنی شیخ نے لداخ جیسے برفیلے علاقے میں اردو کے افسانوی ادب کو زندہ رکھا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں لداخ کے اطراف میں بکھری ہوئی زندگیوں سے اپنے افسانوں کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ وہ یہاں کے باشندوں سے متعلق واقعات کو ایک نئے انداز سے پیش کر کے لداخ جیسے علاقے کی تہذیب و ثقافت اور یہاں کی زندگیوں کی نہ صرف مختلف رنگوں سے اردو دنیا کو روشناس کراتے ہیں بلکہ خود لداخ جیسی سنگلاخ زمین پر اردو کی آبیاری بھی کر رہے ہیں۔ نور شاہ لکھتے ہیں:

''عبدالغنی شیخ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے لداخ جیسے برفیلے علاقے میں اردو افسانوی ادب کو زندہ رکھا اور اپنے افسانوں میں لداخ کے اطراف میں بکھری ہوئی زندگی اور زندگی سے وابستہ ان گنت واقعات اور حالات کو منفرد انداز سے سمیٹا اور پیش کیا۔''

(نور شاہ: جموں وکشمیر کے اردو افسانہ نگار، میزان پبلشرز، سری نگر، کشمیر، 2011، ص87)

ان کے تین افسانوی مجموعے زوجیلا کے آر پار (1975)، دو راہا (1993) وغیرہ شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ جن میں شامل بیشتر افسانے لداخ کی تہذیب و معاشرت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

عبدالغنی شیخ نے اپنے آس پاس رونما ہونے والے واقعات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول کو اجاگر کرتے ہوئے اپنے کلچر اور تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں۔ افسانہ 'مسکراہٹ' میں عبدالغنی شیخ نے لداخی ماحول اور منظر نگاری کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ افسانے کی کہانی دو کرداروں کے اردگرد گھومتی ہے جو ایک ہی محلے کے دو کردار صنم اور انگموں ہیں۔ انگموں تہوار میں شرکت کے لیے سہیلیوں کے ہمراہ جیپ میں گنپہ جا رہی تھی۔ تو صنم انگموں کو دیکھتے ہی اس سے پیار کرنے لگتا ہے۔ عبدالغنی شیخ اس کہانی میں لداخ کے پہاڑ، سڑک، برف اور گنپہ وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جیپ باد صبا کے ایک مہکتے جھونکے کی طرح اس کے سامنے سے گزری اور صنم دل تھام کر رہ گیا۔ اس جیپ میں انگموں اور اس کی ہمجولیاں تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف بچے بالے، مرد، عورتیں خوبصورت اور نئے کپڑوں میں ملبوس پیدل میلہ دیکھنے جا رہے تھے۔ جیپ اب پہاڑی کے دائیں جانب مڑی اور اس کی نظروں سے اوجھل ہوئی۔ دور آسمان سے باتیں کرتی ہوئی مخروطی چوٹیاں برف کا سفید لبادہ اوڑھے صبح

کی خنک دھوپ میں نہا رہی تھیں۔ زیرِ مرمت تارکول کی سڑک چھوڑ کر جیپ ریتیلے راستے پر آئی اور دھول کا ایک مرغولہ اٹھا او بڑ کھابڑ راستے پر تھوڑی دیر ڈگمگاتی لڑکھڑاتی ہوئی پھر تارکول کی سڑک پر آئی.. ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ گنپہ (خانقاہ) پہنچا۔ چھتوں کے چھجوں، جھروکوں، کشادہ دیواروں اور آنگن کے اردگرد ہزاروں مرد، عورتیں، بچے بالے وسیع صحن میں ہونے والے دیومالی رقص سے لطف اندوز ہورہے تھے۔''

(عبدالغنی شیخ: زوجیلا کے آرپار، کشمیر مرکنٹائل پریس، ریذیڈنسی روڈ، سرینگر، 1975، ص9)

مذکورہ افسانے میں عبدالغنی شیخ نے جہاں ایک طرف لداخ کے کلچر کو نمایاں کیا ہے وہیں دوسری طرف لداخ کے گنپہ اور ستوپا کو بھی اجاگر کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''ایک مرتبہ انگموں دریچے سے غائب ہوئی۔ وہ دھکم دھکا کھاتا ہوا جلدی سے گنپہ کے عقب میں آیا اور دروازے کے پاس آکر کھڑا ہوا.. زیوارت میں چھماتی ہوئی عورتیں آ جارہی تھیں، لیکن انگموں ان میں نہیں تھی۔ سامنے ستوپا کے نیچے آدمی شراب پی رہے تھے۔'' (ایضاً، ص11)

لداخ قدیم زمانے سے کھیل تماشوں، میلوں اور تہواروں کے لیے مشہور رہا ہے۔ لوسر لداخ کا ایک اہم تہوار ہے۔ جو بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ افسانے 'لوسر اور آنسو' میں عبدالغنی شیخ نے لداخ کی تہذیب و معاشرت کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ لوسر لداخیوں کا سالانہ تہوار ہوتا ہے۔ افسانے کی شروعات لوسر تہوار کے دن کی ٹھنڈی شام سے ہوتی ہے۔ ہر طرف لوگ خوشیاں مناتے ہیں۔ ملاحظہ کریں اقتباس:

'' لوسر کی سہانی اور ٹھنڈی شام تھی۔ لڑکے، لڑکیاں خوش آئند آوازوں میں مدھر گیت گاتے ہوئے دیپ جلا رہے تھے۔

(بولو! بولو! خرلا بولو! سنگیس لا بولو! چھوس لا بولو! لاما لا بولو! بولو! بولو!) ترجمہ: (اے دیپ جلو! اے دیپ جلو! محل کے حضور میں دیپ جلو! بدھ حضور میں دیپ جلو! دھرم کے حضور میں دیپ جلو! عابد کے حضور میں دیپ جلو! اے دیپ جلو! اے دیپ جلو) مکانوں کی چھتوں اور بالا خانوں کے دریچوں پر دیپوں کی قطاریں جگ مگ جگ مگ کر رہی تھیں۔ بازار میں بچوں، بوڑھوں، جوان لڑکوں اور لڑکیوں کا جم غفیر تھا۔ جہاں سے بے ہنگم شور وغل کی آوازیں آرہی تھیں۔ کچھ کچھ لمحے کے بعد نوجوان لڑکے اور بچے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے گٹھے لہراتے اور ہشا لاہشا کی صدائیں بلند کرتے ہوئے کوچوں سے نمودار ہوتے اور بازار روشنی سے جگمگا اٹھتا۔ کبھی کبھی فضا میں آتش بازیاں چھوٹ پڑتیں جن سے ان گنت جگنو کی طرح چمکتی ہوئی آگ کی پنکھڑیاں زمین پر جھل جاتیں۔ گاہے گاہے کسی بلاخانے کی چھت سے سوز اور مدھ میں ڈوبی ہوئی شہنائیوں کی آوازیں بلند ہوتیں۔'' (ایضاً، ص35)

عبدالغنی شیخ نے لداخ کی سرزمین میں آنکھ کھولی اور یہاں کے لوگوں کو بہت قریب سے دیکھا اور ان کے احساسات وجذبات کی ترجمانی اپنے افسانوں میں کی ہے۔ مذکورہ افسانہ میں انگموں کے جذبات کو فنی مہارت سے پیش کرتے ہوئے یہاں کے چولہا، لوسر، پہاڑ اور ژیمو گنپہ کو بھی نمایاں کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

'' آہ! اس سال لوسر کتنی کٹھنائیاں اور اداسیاں لے کر آیا۔ وہ سوچنے لگی۔ پچھلے سال لوسر کے موقعے پر اس کی ماں زندہ تھی۔ اس کا شوہر گھر پر تھا۔ شوہر کا ایک دوست بھی تھا۔ اور اس کی اپنی چہیتی سہیلی حمیدہ بھی گھر پر تھی۔ اس دن گھر پر اچھے اچھے کھانے پکے تھے۔ لیکن اس سال ابھی تک چولہا ٹھنڈا پڑا تھا.. پہاڑی پر واقع محل کے دریچے کی قندیلیں ہوا کے جھونکوں سے لرز رہی تھیں اور بلند ترین چوٹی پر واقع ژیمو گنپہ تاریکی میں مستور تھا۔ شمعوں کی چمکتی ہوئی ایک لمبی زنجیر اس کے وجود کی نشان دہی کر رہی تھی۔'' (ایضاً، ص35)

افسانے 'آرزوئیں' لداخی تہذیب وثقافت، تاریخ، رہن سہن اور لداخیت کے حوالے سے عبدالغنی شیخ کا ایک اہم افسانہ ہے۔ اس کہانی کا کردار 'کنزیز' ہے جو اپنی سہیلیوں نیما اور پدما کے ہمراہ من میں ایک بھائی کی تمنا لے کر سنگر گنپہ جاتی ہے۔ کیونکہ بودھی مذہب میں پہلے ماہ کی پندرھویں اور سولہویں تاریخ ہر کسی کے لیے ایک خوش خبری لے کر آتی ہے۔ اس لیے کنزیز بھی اپنی رسم کے مطابق ساری چیزیں لے کے مختلف گنپہ اور مندر میں جا کر بڑے ادب سے نذرانہ پیش کرتی ہے اور بڑیلاما سے تعویذ حاصل کر کے گھر واپس آتی ہے۔

اس کے علاوہ مذکورہ افسانے میں لداخ کی عورتوں کے روزمرہ گھریلو کام، پیرق، ژیمو کی چوٹی، گنپے وغیرہ کا ذکر بھی کیا ہے۔ جو لداخ کی قدیم تہذیب کے ورثے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

'' پندرھویں تاریخ کو کنزیز کی آنکھ بہت سویرے کھلی۔ کپڑے لتے لگا کر بستر تہ کیا اور اپنے روزمرہ کے کام میں لگ گئی۔ سب سے پہلے مٹی کا گھڑا اٹھائے نالے پر پانی لینے چلی۔ تب تک ماں چولہا پھونکتی رہی۔ پھر کمرے سے دروازے تک صفائی کی طاق پر رکھے ہوئے کٹوروں اور تھالیوں کو صاف کرنے لگی، یہ اس کا روز کا کام تھا۔ جو وہ کسی دوسرے پر چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنا کام پھرتی سے کر رہی تھی کیونکہ آج اس کو مقدس تیرتھوں کی یاترا کرنی تھی۔ یہ سب مقدس تیرتھ اس کے گھر کے ایک میل کے فاصلے کی حدود میں تھے۔''

(عبدالغنی شیخ: زوجی لا کے آرپار، افسانہ: آرزوئیں، کشمیر مرکنٹائل پریس، ریذیڈنسی روڈ، سرینگر، 1975، ص73-77)

'آزمائش' عبدالغنی شیخ کا لداخی تہذیب کے پس منظر میں لکھا گیا ایک رومانی افسانہ ہے۔ اس میں لندن کی ایک لڑکی 'میری' اور لداخ کا ایک لڑکا 'حامد' کے درمیان محبت کی داستان کو پیش کیا گیا ہے۔ میری لداخ میں آکر حامد سے لداخی زبان سیکھنا چاہتی تھی اور حامد میری سے انگریزی لب ولہجہ کو درست کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے کے قریب آگئے اور ان کی ملاقاتیں روز کا معمول بن گئیں۔ ایک روز میری حامد سے اپنی محبت کا اظہار کرتی ہے تو حامد میری سے

کہتا ہے کہ میرا گاؤں لیہہ سے بالکل بدتر ہے۔ جہاں نہ کوئی سڑک، بجلی، رستوران، ریڈنگ روم وغیرہ ہے۔ یہاں مصنف نے لداخ کے لیہہ شہر اور گاؤں میں رہنے والے لوگوں کا تقابل کر کے لداخی رہن سہن، ان کے کچے مکانات کے علاوہ ان کی زندگی کی مشکلات کو بھی نمایاں کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''حامد رُک رُک کر بولنے لگا، لیکن تم نہیں جانتی میری، جہاں میں رہتا ہوں وہ جگہ لیہہ سے بالکل بدتر ہے۔ لیہہ میں سیاحوں کی آمد کی وجہ سے بڑی تبدیلیاں آگئی ہیں۔ یہاں موجودہ زمانے کی ساری بنیادی سہولتیں میسر ہیں۔ لیکن میرے گاؤں میں ابھی کوئی سہولیت نہیں، کوئی ریستوران نہیں، کوئی ریڈنگ روم نہیں، یہاں تک کہ بجلی بھی نہیں۔ دھول گرد، ریت میرے گاؤں کے تحفے ہیں۔ گاؤں تک سڑک بھی نہیں جاتی۔ چنانچہ سنگ ریزوں اور دھول سے اٹی ہوئی چار کلو میٹر لمبی ایک ڈھلوان پگڈنڈی پیدل طے کرنے کے بعد ہم اپنے گھر پہنچتے ہیں۔ تو کیا ہوا؟ میری نے بیچ میں بات کاٹ دی۔ ہم کچے مکانات میں رہتے ہیں، جن کی نچلی منزل میں گائے کا تھان اور بھیڑ بکریوں کا باڑا ہوتا ہے۔ کوئی ڈرائنگ روم نہیں، کوئی باتھ روم نہیں۔'' (ایضاً، ص73)

عبدالغنی شیخ کے بیشتر افسانے لداخ کی تہذیب و معاشرت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ لداخ میں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کے بیچ میں کئی میلوں کا فاصلہ ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی بھی مسافر دن بھر سفر کرنے کے بعد شام کو اگر اپنی منزل پر نہیں پہنچتا تو پاس کے گاؤں میں بلا جھجک کسی بھی گھر کے در پر دستک دیتے ہیں اور مسافر جس در پر بھی جاتا ہے اس گھر کے افراد خانہ خوش اسلوبی کے ساتھ مہمان کے استقبال کے لیے 'دیا' لیے ہوئے دروازے تک آجاتے ہیں، کیونکہ اس وقت آج کی طرح بجلی نہیں تھی۔ افسانہ 'ایک رات' میں ایک مسافر کے استقبال کا منظر ملاحظہ فرمائیں:

''کون ہو؟ میں ایک پردیسی ہوں۔ ایک رات کے لیے پناہ چاہتا ہوں۔ ایک جوان مردانہ آواز نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ نیم تاریکی میں دس بارہ سال کے چھوٹے لڑکے نے ٹمٹماتا 'دیا' دکھاتے ہوئے کہا۔ پردیسی اندر آجایئے۔ وہ چپکے سے پیچھے ہولیا۔ کمرے میں الاؤ جل رہا تھا۔ اس کے گرد ایک خاتون، چھ سات سال کا ایک گول مٹول بچہ اور ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی۔ پردیسی نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور الاؤ کے قریب جنگلی ہرن کی کھال پر بیٹھ گیا۔''

(عبدالغنی شیخ: دو ملک ایک کہانی، افسانہ: ایک رات، یاسمین، فورٹ روڈ لیہہ، لداخ، 2015، ص27)

لداخ ایک ٹھنڈا علاقہ ہے یہاں سال کے بیشتر مہینے سردی کی لپیٹ میں رہتے ہیں۔ گرمی کا موسم مشکل سے تین مہینے ہوتا ہے لیکن ان دنوں میں بھی رات کو ٹھنڈی ہوائیں چلتی رہتی ہیں۔ اس لیے جب تک رات میں ایک کمبل کے اوپر رضائی نہ اوڑھے تو نیند بھی آرام سے نہیں آتی۔ اس لیے یہاں مہمان کو سب سے پہلے سردی سے راحت پہنچانے کا بندوبست کرنے کے لیے چولھے میں آگ روشن کرتے ہیں یا اگر پہلے سے آگ لگی ہے تو اس میں مزید لکڑیاں ڈال دی جاتی ہیں، تاکہ مہمان کو راحت محسوس ہو۔ افسانہ 'ایک رات' میں مہمان کی خاطر مدارات کرتے ہوئے عورت کہتی ہیں:

''قریب آجاؤ بیٹا، ٹھیک طرح سے آگ تاپنا۔ عورت بولی اور بڑے لڑکے سے مخاطب ہو کر کہا۔ داوا! ان کو کمبل اوڑھانا اور لڑکی سے بولی، تم باہر سے سوکھی لکڑیاں لانا۔ بڑے لڑکے نے پردیسی کے پیچھے کمبل اوڑھا دیا۔ شاباش بھئی داوا۔ آج بڑی سردی ہے۔ نوجوان بے تکلفی سے بولا اور چھوٹے بچے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر بچوں کی ماں سے مخاطب ہو کر کہا۔ آپ کے بچے بڑے پیارے ہیں۔'' (ایضاً، ص28)

افسانہ 'منظر نامہ' میں عبدالغنی شیخ نے لداخی شادی کے رسم و رواج کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ لداخ میں شادی عام طور پر اکتوبر، نومبر میں ہی منعقد ہوتی ہے، کیونکہ لداخ میں کوئی فنکشن ہال یا اس طرح کی کوئی مخصوص جگہ نہیں ہے۔ اس لیے شادی کی تقریب کا اہتمام اگست میں فصل کاٹنے کے بعد ہی کسی کھیت میں مرد اور عورت دونوں کے لیے الگ الگ شامیانے لگائے جاتے ہیں۔ اسی طرح باقی رسومات کو بھی انھوں نے اپنے افسانے میں پیش کیا ہے۔ لداخ کی شادی کی رسومات وغیرہ میں بھی کافی تبدیلی آئی ہے۔

عبدالغنی شیخ کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے زبان و بیان کی آرائش و زیبائش سے بلند ہو کر اپنے عہد کے سماجی، سیاسی اور ثقافتی حالات کو گہرے شعور کے ساتھ سادہ، سلیس اور فطری اسلوب میں ایسی کہانیاں لکھیں جو اپنے عہد کی حقیقتوں کو سامنے لاتی ہیں۔

عبدالغنی شیخ نے لیہہ، کرگل اور دراس جیسے لداخ کے اہم مقامات کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔ مذکورہ افسانے میں وہ کرگل، دراس اور بٹالیک کے بارے میں لکھتے ہیں:

''صدیوں پہلے جب سیمان کرگی نے دریائے سورو کے کنارے واقع یہ ویران جگہ اپنے بسنے کے لیے انتخاب کی۔ سیمان کرگی اپنے دو بھائیوں اور برور کے ہمراہ قدیم زمانے میں گلگت سے نقل مکانی کر کے جب یہاں پہنچا تو یہ جگہ پسند آئی اور یہاں بس گیا۔ اپنے نام پر اس جگہ کا نام کرگی رکھا جو بعد میں بگڑ کر کرگل بن گیا۔ پوئن نے دریا پار اپنی بستی بسائی اور اسی کے نام کی نسبت سے یہ جگہ پوئن کہلائی جو بعد میں کثرت استعمال سے پوئن بن گیا۔ تیسرا بھائی برور پیچھے نہیں رہا اس نے کرگل کے پاس ایک نئی جگہ آباد کی جو برور کہلایا اور آج بارو کے نام سے جانا جاتا ہے۔ کرگل کے اکثر دفاتر یہاں ہیں۔ کرگل کے ایک طرف دراس ہے تو دوسری طرف بٹالیک ہے۔ یہاں کے باشندوں کے آباواجداد بھی صدیوں پہلے گلگت اور اس کے نواحی علاقوں سے آئے تھے۔''

(عبدالغنی شیخ: دو ملک ایک کہانی، افسانہ پہلا خط، یاسمین، فورٹ روڈ لیہہ، لداخ، ص206)

عبدالغنی شیخ کے دیگر افسانے بھی لداخ کی تہذیب و معاشرت کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ خاص طور سے بزدل، بیوقوف، پاگل، مسکراہٹ، آزمائش، راز دل، یادیں، بدلاو، کھودا پہاڑ، نکلا چوہا، دل ہی تو ہے، مسافر، مرنا تیری گلی وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے افسانے اور کردار لداخی تہذیب و معاشرت کی روایت کو ابھارنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ عبدالغنی شیخ کے افسانوں میں لداخ کے حالات، واقعات، ماحول اور معاشرے کے مسائل پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ جن کو انہوں نے بڑی دیانت داری کے ساتھ پیش کیا ہے۔

■

Dr. Mohd Shareef
Assistant Professor, Dept. of Urdu
Government Degree College
Kargil- 194105 (Ladakh)
Mob.: 8899238784
Email: shareef.sharifi786@gmail.com

منتظر قائمی

کے آصف کا فلمی سفر

انارکلی سے مغل اعظم تک

دنیا میں کوئی بھی شاہکار اپنی تخلیق سے قبل جزوی طور پر وجود میں آچکا ہوتا ہے اور وہ اس بات کی بشارت دے دیتا ہے کہ عنقریب کوئی ایک ایسی شے کا وجود ہونے والا ہے جو انسان کی عقل کو متحیر و ششدر، تخیل کو حیران و پریشان، فکر کو غلطاں و پیچاں اور فن کو پابوسی و قدم بوسی پر مجبور کر دیتا ہے۔ میر عطا حسین تحسین نے اگر 'نو طرز مرصع' کو 'قصہ چہار درویش' نہیں بنایا ہوتا تو کوئی میر امن اردو نثر کو 'باغ و بہار' کیسے بناتا۔ کوئی شیخ سعدی نہیں ہوتا تو جلال الدین رومی اور حافظ و خیام کہاں سے آتے۔ اگر دہلی میں مغل حکمراں نصیر الدین بیگ محمد خان ہمایوں کا تقریباً سترہ ایکڑ میں پھیلا ہوا مقبرہ تعمیر نہ ہوتا تو شاہ جہاں بھی اپنی بیگم ممتاز کی یاد میں تاج محل جیسا شاہکار دنیا کو نہ دے پاتا۔ اسی طرح اگر امتیاز علی تاج نے 'انارکلی' جیسا لازوال ڈرامہ نہ تحریر کیا ہوتا تو کریم الدین آصف 'مغل اعظم' جیسی ایک شاہکار اور لازوال فلم دنیا کو نہیں دے پاتا۔

امتیاز علی تاج کے اس فن پارے پر 'مغل اعظم' فلم بننے سے قبل ہی اس ڈرامے پر تین متعدد فلم سازوں نے فلم بنا ڈالی تھی لیکن جس طرح کی جاندار، شاندار، شاہی جاہ وحشم اور تمکنت والی فلم کا خواب کے آصف نے دیکھا ویسا آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔ ایسے خواب فقط شہنشاہ ہی دیکھتے ہیں جو خواب کو زمین پر اتارتے اتارتے فقیر یا درویش ہو جایا کرتے ہیں۔ تاج محل کو تعمیر ہونے میں اگر بائیس برس لگے اور مغلیہ سلطنت نے اپنے خزانے لٹا دیے تو آصف نے بھی 'مغل اعظم' جیسے عظیم کارنامے کو پورا کرنے میں چودہ برس لگا دیے اور آصف بھی اس فلم کو بناتے بناتے فقیر اور درویش ہو گیا۔

آصف نے 'مغل اعظم' کے علاوہ نہ کوئی اور خواب دیکھا اور نہ کوئی خواب پالا اور اس دوران اس عظیم خواب کی تکمیل میں جو رخنے اور اڑچنیں آئیں اس کے نتیجے میں 'پھول'، 'محبت اور خدا'، 'بھگت سنگھ' اور 'کلیو پیٹرا' جیسی فلمیں بن گئیں۔ اس دوران آصف اپنے واحد خواب 'مغل اعظم' کی تعبیر تلاش کرنے میں کبھی بھی غافل نہیں رہے اور نہ ہی کسی اور فلم کو بنانے کا ایسا عظیم، جاہ و حشمت اور شاندار خواب پالا۔ سوتے جاگتے ایک دیوانے کی طرح وہ ذرہ برابر بھی نہ تو اپنے عزم مصمم سے ایک انچ پیچھے ہٹے اور نہ ہی اس نے 'مغل اعظم' کو بنانے کا ارادہ ترک کیا۔ یہ فلم آصف کی زندگی اور کیریئر کے لیے گویا ایک ایسی فلم تھی جو اگر نہ بنائی گئی تو گویا آصف کی زندگی رائیگاں اور عزم بے معنی ہو کر رہ جاتا۔

کہا جاتا ہے کہ آصف نے اس فلم کے پیچھے اپنا پورا کیریئر داؤں پر لگا دیا وہ بہت سگریٹ پیتے تھے اور ایک وقت آیا جب وہ اُدھار کی سگریٹ پینے لگے۔ آصف نے ممبئی میں نہ تو اپنا گھر بنایا اور نہ ہی کبھی کوئی گاڑی خریدی اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس فقیر منش انسان نے دونوں ہی اشیا تادم مرگ کرائے پر رکھی شاید وہ درویشی کے ان جلی حروف میں حد درجہ اعتماد رکھتا تھا کہ یہ دنیا ایک سرائے فانی ہے انسان یہاں خالی ہاتھ آیا ہے اور ہاتھ خالی ہی جائے گا بس اس کے اعمال و افعال ہی اس کو زندہ رکھیں گے۔ اس بابت جب ان سے پوچھا گیا کہ بمبئی میں آپ اپنا گھر کیوں نہیں بناتے تو اس دیوانے کا جواب یہ تھا کہ 'میں یہاں فلمیں بنانے آیا ہوں گھر بنانے نہیں آیا ہوں'۔

کے آصف نے 'مغل اعظم' کا خواب غلام ہندوستان میں دیکھا اور اس کو آزاد ہندوستان میں پورا کیا یعنی یہ فلم تو اسی وقت تشکیل پانے لگی تھی جب 'پھول' کی شوٹنگ کے دوران معروف فلم ساز کمال امروہوی نے ایک دن امتیاز علی تاج کا لازوال ڈرامہ 'انارکلی' کی کہانی سنائی۔ اس کے بعد جیسے آصف کو اپنا جہاں، اپنی منزل، اپنی تلاش، اپنی آرزو اور اپنی جستجو ہی مل گئی جس کے لیے اسے قدرت نے بنایا تھا۔ کمال امروہوی اور کے آصف دونوں کی تعلیم بہت کم تھی لیکن دونوں ہی فن کاروں میں ادب اور فلم پر زبردست دسترس اور یقین تھا۔ کے آصف کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی فلموں میں اداکاروں کے سامنے خود اداکاری کر کے بتاتے تھے۔ آصف بلا کا جادوگر تھا کسی بھی رئیس کے سامنے اگر وہ اپنی کہانی کی منظر کشی پیش کر دے تو وہ اس کی کہانی سے متاثر ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ایک دن موقع محل دیکھ کر اپنے خواب کو مشہور فلم اسٹوڈیو 'مہالکشمی' کے مالک شیراز علی حکیم سے بیان کر ڈالا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکیم صاحب فلم میں پیسہ لگانے کو راضی ہو گئے۔ آصف اور شیراز علی کا مزاج ایک جیسا تھا جو بھی کام کرنا ہے انتہائی اعلیٰ درجے کا کرنا ہے۔ اس دور میں کہانیوں کا بادشاہ سعادت حسن منٹو بھی بمبئی کی فلمی رعنائیوں میں گم تھا اس نے ایک جگہ آصف کی تعریف کرتے ہوئے اس کے کہانی سنانے کے فن کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ:

''کہانی سنانے کے دوران وہ مداری پن کرتا ہے یعنی حسب ضرورت واقعات کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ خود بھی چڑھتا اترتا رہتا ہے۔ ابھی وہ صوفے پر ہے چند لمحات کے بعد وہ اس کی پشت کی دیوار پر، دوسرے لمحے اس کے سر کے نیچے ہے اور ٹانگیں اوپر ہیں اور دھم سے نیچے فرش پر۔ اس کے فوراً بعد وہ کرسی پر اکڑوں بیٹھا ہے مگر پھر فوراً اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کوئی آدمی ووٹ حاصل کرنے کے لیے تقریر کر رہا ہے۔''

فلم 'پھول' 1944 میں ریلیز ہوئی اور اس کے بعد 1945 میں کے آصف نے مغل اعظم فلم کا آغاز کر دیا۔ یہیں سے اس فلم کو بنانے کی جدوجہد کا بھی آغاز ہو جاتا ہے۔ جتنی دلچسپ اور حیران کن یہ فلم ہے اس کے بننے کی کہانی بھی اس سے کم دلچسپ نہیں ہے۔ کہانی، اسٹار

کاسٹ، کاسٹیوم، سیٹ، رقص، موسیقی، مکالمہ، ہدایت کاری اور اداکاری غرض کہ کسی بھی پہلو پر آصف نے کہیں کوتاہی یا سمجھوتہ نہیں کیا۔ فلم کے ہر ایک شعبے پر دل کھول کر دولت لٹائی مگر اس فلم کے ریلیز ہوتے اس پر اتنی پریشانیاں، افتاد، آپسی نااتفاقیاں اور مالی دشواریاں آئیں کہ ایسا لگا کہ اب آصف کی کشتی غرقاب ہو جائے گی اور وہ ناچاہتے ہوئے کسی مالدار شخص کی دہلیز پر دم توڑ دے گا مگر آصف کسی کے آگے جھکا نہیں۔ وہ ایک ایسا درویش یا فقیر تھا جس کے کشکول میں بعض دفعہ ایک کھوٹا سکہ بھی نہیں ہوتا تھا لیکن اس کا ہمالیائی ارادہ دنیا فتح کرنے والا تھا۔ 'مغلِ اعظم' فلم میں پیسہ لگانے والوں میں بامبے ٹاکیز کے مالک شیراز علی حکیم سے لے کر شاپورجی پولن جی مستری جیسے بڑے تاجروں کا نام شامل ہے۔

شیراز علی حکیم سے ابھی آصف نے 'مغلِ اعظم' بنانے کا قول وقرار کیا ہی تھا کہ اسی وقت بامبے اسٹوڈیو فروخت ہو رہا تھا جب یہ بات حکیم صاحب تک پہنچی تو انھوں نے بامبے اسٹوڈیو خرید کر آصف کے حوالے کر دیا۔ بارہ اکتوبر 1945 کو جب اس فلم کی شوٹنگ کا شاہانہ انداز میں شُبھ مہورت ہو رہا تھا اس وقت اکبرِ اعظم کے رول میں چندر موہن، مہارانی جودھا بائی کے روپ میں درگا کھوٹے، شہزادہ سلیم کے رول میں سپرو اور انارکلی کے طور پر نرگس کو سائن کیا گیا تھا۔ فلم کی کہانی میں بھی آصف نے اپنے اندازِ فکر ونظر کے اعتبار سے تھوڑی بہت تحریف کی تھی یعنی ڈرامہ انارکلی کی کہانی سے کچھ اجزا نکال کر کچھ نئے اجزا کا اضافہ کر دیا۔ سید امتیاز علی تاج کے شہرۂ آفاق ڈرامے 'انارکلی' میں اکبر، سلیم، بختیار (سلیم کا بے تکلف دوست) رانی، انارکلی، ثریا، دل آرام اور زعفران جیسے کردار موجود ہیں جبکہ فلم میں بختیار کے کردار کی جگہ درجن سنگھ اور دل آرام کی جگہ پر بہار کا اضافہ کیا گیا ہے۔

فلم کو مزید پرکشش اور مربوط بنانے کے لیے اس کہانی میں پلاٹ، کردار، مکالمے وغیرہ میں حسبِ ضرورت تبدیلی کیے گئے۔ ابتدائی فلم یعنی 1951 سے قبل والی 'مغلِ اعظم' میں انارکلی کے رول میں نرگس اور بہار کے طور پر وینا کو منتخب کیا گیا مگر جیسے ہی ہندوستان کو آزادی حاصل ہوئی اور ملک تقسیم ہوا اور اس کے بعد جو خونیں واقعات رونما ہوئے اس نے تاریخِ انسانیت کو لرزاں، حیراں اور پریشاں کر دیا۔ اس عالمِ بے سروسامانی میں بہت سے خانہ بدوش ہجرت کر کے پاکستان سے ہندوستان اور ہندوستان سے پاکستان چلے گئے۔ کپور خاندان اور چوپڑہ خاندان جیسے نہ جانے کتنے ہی خاندان سرحد کے اُس پار سے اس پار بے سروسامانی کے عالم میں آئے اسی طرح سعادت حسن منٹو، شیراز علی حکیم، جوش ملیح آبادی اور آصف کے ماموں نذیر احمد خاں بمبئی کو خیرباد کہہ کر پاکستان آباد کرنے چلے گئے۔ اس عظیم سانحے کا اثر نہ صرف یہ کہ نوجوان آصف کے ذہن و دل پر ثبت ہوا بلکہ اس کے خواب بھی ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئے۔ کیونکہ کے آصف جب بمبئی آئے تو اپنے ماموں نذیر جو اس وقت فلموں میں ایکٹر تھے انھیں کے یہاں ٹھہرے اور ان کے ماموں نے آصف کو فلموں میں ڈریس سپلائی کرنے والے ایک ٹیلر کے یہاں سلائی وغیرہ کا کام سیکھنے کے لیے رکھ دیا۔ یہیں سے آصف کو اپنی منزل کا پتہ اور راستہ مل گیا۔ آصف فلموں کے شیدائی تو تھے ہی مگر اسی بہانے ان کو فلموں کی ایکٹنگ، شوٹنگ اور میکنگ کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع مل گیا اور آصف کے فن کو بال و پر عطا ہو گئے۔ آزادی کے بعد جیسے ہی ملک تقسیم ہوا تو آصف کے ماموں نذیر احمد خان نے بمبئی چھوڑ کر پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا حالانکہ اس وقت تک نذیر ایک کامیاب اداکار کے طور پر انڈسٹری میں اپنے پیر جما چکے تھے۔ آصف کے پاس بھی موقع غنیمت تھا کہ وہ پاکستان چلا جاتا مگر کے آصف کو تو ایک ایسے ہندوستان کی تعمیر وتشکیل کرنا تھا جو ہزار زخم کھانے کے بعد، قتل وخون کے دریا سے گزرنے کے بعد بھی اپنی دیرینہ صلحِ کل کی روایات، مساوات، اخلاقیات ونظریات پر باقی رہ سکے۔ حالات کے سامنے سرنگوں ہونا تو آصف کے مزاج کا حصہ ہی نہیں تھا۔ آزادی اور بٹوارے کے بعد بھی وہ جس طرح کے ہندوستان کا خواب اپنی آنکھوں میں بسائے پھر رہا تھا وہ چاہتا تھا کہ دیگر سیکولر مزاج اور امن پسند شہری بھی اس کے خواب میں شامل ہو جائیں کیونکہ آصف کے خوابوں والے ہندوستان کی تکمیل تو بس بمبئی فلم انڈسٹری میں ہی ہو سکتی تھی۔ آصف تو ایک ضدی مزاج انسان تھا ایک دفعہ جس کام کو اس نے ٹھان لیا تو بس اسے ہر حال میں ممکن بنا کر ہی دم لینے والوں میں سے تھا۔ ابھی 'مغلِ اعظم' کی شوٹنگ ہوئے دیر بھی نہیں ہوئی تھی کہ بٹوارہ سامنے ایک دیوار بن کر کھڑا ہو گیا اور فلم متاثر ہو گئی۔ شوٹنگ روکنی پڑ گئی اور اتنی شاہانہ فلم جس پر پانی کی طرح پیسا لگا ہو وہ تقسیم کے خونیں سیلاب میں غرقاب ہوتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ جب آگ اور خون کا یہ دریا اپنی طغیانی پر پہنچنے کے بعد کچھ تھما تو آصف نے اپنے خوابوں کی کشتی پھر سے دریا میں اتاری۔ اپنے ریزہ ریزہ خوابوں کو سمیٹتے ہوئے پھر سے تنکا تنکا جوڑنا شروع کیا اور کئی برس سے آنکھوں میں بند پڑے خواب کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش اور جستجو میں غرق ہو گیا۔

ملک کی آزادی اور تقسیم کے خونیں مناظر کے بعد آصف نے فلم 'مغلِ اعظم' کی اسکرپٹ پر نظر دوڑائی تو وقت اور حالات اس بات کے متقاضی تھے کہ اب کہانی میں خاطر خواہ تبدیلی کی جائے جس سے ملک کی تقسیم سے پیدا ہونے والے گہرے زخموں کا نفسیاتی علاج اس طرح کیا جائے کہ دو قوموں کے درمیان وہی پرانا اعتماد اور وقار پھر سے بحال ہو جائے۔ جہاں ایک طرف آصف کہانی میں کچھ تبدیلی کر رہے تھے وہیں کچھ پرانے اداکاروں نے آصف کا ساتھ چھوڑ دیا۔ قسمت کی ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اکبرِ اعظم کا کردار نبھانے والے چندر موہن اچانک اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور تو اور شہزادہ سلیم کا رول ادا کرنے والے سپرو بھی اپنی پرانی چمک دمک کھو کر اب معاون اداکار کے بطور فلموں میں نظر آنے لگے تھے۔ فلم کی ایک چوتھائی شوٹنگ بھی ہو چکی تھی جو لوگ فلموں کے مختلف مراحل سے واقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ایسے نازک وقت میں قدم پیچھے کھینچنے کا مطلب خود کو کتنے طرح کے خسارے میں مبتلا کرنا ہے۔ اکبرِ اعظم اور شہزادہ سلیم دونوں ہی اگر اپنی چمک دمک کھو دیں تو فلم میں بچتا ہی کیا ہے۔ کوئی اور ہوتا تو اپنے ہی خواب کو اپنی آنکھوں کے سمندر میں غرقاب کر دیتا اور فلم سازی سے توبہ کر لیتا مگر آصف نے دل پر پتھر رکھ کر اپنے تخلیق کردہ نامکمل مجسمے کو بڑی ہی نامرادی اور مایوسی کے ہتھوڑے سے توڑ ڈالا اور ایک نیا بت تراشنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ کولمبس کے مانند وہ اپنی کہانی کے کرداروں کی تلاش میں نکل پڑا اور ایک مقام پر اسے اپنے وقت کے عظیم اداکار پرتھوی راج کپور میں اکبرِ اعظم تلاش کر لیا، مہہ جبیں عرف مدھوبالا میں انارکلی اور شہنشاہ جذبات دلیپ کمار المعروف یوسف خان میں شہزادہ سلیم کو دریافت کر لیا۔ اب ان سب کو لے کر دوبارہ فلم کی شوٹنگ شروع کی اور جب فلم مکمل بن کر سامنے آئی تو دیکھنے والے نے آصف کے ہندوستان کی وہ عبارت پڑھ لی جو آزادی

اور بٹوارے کے بعد ہندوستان کی پیشانی پر آصف نے جلی حروف میں تحریر کیا تھا وہ یوں بیاں کی:

''میں ہندوستان ہوں، ہمالیہ میری سرحدوں کا نگہبان ہے، گنگا میری پوترتا کی سوگندھ، تاریخ کی ابتدا سے میں اندھیروں اور اجالوں کا ساتھی ہوں اور میری خاک پر سنگِ مرمر کی چادروں میں لپٹی یہ عمارتیں دنیا سے کہہ رہی ہیں کہ ظالموں نے مجھے لوٹا اور مہربانوں نے مجھے سنوارا، نادانوں نے مجھے زنجیریں پہنا دی اور میرے چاہنے والوں نے انھیں کاٹ پھینکا۔ میرے ان چاہنے والوں میں ایک انسان کا نام جلال الدین محمد اکبر تھا''

ایسا نہیں ہے کہ امتیاز علی تاج کے ڈرامے پر آصف نے کوئی پہلی مرتبہ فلم بنانے کی ٹھانی بلکہ آصف سے پہلے بھی اس کہانی پر کئی فلمیں بن چکی تھیں۔ نند لال جسونت لا نے 1953 میں 'انارکلی' کے نام سے فلم بنا ڈالی۔ زیادہ تر فلم سازوں نے محبت کی اس لازوال داستان کو ہی اپنی کہانی کا مرکز بنایا مگر کریم الدین آصف نے مغلیہ سلطنت کے عظیم شہنشاہ اکبر کو مرکز میں رکھ کر کہانی کے دروبست اس طرح سنوارے کہ انارکلی اور شہزادہ سلیم کے عشق کی داستان بھی رنگینی اختیار کر لے۔ ڈرامے میں ان تبدیلیوں کے لیے اس نے اپنے وقت کے مشہور و معروف قلم کاروں کی ایک ٹیم لگا دی جس میں کمال امروہی، وجاہت میرزا چنگیزی، احسن رضوی اور امان صاحب جیسے لوگ شامل تھے۔ اس کے علاوہ خود آصف بھی اس مکالمہ نگاری کی ٹیم کا حصہ تھے۔ ان سب کی مشترکہ کوششوں سے فلم کی جو کہانی نکل کر باہر آئی اسے اگر ایک الگ ہی قسم کی کہانی کہا جائے تو مبالغہ آرائی نہیں ہوگی جس نے مغلیہ تاریخ کے بہت سے حقائق کو چیلنج کیا ہے۔ شہزادہ سلیم، انارکلی، بہار، درجن سنگھ، سنگ تراش جیسے لازوال کردار تو تاریخ کی کترنوں سے نکل کر عوامی حافظے کا ایک ایسا حصہ بن گئے کہ جس کے نقوش کو مٹانا آسان نہیں ہے۔ اس مرکب کہانی میں لیلیٰ مجنوں کی افسانوی داستان، رادھا کرشن کی پریم کتھا، راجہ دشرتھ کا کیکئی کو وچن، جہاں گیر کا انصاف، مہابھارت، الف لیلیٰ اور ہماری اساطیری کہانیوں کی زیریں لہریں ہمارے اوپر اس قدر اثر انداز ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں کہ ایسی کہانی بننے والا ابھی تک کوئی دوسرا شخص پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔ کہانی کی پرتوں کو اجاگر کرتے ہوئے راجکمار کیسروانی اپنی کتاب 'داستانِ مغلِ اعظم' میں ایک جگہ کہتے ہیں کہ:

''اوپر اوپر سے یہ ایک سہ رخی عشقیہ داستان ہے جس میں باقاعدہ عاشق (شہزادہ سلیم) معشوق (انارکلی) اور رقیب (بہار) جیسے کردار ہیں، لیکن کہانی میں اکبرِ اعظم کے کردار کو کہانی کے مرکز میں لا کر آصف نے کہانی کو ایک نیا نہج دے دیا ہے۔ محبت کی اس داستان میں نسلوں کی سناتن جد و جہد، ایک شہنشاہ کی شہنشاہ بن کر ہر چیز کو دیکھنے کی مجبوری اور ماں کی مامتا پر مہارانی جودھابائی کا مہارانی کے عہدے کو نچھاور کرتے جذبات، کہانی کو اپنے مقامِ عروج پر لے جاتے ہیں۔

کے آصف نے امتیاز علی تاج کا شہرۂ آفاق ڈرامہ 'انارکلی' کی کہانی کو ایک ایسی کہانی کے روپ میں تبدیل کیا جس میں مرکزی کردار انارکلی کی جگہ اکبرِ اعظم کو فوقیت دی اور تمام تر کہانی اسی کے ارد گرد تخلیق کی۔ اس وقت کے دیگر ہدایت کاروں نے انارکلی بنائی جب کہ اسی کہانی پر آصف نے 'مغلِ اعظم' بنائی جو ایک ایسی لازوال کہانی بن گئی جس کے بعد کوئی دوسری عشقیہ داستان جچتی ہی نہیں۔ اگر چہ اس عہد کی عکاسی کے لیے اردو فارسی زبان کا خوب استعمال کیا گیا ہے جو کسی بھی صورت میں فلم بین پر قطعاً گراں نہیں گزرتی بلکہ عام فلم بین اس زبان کی چاشنی سے خوب لطف اندوز ہوتا ہے۔ فارسی اور اردو کے الفاظ و تراکیب، مثلاً تخلیہ، جنبش مکن، بنام تاجدارِ ہندوستان، ملکۂ ذیشان، زینتِ تختِ ہندوستان مہارانی جودھابائی، شہزادہ نورالدین محمد سلیم وغیرہ عام قاری کے ذہن و دل پر نقش ہو جاتے ہیں۔ ہر چند کہ یہ بڑے ہی ثقیل الفاظ و تراکیب ہیں لیکن مناظر میں استعمال ہو کر یہ اپنے معنی و مفہوم خود بہ خود بتا دیتے ہیں۔ اس فلم کا ایک ایک مکالمہ آج بھی عوام کے درمیان گردش کر رہا ہے۔ کس مکالمہ نگار نے کون سا مکالمہ تحریر کیا ہے اس کا بھی کسی کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ ہاں اس کی اسکرین پلے سے متعلق کئی دلچسپ معلومات ضرور ملتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ فلم کے ایک سین میں جب انارکلی کو زندہ دیوار میں چنوانے کا منظر لکھا جا رہا تھا تو آصف نے سب کو کہا کہ کوئی ایسا مکالمہ تحریر کریں کہ جس سے کم الفاظ میں ساری باتیں کہہ دی جائیں تو سب اپنے اپنے انداز میں مکالمہ لکھ کر لائے آصف صاحب بہت ہی دلچسپی کے ساتھ سب کے ڈائیلاگ سن رہے تھے۔ آخر میں جب وجاہت مرزا کا نمبر آیا تو ان سے آصف نے پوچھا کہ آپ کیا لکھ کر لائے ہیں۔ مرزا نے اپنے پاندان سے ایک پرچی نکالی اور کہا کہ اس منظر میں انارکلی محض ایک جملہ ادا کرے گی۔ سین کی وضاحت کرتے ہوئے وجاہت مرزا نے کہا کہ انارکلی پہلے شہنشاہ اکبر کو سلام کرے گی اور کہے گی

انارکلی: یہ ادنیٰ کنیز جلال الدین محمد اکبر کو اپنا خون معاف کرتی ہے۔

اس جملے پر پورے کمرے کا ماحول مشاعرے جیسا ہو گیا ہر طرف سے داد و تحسین کی صدا بلند ہوئی اور سب نے اسی ڈائیلاگ پر اپنی ہامی بھر دی۔ فلم کی کہانی کا انجام بھی بڑا دلچسپ ہے جس میں انارکلی کو زندہ دیوار میں چنے جانے کا حکم دیا جاتا ہے مگر اکبر اپنے لاڈلے شہزادے سے تمام تر اختلافات کے باوجود، انارکلی کی شکل سے نفرت کے باوجود اس کی سزا میں تخفیف کر دیتا ہے اور اسے حکم دیا جاتا ہے کہ انارکلی مغل سلطنت کی خفیہ سرحدوں کو پار کر کے کہیں اور چلی جائے اور یہ راز کہ انارکلی زندہ ہے ہمیشہ کے لیے ایک راز ہی رہ جائے تا کہ اس بات سے شہزادہ سلیم مطمئن ہو جائے کہ انارکلی مر چکی ہے۔ اکبر کے کردار کو عظیم اور اعلیٰ قدروں کا ایک بڑا کردار بنانے کے لیے آخر میں اکبر انارکلی سے کچھ اس طرح مخاطب ہوتا ہے کہ:

اکبر: انارکلی! جب تک یہ دنیا قائم رہے گی تم لفظِ محبت کی آبرو بن کر زندہ رہو گی... اور مغلوں کی تاریخ تمھارا یہ احسان یاد رکھے گی کہ تم نے بابر اور ہمایوں کی نسل کو نئی زندگی دی۔ لیکن ہم تمھیں ایک گم نام زندگی کے سوا کچھ بھی نہیں دے سکتے۔ ہم مجبور ہیں۔ بخدا ہم محبت کے دشمن نہیں اپنے اصولوں کے غلام ہیں، ایک غلام کی بے بسی پر غور کرو گی تو شاید تم ہمیں معاف کر سکو۔''

حواشی

1. راج کمار کیسوانی، داستان مغل اعظم (ہندی)، منجل پبلشنگ ہاؤس، بھوپال، 2020
2. امتیاز علی تاج، انارکلی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1997 (تیسرا ایڈیشن)
3. مغل اعظم (فلم)، ہدایت کار کے آصف، 1960

■

Muntazir Qaimi
Dept of Urdu
Fakhruddin Ali Ahmad Govt P G College
Mahmudabad (Awadh)
Sitapur - 261203 (UP)
Mob.: 8127934734
muntazirqaimi@gmail.com

محمد سعید اختر

جلال لکھنوی کی غیر مطبوعہ داستان
بالا باختر
ایک تعارف

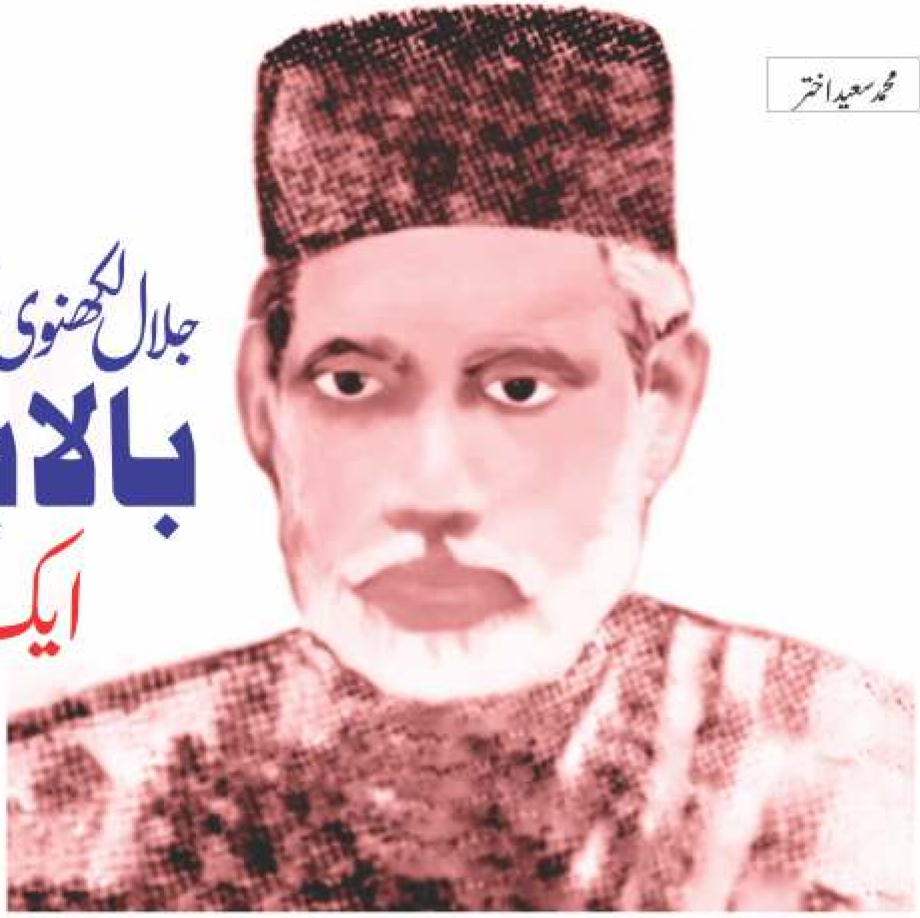

جلال لکھنوی (1834-1909) کا شمار اردو کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ شاعری کے علاوہ لغت نویسی، تاریخ گوئی اور زبان دانی کے حوالے سے بھی ان کی اہم خدمات ہیں۔ جلال لکھنوی کو بچپن ہی سے شعروشاعری کا شوق تھا، جب مصرع موزوں کرنے لگے تو انھوں نے امیر علی خاں ہلال کو اپنا استاد بنایا۔ اس کے بعد میر علی اوسط رشک اور آخر میں فتح الدولہ برق کے شاگرد ہوئے۔ مشاقی اور مہارت نے بہت جلد انھیں استاد شاعر کا رتبہ دے دیا۔ یہاں تک کہ لوگ جلال لکھنوی سے مشورہ سخن کرنے لگے، اس زمانے کے کئی نامور شعرا جن میں آرزو لکھنوی کا نام سب سے نمایاں ہے جلال کے شاگرد ہوئے۔ اس کے علاوہ یاس لکھنوی، احسان علی خاں احسان شاہجہانپوری، وغیرہ ان کے شاگردوں میں شامل ہیں۔

جلال لکھنوی کی ایک داستان جو 'داستان بالا باختر' کے نام سے موسوم ہے ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ یہ داستان رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔ جلال ایک بلند پایہ شاعر ہونے کے ساتھ داستان نویسی میں بھی ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ 'داستان بالا باختر' تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ لائبریری کا کیٹلاگ نمبر 399۔400، 401 ہے۔

جلال لکھنوی بطور شاعر مشہور ہیں۔ لکھنؤ کے ممتاز شاعروں میں انھیں شمار کیا جاتا ہے۔ دربار رامپور سے وابستگی نے انھیں مزید شہرت کی بلندیوں تک پہنچایا۔ امیر مینائی اور داغ کی صحبتوں نے فکروفن کو مزید جلا بخشی، لیکن اس کے علاوہ بھی جلال کی ایک دنیا تھی جن پر کم توجہ دی گئی۔ جلال کی ایک حیثیت داستان گو کی ہے، رامپور انھیں اسی لیے بلایا گیا تھا، ان کے والد حکیم میر اصغر علی خاں کی دربار رامپور سے وابستگی داستان گو کے طور پر تھی، جلال بھی اسی حیثیت سے وہاں وابستہ ہوئے۔ راز یزدانی کے بقول:

''واقعہ یہ ہے کہ جلال کے والد حکیم میر اصغر علی خان داستان گو دربار رامپور میں داستان گو کی حیثیت سے ملازم تھے۔ چنانچہ رضا لائبریری رامپور کے قلمی داستانوں کے ذخیرے میں ترجمہ ایرج نامہ اس تفصیل سے ہے پہلی جلد 365 صفحوں میں دوسری جلد 351 میں تیسری 340 صفحہ قلمی 336 صفحہ قلمی اور پانچویں جلد 302 صفحہ قلمی ان کے نام سے موجود ہیں۔ اور پانچویں جلد کے آخر میں یہ عبارت درج ہے:

''تمام شد ایرج نامہ در زبان اردو بحسن سعی احقر العباد ہیچ مداں کج مج بیان حکیم سید اصغر علی داستان گو بحکم نواب معلی القاب محمد کلب علی خاں بہادر دام اقبالہ بروز جمعہ دواز دہم ذی الحجہ 1285ھ''۔

اور بالا باختر کا ترجمہ تین جلدوں میں اس تفصیل سے ہے کہ پہلی جلد صفحہ 375 قلمی دوسری جلد قلمی صفحات 288 اور تیسری جلد قلمی صفحہ 215 حکیم سید ضامن علی جلال کے نام سے موجود ہے۔''[1]

داستان بالا باختر چونکہ قلمی ہے اس لیے اس کے مطالعے اور تعارف کی باقاعدہ کوئی شکل نہیں ہے، چند سطروں میں تعارف یا داستان کے سلسلے میں کوئی بات ملتی ہے۔ پروفیسر محمد حسن نے داستان بالا باختر پر صرف اتنا لکھنے پر ہی اکتفا کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

'داستان بالا باختر' پر بحث کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے فن داستان گوئی پر بحث کی جائے اور اس کی روشنی میں جلال کے کمالات کا جائزہ لیا جائے۔ لیکن یہ ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہے۔ اس لیے ان کی داستان کا تذکرہ صرف اس حیثیت سے کیا گیا ہے کہ یہ بھی جلال کی ہمہ گیر شخصیت میں ایک اور پہلو کا اضافہ کرتی ہے۔''[2]

ڈاکٹر سہیل بخاری جلال لکھنوی کی داستان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''انھوں (جلال لکھنوی) نےنواب کلب علی خاں کے عہد میں بالا باختر کی تین جلدیں بھی تحریر کی تھیں، پہلی جلد میں 376، دوسری جلد میں 288، تیسری جلد

میں 215 اوراق ہیں۔اور تقطیع تمام جلدوں کی ساڑھے گیارہ اور ساڑھے سات ہے۔ان جلدوں کا ایک ایک قلمی نسخہ کتب خانہ عالیہ رامپور میں محفوظ ہے۔[3]

جلال لکھنوی نے نواب عالی جاہ یوسف علی خاں کی فرمائش پر اس داستان کو اردو قالب میں ڈھالا تھا۔ پہلی جلد میں 375 ورق اور 750 صفحات ہیں۔ دوسری جلد 288 ورق اور 576 صفحات پر مشتمل ہے۔ تیسری جلد 215 ورق اور 430 صفحات پر مشتمل ہے۔ ان تینوں جلدوں کے کاتب خود جلال لکھنوی ہیں۔گیان چند جین نے لکھا ہے کہ دو جلدوں کا ترجمہ جلال لکھنوی نے کیا تھا اور تیسری جلد ان کے والد حکیم میر اصغر علی نے مکمل کی تھی۔[4] لیکن رضا لائبریری رامپور میں موجود کسی بھی نسخے سے یہ ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ اس داستان کے مولف حکیم میر اصغر علی ہیں۔ ممکن ہے کہ گیان چند جین کی نظر سے ساری جلدیں نہ گزری ہوں۔

جلال لکھنوی کی داستان نویسی پر کسی کی کوئی تحریر یا رائے اب تک سامنے نہیں آسکی ہے۔ ابھی تک داستانوں کے بہت سے مطالعے کیے جاچکے ہیں مگر قلمی داستانوں کا ایسا کوئی مطالعہ سامنے نہیں آیا ہے جس میں جلال لکھنوی کی داستان کو موضوع بحث بنایا گیا ہو۔ راز یزدانی، گیان چند جین اور ڈاکٹر سہیل بخاری نے جلال لکھنوی کی داستان گوئی پر ضمناً بحث کی ہے۔ رامپور رضا لائبریری کے کتب خانے میں جلال لکھنوی کی یہ داستان غیر مطبوعہ کیٹلاگ میں موجود ہے۔ان کا ایک اور نثری رسالہ جو عروض وقوافی کے نام سے جانا جاتا ہے وہ بھی کتب خانے میں موجود ہے۔

جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ جلال لکھنوی کے والد حکیم میر اصغر علی (وفات 1296ھ) داستان گو کی حیثیت سے پہلے سے ہی اپنی شناخت قائم کر چکے تھے۔ نواب آصف الدولہ کے دربار سے بحیثیت داستان گو وابستہ ہوئے۔نواب محمد سعید خاں (1840-1855) کے دور حکومت میں رامپور آئے اور رامپور دربار سے ان کا انسلاک بھی داستان گو کے طور پر ہی رہا۔گیان چند جین جو داستان شناس کے طور پر جانے جاتے ہیں انھوں نے اپنی کتاب (اردو کی نثری داستانیں) میں جلال کے والد میر اصغر علی کی داستانوں کی ایک فہرست درج کی ہے، اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ میر اصغر علی نے فارسی میں بھی داستانیں لکھی ہیں۔ان داستانوں کی فہرست حسب ذیل ہیں۔

1 داستان امیر حمزہ ثانی نامکمل،

2 صندلی نامہ دو جلد مع تورج نامہ مکتوبہ 1265ھ م1848

3 داستان صاحب قران سکندر ثانی دفتر ہفتم مسمی بہ رعد الغیب مکتوبہ 1268ھ

میر اصغر علی کی فارسی تصانیف سے کہیں زیادہ اہم اردو تصانیف ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

1 قصہ روشن جمال تصنیف 1273ھ 158 ورق واجد علی شاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔

2 قصہ سیم تن و پری پیکر 62 ورق غالباً واجد علی شاہ کی مثنوی افسانہ عشق کی داستان ہے۔ افسانہ عشق کے ہیرو اور اس کی محبوبہ کا نام سیم تن و پری پیکر تھا۔

3 داستان غزالہ 50 ورق واجد علی شاہ کی مثنوی دریائے تعشق کا قصہ۔

4 قصہ ماہ پروین۔55 ورق۔ واجد علی شاہ کی مثنوی بحر الفت سے مرتب۔

مندرجہ بالا چاروں قصوں کا داستان امیر حمزہ یا رامپور سے کوئی تعلق نہیں۔حمزہ کے سلسلے میں انھوں نے ذیل کی اردو داستانیں لکھیں:

5 ایرج نامہ 5 جلد تصنیف 1868م 1285ھ

6 داستان دریائے نیل ونیلم جادو ولوح گرفتن از متعلقہ ہوشربا ضخیم۔

7 داستان شمالیہ باختر

فہرست کے بعد پروفیسر گیان چند جین نے یہ بھی وضاحت کردی ہے کہ:

''ان کے علاوہ بوستان خیال کے سلسلے میں انھوں نے طلسم ہفت کواکب لکھی۔ ایرج نامے کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب کلب علی خاں نے داستان امیر حمزہ کے دفتر اردو میں لکھانا چاہے تو نوشیرواں نامہ منشی انبا پرشاد کے سپرد کیا اور ایرج نامہ اصغر علی کو دیا۔''[5]

جلال کے والد نے داستانوی ادب میں جو کارنامے انجام دیے ہیں ان پر ابھی کوئی باقاعدہ کام نہیں ہوسکا ہے۔امید ہے کہ آئندہ اس پر توجہ دی جائے گی۔

'داستان بالا باختر' داستان امیر حمزہ صاحب قران کا دفتر سوم ہے۔جس کا اردو ترجمہ جلال لکھنوی نے رامپور میں کیا تھا۔اس کے مطالعے سے ایک اہم بات یہ سامنے آتی ہے کہ جلال لکھنوی کی داستان 'بالا باختر' (غیر مطبوعہ) اور شیخ تصدق حسین کی داستان 'بالا باختر' (مطبوعہ) دونوں ایک ہی فارسی داستان کا اردو ترجمہ ہیں اور اس کا خالق ابوالفیض فیضی ہے جو جلال الدین محمد اکبر کے زمانے میں موجود تھا۔ان دونوں داستانوں کی کہانی اور کردار ایک دوسرے سے اس طرح مماثلت رکھتے ہیں کہ پڑھنے والا بغیر کسی عذر کے یہ کہنے پر مجبور ہوجائے گا کہ یہ دونوں کسی ایک فارسی داستان کا اردو ترجمہ ہیں۔شمس الرحمن فاروقی نے شیخ تصدق حسین کی داستان 'بالا باختر' مطبوعہ کا تجزیہ اپنی کتاب 'ساحری، شاہی، صاحب قرانی داستان امیر حمزہ کا مطالعہ، جلد چہارم: داستان دنیا (1) میں کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ لگانا زیادہ آسان ہوجاتا ہے کہ ان دونوں داستانوں میں مماثلت کہاں تک ہے۔ فاروقی نے ساحری، شاہی، صاحب قرانی (داستان امیر حمزہ کا مطالعہ جلد اول: نظری مباحث) میں طلسم گو ہر بار کا ذکر کرتے ہوئے جلال لکھنوی کی داستان کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ:

''اسی ایڈیشن کے صفحہ 19 پر محمد سلیم الرحمن نے اس داستان کی طباعت اول کے سرورق پر نقل چھاپی ہے۔ اس سے اس کی تاریخ اشاعت 1887 معلوم ہوتی ہے۔ شیخ تصدق حسین کی بالا باختر اول بار 1899 میں چھپی۔ محمد سلیم الرحمن نے لکھا ہے کہ اس داستان کو ایک جلد میں انبا پرساد رسا نے، اور تین جلدوں میں ضامن علی جلال نے بھی لکھا ہے۔ یہ ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔[6]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جلال لکھنوی اور شیخ تصدق حسین کی داستان (بالا باختر دفتر سوم داستان امیر حمزہ صاحب قران) ایک ہی فارسی داستان کا دو اردو ترجمہ ہیں اور جب ہم شیخ تصدق حسین کی داستان کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ واضح ہوجاتا ہے کہ دونوں داستانیں ایک ہی داستان گو نے کہی ہے۔ جلال لکھنوی نے تو اس بارے میں کچھ بھی نہیں لکھا ہے لیکن شیخ تصدق حسین نے اس داستان سے متعلق بعض باتوں کی تفصیل بیان کردی ہے۔ان کے مطابق یہ داستان اکبر بادشاہ کے زمانے میں لکھی گئی تھی۔ مشہور داستان گو فیضی نے اسے فارسی قالب میں ڈھالا تھا۔ شیخ تصدق حسین نے بالا باختر کا اردو ترجمہ (مطبوعہ) صرف ایک جلد میں کیا ہے جب کہ جلال لکھنوی کا اردو ترجمہ (غیر مطبوعہ)

تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ بالا باختر (شیخ تصدق حسین) کے ابتدائی صفحات پر مطبع کی طرف سے (منشی نولکشور کانپور) داستان بالا باختر کے بارے میں یہ لکھا ہے:

''تمام زمانہ پر واضح ہے کہ داستان امیر حمزہ صاحب قران وہ وادی ناپیدا کنار ہے جس کی بالا دوی میں پیک خیال بھی معترف بہ عجز وقصور ہے جن حضرات شائقین نے ان داستانوں کو سنایا ملاحظہ فرمایا ہے وہ کما حقہ واقف وآگاہ ہیں کہ یہ داستانیں برسوں میں بھی تمام نہیں ہوتیں الحق کہ ان کے اصول فارسی کے مصنف ہمہ دان شیخ ابوالفیض فیضی نے جوان داستانوں کو واسطے تفریح طبع جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے اس قدر وسیع البیانی اور نازک خیالی کے ساتھ تصنیف فرمایا کس قدر جانکاہی کی ہوگی۔ اس داستان کے آٹھ دفتر ہیں اور بعض دفتر کئی جلدوں پر مشتمل ہیں حسب ذیل ہیں۔

اول: نوشیرواں نامہ: 2 جلد
دوم: کوچک باختر: 1 جلد
سوم: بالا باختر: 1 جلد
چہارم: ایرج نامہ: 2 جلد
پنجم: طلسم ہوشربا: 7 جلد
ششم: صندلی نامہ: 1 جلد
ہفتم: تورج نامہ: 2 جلد
ہشتم: لال نامہ: 1 جلد

...مذکورہ بالا دفتر بالا باختر جو داستان کا دفتر سوم ہے اور جس کو بلبل ہزار داستان شاخسار بلاغت گل سر سبد چمنستان فصاحت ماہر خوش بیان کامل شیرین زبان تصدق حسین صاحب داستان گو نے حسب تحریک شیخ حامد حسین صاحب از جانب مطبع نولکشور بڑی محنت ومشقت سے بزبان اردو نہایت فصیح وبلیغ ترجمہ فرمایا)۔''7

شیخ تصدق حسین کو سن شعور سے ہی داستان گوئی کا شوق تھا۔ داستان بالا باختر نے اس شوق کو مہمیز کرنے کا کام کیا۔ وہ داستان کے مقدمے میں سبب تالیف کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''شیخ تصدق حسین داستان گو خدمت ناظرین باتمکین میں بصد ادب ملتمس ہے کہ اس حقیر پر تقصیر کو ابتدائے سن شعور سے داستان گوئی کا شوق تھا اور ماہرین اس فن کی خدمت گذاری میں بسر کرتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ کم مائیگی اور عدم لیاقت علمی سد راہ شہرت وترقی تھی تاہم امرا ورؤسا دیگر صنادید شہر نے اپنی عالی ہمتی اور

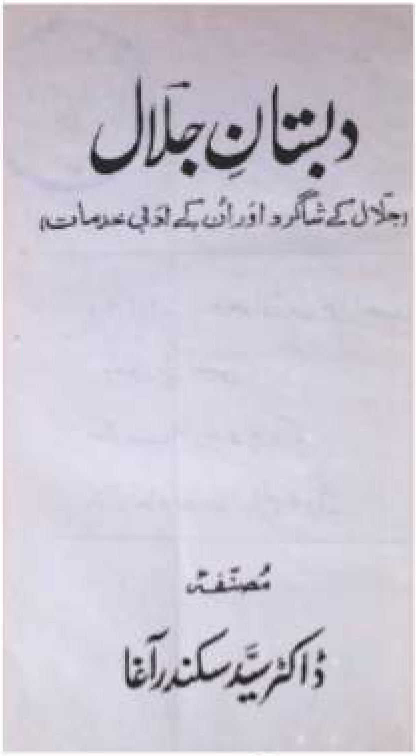

حقیر نوازی سے اس کج مج زبان کے بیان کو پسند فرمایا اور بموجب المرء یقیس علیٰ نفسہ اچھے لوگ بھی اس رو الخلائق کو اچھا سمجھنے لگے۔...امیر با اقبال رئیس با جاہ وجلال شریف وشریف پرور قدر دان اہل علم وہنر زیب وسادہ بہت وبرتری مسند نشین بزم حشمت وبہتری عالی جناب معلیٰ القاب جناب منشی نولکشور صاحب سی آئی ای منشی شیخ حامد حسین کے یہ حکم صادر فرمایا کہ داستان امیر حمزہ صاحب قران کے کل دفاتر کا بزبان اردو بہ عبارت سلیس ومضامین نفیس از طرف مطبع بہ خاکسار کرے۔ چونکہ یہ داستان ایسی ضخیم ہے جس کے ہر دفتر کی ہر ایک جلد روکش بحر زخار ہے اور ان کے اصول بزبان فارسی مصنفہ ماہر ہمہ دان شیخ ابوالفیض فیضی ہیں جنھوں نے برائے تفریح طبع جلال الدین محمد اکبر بادشاہ ہند کے اس داستان عظیم الشان کو نہایت وسیع البیانی اور نازک خیالی کے ساتھ تصنیف کیا تھا اس کمترین کو جرأت نہ ہوتی تھی کہ اتنے بڑے امر بزرگ کی خدمت کا بار انصرام اپنے ذمہ لے لوں، مگر اصرار محبّ موصوف اور ارشاد آقائے نامدار ممدوح سے بمجوائے المامور معذور چار و ناچار خدمت ترجمہ کو منظور کیا اور الحمد اللہ کہ باقبال خداوند نعمت محتشم الیہ باحسن وجوہ دفتر ہائے مفصلہ ذیل کا ترجمہ اس ذرہ بے مقدار کے سعی سے انجام پذیر ہوا۔''8

داستان سے دلچسپی اور شوق جلال کو ورثے میں ملا تھا جلال نے اردو ترجمے کے سلسلے میں داستان کی ابتدا میں ہی لکھا ہے جسے اس داستان کا دیباچہ بھی تصور کیا جا سکتا ہے۔ جو مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ جامع بھی ہے ملاحظہ کریں:

''خوشہ چیں ارباب کمال سید ضامن علی تخلص بہ جلال کی جب ایرج نامہ کی اردو کرنے سے فرصت ہوئی سرکار فیض سے دفتر سویم یعنی کتاب بالا باختر رنگنے کے واسطے عنایت ہوئی۔ اگرچہ یہ ہیچ مداں کج مج زبان لیاقت نثر طرازی اور قابلیت انشاپردازی نہ رکھتا تھا مگر تعمیل حکم سے چارا نہ ہوا۔ ناگزیر خامہ رنگین بیان کو ہاتھ میں اٹھا لیا اور کچھ عبارت بے رنگ لکھنا شروع کیا۔''9

داستان بالا باختر میں جلال لکھنوی نے جا بجا اپنی رباعیات اور اشعار کو شامل کر دیا ہے جس سے اس داستان کی اہمیت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ داستان کی ابتدا اس طرح سے ہوتی ہے ؎

ساقی مے لالہ رنگ سے بھر ساغر
نہ خالی ہوں سبو پلا برابر ساغر
دل کو ہوس شراب اس دور میں ہے
یہ شیشہ پکارتا ہے ساغر ساغر

''نازکی بخش بوستان مضامین کہن چلے، بند شاہدان کو آئین سخن مشام سخنوران کو تروتازہ اور بزم سامعان کو سرمایہ اندوز رونق بھی اندازہ کرتی ہیں کہ جس وقت شمع کا شانہ شان وشوکت نور دیدہ شجاعت وبسالت نونہال گلشن کامران چراغ دودمان صاحب قرانی ملک قاسم امیر کشورگیر سے آزردہ ہو کر یکہ وتنہا وقت شب لشکر سے مل کر ایک طرف کو روانہ ہوا، اثنائی راہی سیارہ بن عمر کے ہاتھ رقعہ اس مضمون کا شاہزادہ بدیع الزماں کو بھیجا کہ میں عازم دربند جالندر یہ جا رہا ہوں اگر تجھے کچھ دعویٰ شجاعت ہے مدعی جرأت ہے تو آ میرے تعاقب میں، عالم تنہائی میں خوب مقابلہ ہوگا وہیں میرے اور تیرے جھگڑے کا فیصلہ ہوگا جو غالب ہو وہ دنگل رستم کا امیر طالب ہو، سیارہ بن عمر نے وہ رقعہ لے کر خیمہ گاہ بدیع الزماں کا راستہ لیا۔ دوسرے دن جا کر دیا بدیع نے اس اس رقعہ کو پڑھا... غیظ وغضب بڑھا اسی وقت یہ بھی لشکر سے نکل کھڑا ہوا اور مرکب صبا رفتار پر سوار ہو کر تعاقب میں قاسم کی چل کھڑا ہوا... سنئے شاہزادہ خاور سیاہ ملک قاسم کا کہ دو پہر رات تک برابر اس نے رہزنی

کی تا صبح مرکب اڑائے ہوئے چلا آیا یہاں تک کہ سامنے دربند جالندریہ کو پایا یہ پہلا دربند ہے ان سات دربندوں میں سے جو علاقہ تک سائل سے رکھتی ہیں ان شاء اللہ العزیز۔''10

جلال لکھنوی نے پہلی جلد میں یہ اہتمام کیا ہے کہ جیسے جیسے واقعات قلمبند کرتے گئے ہیں ویسے ہی ان واقعات کو لال روشنائی سے شروع کرتے ہیں اور یہ سلسلہ صرف اور صرف پہلی جلد تک ہی محدود ہے۔ بقیہ کی دونوں جلدوں میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔

اب یہاں شیخ تصدق حسین کی داستان کا آغاز پیش کیا جارہا ہے۔ تاکہ یہ آسانی سے ذہن نشین ہوجائے کہ دونوں داستانیں ایک ہی فارسی داستان کا اردو ترجمہ ہیں۔ انھوں نے اس داستان کا آغاز حمد، نعت اور منقبت حضرت ابو طالب سے کیا ہے۔ جب کہ جلال لکھنوی نے اپنی داستان کا آغاز رباعی سے کیا ہے۔ داستان بالا باختر (شیخ تصدق حسین) سے اقتباس ملاحظہ کریں:

''جب شہزادہ خاور سپاہ قاسم ذی جاہ اپنے غصہ کو ضبط نہ کرسکے لحاظ و پاس امیر باتوقیر سے ظاہراً تو کچھ نہ کہا مگر لشکر سے تنہا نکل گئے۔ جاتے وقت انھوں نے عیار سیارہ سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ تو جاکر شاہزادہ بدیع الزماں سے میری طرف سے کہہ دینا کہ میں طرف دربند جالندریہ کے جاتا ہوں اگر کچھ آپ کو دعوئ مردی و مردانگی کا ہو تو اسی مقام پر تشریف لائیے۔ اور دنگل رستم کا فیصلہ کرلیجیے۔ قاسم یہ پیغام دے کر سمت دربند جالندریہ کو روانہ ہوئے ادھر سیارہ عیار نے پیغام ملک قاسم کا شہزادہ بدیع الزماں کو پہنچایا۔ حال روانگی بدیع الزماں کا پھر عرض کیا جائے گا۔ اب حال شہزادہ قاسم کا سنیے کہ انھوں نے گھوڑے پر سوار ہوتے ہی سیدھی راہ دربند جالندریہ کی لی۔ اور گھوڑا سرپٹ دوڑاتے ہوئے سیکڑوں کوس نکل گئے۔ جاتے جاتے قریب شام متصل ایک باغ کے پہنچے، چونکہ خستہ بہت ہوگئے تھے، چاہا کہ آج شب کو اس باغ میں آرام لوں، صبح پھر روانہ ہوں گا، اس ارادہ پر دروازہ باغ کا تلاش کرنے لگے۔ مگر چہار جانب ڈھونڈھا در باغ کا کہیں پتا نہ پایا۔ آخر امر مجبور و ناچار ہوکر گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑا طرارہ بھر کے دیوار باغ کو پھاند گیا اور قاسم اندر باغ کے پہنچے۔ جاتے ہی باغ میں ایسی ہوائے سرد و خنک آئی کہ ان کا دل باغ باغ ہوگیا اور ماندگی سفر بھول گئے۔''11

ان دونوں اردو ترجموں میں زبان و بیان کا فرق ہمیں صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔ جہاں ایک طرف جلال لکھنوی نے مشکل اور دقیق الفاظ و محاورات کا استعمال کیا ہے تو وہیں شیخ تصدق حسین نے صاف، سادہ اور سلیس زبان کا استعمال کر کے داستان کو مزید دلکش بنا دیا ہے۔ اور اس طرح نہ صرف داستان میں دلچسپی برقرار رہتی ہے بلکہ قاری نثر کی روانی میں بہتا چلا جاتا ہے۔ اسے اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔

داستان بالا باختر کے اہم کرداروں میں سیارہ بن عمر، شاہزادہ بدیع الزماں، سینی، شاہزادہ خاور سپاہ، ملک قاسم، امی سعید، بختیارک، مالک اژدر، ماہ لقا، ملکہ شمہ خونریز، قوت شاہ، ملکہ گیتی افروز (لقائے بے بقا کی بیٹی)، مہروند عیار، حمزہ ایلچی، دل فگار، زمرد شاہ، باختر، عمر، اسد، امیر بلا خان، خواجہ جادوگر، نمیرہ حمزہ، مریخ جادوگر وغیرہ ہیں۔ اس داستان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں کئی ملکوں کی نشاندہی کی گئی ہے اس میں ملک اصفہان، چین، ترکستان، ملک صفوانیہ، ملک جالندریہ، ملک بربر اور شہرزبیدہ وغیرہ کا ذکر آیا ہے۔

شیخ تصدق حسین کے ترجمے کی متعدد خوبیاں ہیں۔ انھوں نے اردو کے انداز و اسلوب کو پیش نظر رکھا ہے۔ تاکہ نثر کا حسن اور داستان کی جمالیات کو بہتر طور پر اردو کے قالب میں منتقل کیا جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عبارت کا ترجمہ کرتے وقت شیخ تصدق حسین جلال پر فوقیت لے جاتے ہیں۔ تقابلی مطالعہ پیش نظر نہیں ہے مگر بطور تعارف یہ باتیں بھی پیش نظر رہنی چاہیے۔

دونوں ترجموں کو سامنے رکھ کر کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں زبان و بیان کا نمایاں فرق نظر آئے گا۔ جلال کی زبان مقفّی و مسجّع ہے جب کہ شیخ تصدق حسین کی زبان میں سلاست و روانی ہے۔ ایسی صورت میں داستان کو پڑھنے کا ایک الگ لطف ملتا ہے۔ جلال نے زبان و بیان کے خارجی پہلوؤں کو اختیار کیا ہے جسے عرف عام میں لکھنوی انداز کہا جاسکتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ترجمہ کرتے وقت زبان و بیان پر اس طرح توجہ نہیں دی جیسا کہ شیخ تصدق حسین نے دی۔ جلال لکھنوی نے فارسی لفظیات کو برتنے سے گریز نہیں کیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شیخ تصدق حسین کے ترجمے کو پڑھ کر اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا ہے جب کہ جلال کے ترجمے میں یہ خوبی کم پائی جاتی ہے۔ جلال کو شعری اظہار میں جو مرتبہ حاصل ہے وہ نثر میں نہیں ہے۔ اس داستان کا مطالعہ کرنے والوں کا یہ ایک عمومی احساس ہے۔ سہیل بخاری نے لکھا ہے کہ:

''مصنف اگرچہ زبان اردو کے ماہر اور اعلیٰ پایہ کے شاعر ہیں، لیکن ان کی نثر کو ان کی شاعری سے کوئی نسبت نہیں ہے، عبارت پر فارسی کے ترجمہ کو اثر صاف نمایاں ہے۔ اور اگرچہ روزمرے اور محاورے پر ان کی خاص توجہ ہے پھر بھی بیان میں کوئی دل کشی نہیں ہے۔ فارسی کی ترکیبوں کے علاوہ لفظوں اور فقروں کی ترتیب بھی فارسی ہی کی ہے۔ اور جہاں فارسیت سے ہٹ کر عبارت میں روانی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اسلوب کا توازن قائم نہیں رہ سکا ہے۔ 12

مجموعی طور پر جلال لکھنوی کی ادبی خدمات کا دائرہ وسیع ہے۔ ایک اہم شاعر کے طور پر ان کی حیثیت مسلم ہے۔ جیسا کہ پہلے ہی عرض کیا گیا ہے کہ شاعری کے ساتھ خصوصاً زبان و لغت پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ یہ بات داستان کے ترجمے سے واضح ہوجاتی ہے کہ جلال کو اپنے قدیم سرمایے سے بھرپور واقفیت تھی۔

حوالے

1 رسالہ نگار، راز یزدانی، ص:15، مارچ 1953
2 جلال لکھنوی: سوانح حیات، کلام پر تنقید مع انتخاب کلام، پروفیسر محمد حسن، ص159
3 اردو داستان تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر سہیل احمد بخاری، ص278
4 اردو کی نثری داستانیں، گیان چند جین، ص698
5 اردو کی نثری داستانیں: گیان چند جین، ص:98-697
6 ساحری، شاہی، صاحب قرانی داستان امیر حمزہ کا مطالعہ جلد اول: نظری مباحث، شمس الرحمٰن فاروقی، ص445
7 بالا باختر، منشی نولکشور، ص1
8 بالا باختر، شیخ تصدق حسین، ص1
9 داستان بالا باختر، جلد اول، جلال لکھنوی، ص1، 2
10 ایضاً، ص2-3
11 بالا باختر، شیخ تصدق حسین، ص4
12 اردو داستان تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر سہیل بخاری، ص279

■

Mohd Saeed Akhtar
613/P-18(kha-514)Near Zainab Masjid
Millat Nagar Dhal Faizullah Ganj
Lucknow- 226020 (UP)
mohdsaeedakhtarr@gmail.com

امیر حسن

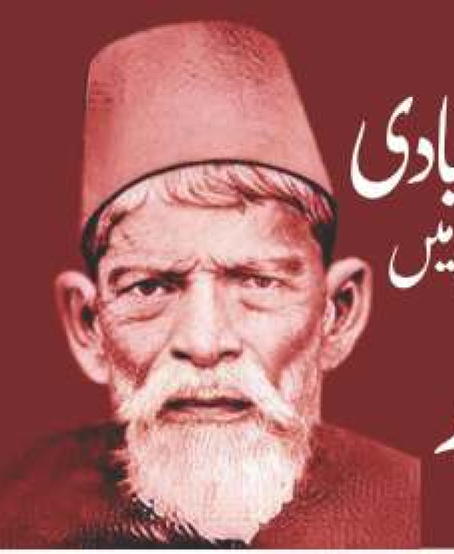

اکبر الہ آبادی کی شاعری میں مشرق کا تصور

تجھے ہم شاعروں میں کیوں نا اکبر معتبر سمجھیں
بیاں ایسا کہ دل مانے زباں ایسی کہ سب سمجھیں

اکبر الہ آبادی دنیائے شاعر میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ہندو پاک کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی اپنے مخصوص لب و لہجے کی وجہ سے کافی معروف ہیں۔ اکبر کی شاعری سے ہر خاص و عام واقف ہے۔ اکبر الہ آبادی کو وہ قدر و منزلت نصیب نہ ہوئی جس کے وہ حقدار تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ رہی کہ ان کو صرف اور صرف طنز و مزاح کا شاعر تصور کیا گیا۔ لیکن اکبر کی شاعری ہمیں ایک تاریخ کی طرف اشارہ دیتی ہے۔ اس کے علاوہ اکبر کی شاعری ہندوستانی تہذیب و تمدن کی علمبردار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کوئی قوم اپنی تہذیب و ثقافت اور روایات و واقعات سے پہچانی جاتی ہے۔ قومیں اپنے اوصاف کی بقا کے لیے بھرپور کوششیں کرتی ہیں۔ یقیناً کسی بھی قوم کی بقا اور عظمت اس کی تہذیب اور ثقافت میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ دنیا کی تمام تر زندہ قومیں اپنی تہذیب اور روایتی ورثے سے بہت محبت کرتی ہیں اور اس کے لیے بڑی بڑی قربانیاں پیش کرتی ہیں۔

اکبر الہ آبادی نے عوامی ذہنیت کو پستی میں گرنے سے بچانے کی کوشش کی۔ نوآبادیاتی نظام یعنی (Neocolonialism) کے ذریعے ہونے والے نقصانات سے ہندوستانی عوام کو آگاہ کیا۔ اردو ادب کی پوری تاریخ میں اس نوآبادیاتی نظام کے خلاف شعوری طور پر جن لوگوں نے ردعمل ظاہر کیا ان میں اکبر الہ آبادی کا نام سرفہرست ہے۔

اکبر نے عوامی ذہنیت کو بلندی پر لے جانے کے لیے اور ان کو پستی سے باہر لانے کے لیے ضروری سمجھا کہ عوام کو آہستہ آہستہ ان کے برتر ہونے کا احساس دلایا جائے۔ دوسری جانب انھوں نے نئے خیالات اور نئی فکر کو اپنی کڑی تنقید کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کیا اور جہاں کہیں ان کی نگاہ میں کسی نئی فکر اور نئے خیالات میں مضر اثرات ابھرتے تو انہوں نے فوراً اپنی شاعری کی ذریعے سے ہندوستانیوں کو آگاہ کیا۔

اکبر جب ہندوستانیوں کو مشرقی تہذیب و تمدن کے اوصاف سے خالی اور مغرب کی اندھی تقلید میں مبتلا دیکھتے تو ان کو مشرقی تہذیب و تمدن اور ثقافت و روایت ملیا میٹ ہوتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اکبر الہ آبادی مشرقی تہذیب و تمدن کے علمبردار تھے۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ یہ چیزیں جو انگریزوں کی طرف سے آرہی ہیں یہ ہمارے لیے غلامی کی علامت ہیں۔ ریل، انجن، بھاپ، برقی لیمپ، مشین، کلیسا اور موٹر وغیرہ ان تمام چیزوں کو اکبر علامت کی سطح پر لے رہے تھے اور ان سب کو غلامی کی علامت سمجھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے ذریعے ہمیں ذہنی طور پر غلام بنایا جا رہا ہے۔ اکبر الہ آبادی کو اس سے شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی تہذیب کو خود ہی ملیا میٹ کرنے کا خوف ستا رہا تھا۔

شمس الرحمٰن فاروقی اکبر الہ آبادی کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اکبر کی پہلی عظمت اس بات میں ہے کہ (مہاتما گاندھی اور اقبال دونوں نے مغرب اور اس کی تہذیب و تعلیم کو براہ راست اور بہت قریب سے دیکھا تھا) لیکن اکبر نے ملک کے باہر جائے بغیر اس تہذیب اور تعلیم کی علامتوں اور مضمرات کو سمجھ لیا۔"

(اکبر الہ آبادی: نوآبادیاتی نظام اور عہد حاضر: شمس الرحمٰن فاروقی، ص 8)

اکبر الہ آبادی بنیادی طور پر مشرق پرست تھے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مشرق ہی میں سب کچھ ہے۔ ظاہری بات ہے کہ ہر انسان کو اپنی پرانی چیزوں سے محبت ہوتی ہے اور اگر اکبر الہ آبادی نے مشرقی تہذیب و تمدن کے تحفظ کے لیے مغربی تہذیب و تمدن کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے نقادوں نے اکبر الہ آبادی کو قدامت پرست اور نہ جانے کیا کیا کہا ہے۔ جدید تعلیم کے نام ہماری مشرقی تعلیم، روحانی اقدار اور تہذیبی روایات کو کس طرح مٹایا اور تعلیم کو صرف مادیت پرستی کی طرف لے جایا جا رہا، ان امور کو پوری شدت کے ساتھ اکبر الہ آبادی نے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔

اکبر کے تصور مشرق کو ان کے اشعار کی روشنی میں بہتر انداز سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اپنے اشعار میں مشرق و مغرب کے تہذیبی اقدار، تعلیمی نظام، نئے پرانے کی آمیزش اور تعلیم نسواں کو بڑی شدت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

جب نئی تعلیم دی جانے لگی تو نئی کتابیں یعنی نئے نصاب کی ضرورت بھی ہوئی۔ اس بات کی طرف اکبر نے اشارہ کیا ہے کہ ایسی کتابوں کو پڑھ کر بچے اپنے والدین کو پاگل، مجنوں اور خبطی سمجھنے لگتے ہیں اور ایسی کتابیں جن سے لوگوں کے ذہن اور سماجی اقدار میں تنزل آجائے تو انھیں ضبط کر لینا ہی بہتر ہے۔

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

مذکورہ شعر میں لفظ 'شیخ' کو ایک کردار بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اکبر الہ آبادی شیخ کو مشرقی اقدار کے نمائندے کے طور پر پیش کرتے ہیں یعنی اپنی پرانی چیزوں پر چلنے والا۔ یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ شیخ صاحب نے درست کہا تھا کہ تعلیم کے بدل جانے سے دل بھی بدل جاتے ہیں۔ تعلیم کے ذریعے سے انسان کو کسی بھی طرف موڑا جا سکتا ہے اس بات کو اکبر الہ آبادی بخوبی دیکھ اور سمجھ رہے تھے۔ اس کے برعکس یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ تعلیم انسانوں کے اذہان کو بدل دیتی ہے۔ اس کی جیتی جاگتی مثال ہمیں اپنے آس پاس دیکھنے کو مل جائے گی۔

اکبر الہ آبادی نے جہاں ایک طرف مشرقی تعلیمی نظام، مشرقی تہذیب و تمدن اور مشرقی روایات کو اپنی شاعری میں جگہ دی اور ان کے تحفظ کا بیڑا اٹھایا تو وہیں دوسری طرف مغربی تہذیب و تمدن کو اپنی شاعری کے

ذریعے سے طنز کا نشانہ بھی بنایا۔ اکبر الہ آبادی کی شاعری سے مشرقی تہذیب وتمدن کو سمجھا جا سکتا ہے۔

مل کا آٹا ہے نل کا پانی ہے
آب و دانہ کی حکمرانی ہے

بظاہر یہ بہت عجیب شعر معلوم ہوتا ہے لیکن اس شعر میں پورا تہذیبی انہدام دیکھنے کو ملتا ہے۔ 'مل کا آٹا' یعنی چکی کے بجائے مشین کے ذریعے سے گیہوں پیسا جا رہا ہے۔ 'چکی' مشرقی تہذیب کا حصہ ہے۔ 'نل کا پانی'، ہمارے یہاں قدیم دور میں نل کا تصور نہیں تھا بلکہ لوگ پانی حاصل کرنے کے لیے کنواں کا سہارا لیتے تھے۔ لیکن موجودہ دور میں ایسا نہیں ہے۔ کنویں کی تہذیب پورے طریقے سے مٹ چکی ہے۔ نل کے آجانے سے ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ پہلے ہم اپنی مرضی سے جب جی چاہا پانی نکال لیے، لیکن اب ہم کسی کے تابع ہو گئے۔

پائپ کوئی کھلا نہیں گھر میں لگی ہے آگ
اب بھاگنا ضرور ہوا غور کیا کریں

یہاں لفظ 'پائپ' کا استعمال شاعر نے طنز کے طور پر کیا ہے۔ کیونکہ اس کے پس پردہ ہماری پوری کنویں کی تہذیب خطرے میں دکھائی دیتی ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ کنویں کی تہذیب پورے ہندوستانی سماج سے غائب ہو چکی ہے۔ پائپ سے پانی ایک وقت تک ہی آتا ہے، اس کے بعد بند ہو جاتا ہے۔ اس لیے شاعر طنز کستے ہوئے کہتا ہے کہ تمام پائپ بند ہیں اور گھر میں آگ لگی ہوئی ہے، اس پر قابو پانا مشکل ہے۔ دوسرے مصرعے میں اشارہ ہے کہ ایسی صورت حال میں اب انسان صرف ادھر ادھر ہی بھاگ سکتا ہے۔ وہ غور وفکر کرنے کے بھی پوزیشن میں نہیں ہوتا ہے۔ اگر کنواں ہوتا تو شاید آگ پر قابو پالیا جاتا ہے، لیکن افسوس کہ پائپ کی وجہ سے کنویں کا وجود ہی ختم ہو چکا ہے۔

قمرالدین احمد بدایونی لکھتے ہیں کہ اکبر نے مذکورہ شعر کی توجیہ حسب ذیل بیان کی ہے:

''اکبر نے فرمایا کہ تھوڑا عرصہ ہوا چوک کی دکان میں آگ لگ گئی۔ اس وقت پائپ بند ہونے کی وجہ سے رعایا کا سخت نقصان ہوا۔ میں نے مذکورہ شعر اس خیال سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ اگر اس وقت زمانہ سابق کی طرح کنویں ہوتے تو آگ بروقت قابو میں لائی جا سکتی تھی۔ شہروں میں ترمیم دیکھو کہ حکمران طبقہ اور امرا سول لائن میں ہیں۔ غربا کے لیے زیست کے دن گزارنے کے واسطے شہر کے گندے گوشے علاحدہ ہیں۔ مراد اس سے یہی ہے کہ نہ امیر وغریب یکجا ہوں گے، نہ ایک دوسرے کے دکھ درد سے ہمدردی ہوگی۔''

(بزم اکبر: مولوی قمرالدین بدایونی، ص20)

اس کے علاوہ اکبر کے تعلق سے لوگوں کے درمیان یہ مشہور ہے کہ اکبر عورتوں کی تعلیم کے خلاف تھے۔ لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اکبر عورتوں کی تعلیم کے خلاف نہیں بلکہ وہ عورتوں کی آزادی کے خلاف تھے۔ اس آزادی کے خلاف تھے جس آزادی کی بات انگریز کرتے تھے۔ اس تعلیم کے خلاف تھے جس تعلیم کی بات انگریز کرتے تھے۔ ہمارے سماج میں عورتوں کو دیوی جیسے پاک لفظ سے پکارا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مشرقی تہذیب نے عورتوں کو ایک اعلیٰ مقام عطا کیا ہے۔ اس بات کو بھی اکبر کے کلام کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ کیا واقعی اکبر عورتوں کی تعلیم کے خلاف تھے یا صرف اور صرف اکبر کے ساتھ اس تہمت کو لگا دیا گیا ہے۔

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

جب تک حامدہ نے مغربی تعلیم حاصل نہیں کی تھی یعنی انگریزی نہیں سیکھی تھی، اس وقت تک اس کے چمکنے کا تصور ہی نہیں تھا، یعنی وہ گھر کا چراغ تھی، لیکن جب اس نے انگریزی کی تعلیم حاصل کر لی تو وہ شمع انجمن ہونے لگی۔ محفل میں زیادہ اہمیت کی حامل بن گئی۔ ہماری مشرقی تہذیب میں لڑکیوں کو گھر کے چراغ کی مانند سمجھا جاتا ہے اور ان کو پردے میں رکھا جاتا ہے۔ لیکن انگریزی تعلیم کی وجہ سے آج کی تاریخ میں ہماری لڑکیاں شمع محفل بنی ہوئی ہیں۔ اس تعلیم نے ہمارے تہذیبی اقدار کو پامال کر دیا ہے۔

تعلیم دختراں سے یہ امید ہے ضرور
ناچے دلہن خوشی سے خود اپنی برات میں

مغربی تعلیم جو لڑکیوں کو دی جا رہی ہے یا مغرب سے جو تعلیم ہمارے یہاں آئی ہوئی ہے، اس تعلیم سے صرف بے حیائی اور برائی کے علاوہ اچھائی کی امید نہیں کی جا سکتی ہے۔ جو دلہن ہے وہ خود اپنی شادی میں ناچ رہی ہے۔ ہمارے یہاں آج بھی لڑکیاں شادی کی بات سن کر شرم سے دور چلی جاتی ہیں، لیکن جب سے ہمارے یہاں کی لڑکیوں نے مغربی تعلیم حاصل کی ہے ان کے اندر سے شرم وحیا بالکل ختم ہو چکی ہے۔

مذکورہ بالا جو اکبر الہ آبادی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بات ہرگز نہیں نکالی جا سکتی ہے کہ اکبر عورتوں کی تعلیم کے خلاف تھے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکبر اس تعلیم کے خلاف تھے جو معاشرے میں بے حیائی اور بے پردگی کو جنم دے۔ ایک سچے اور محب قوم کی حیثیت سے اکبر الہ آبادی کی دور بینی اور گہری بصیرت ہر لحاظ سے قابل داد ہے۔ اکبر الہ آبادی نے مشرقی تہذیب و تمدن کی بقا کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہے۔ ہر آنے والی مصیبتوں سے ہندوستانیوں کو بیدار کیا ہے۔ اس کے فوائد اور نقصانات کے بارے میں بتایا ہے۔ اکبر الہ آبادی انگریزوں کی چال بازیوں کے خلاف تھے۔ انھیں اس بات کا پورا احساس ہو گیا تھا کہ یہ لوگ ہماری صدیوں پرانی تہذیب وتمدن کو پامال کر دیں گے، ہمیں غلامی کی زنجیر میں جکڑ دیں گے اور ہمیں ذہنی غلام بنا دیں گے اور یہی ہوا بھی کہ ہندوستانی قوم ایک طرح سے ذہنی غلامی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔

اکبر الہ آبادی کبھی بھی ترقی کے خلاف نہیں تھے۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے لوگوں کو بار بار توجہ دلا رہے ہیں کہ غلامی کی زندگی جینے سے بہتر ہے کہ کچھ صنعت و حرفت کی طرف توجہ دی جائے۔ جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ موجودہ دور میں خاص طور سے نئی تعلیمی پالیسی میں Vocational Education یعنی پیشہ ورانہ تعلیم کی طرف ہماری حکومتیں خاص توجہ کر رہی ہیں، جبکہ اس بات کی طرف اکبر نے پہلے ہی اپنے اشعار کے ذریعہ بتایا تھا کہ ہمیں ان چیزوں کو سیکھنے اور پڑھنے کی ضرورت ہے جو کہ نا صرف ناموری کا ذریعہ ہوں بلکہ ان سے زندگی کو با مقصد اور آسان بھی بنایا جا سکے۔ نظم کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو، جس میں وہ نوجوانوں کو صاف صاف تلقین کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور سیکھو
اٹھو تہذیب سیکھو، صنعتیں سیکھو، ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے اطراف دنیا میں سفر سیکھو
خواص خشک و تر سیکھو، علوم بحر و بر سیکھو

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اکبر الہ آبادی کی شاعری ہندوستانی تہذیبی اقدار کا نوحہ ہے۔ اکبر کی اسی ناقدانہ بصیرت اور ماضی و مستقبل شناسی کے مدنظر انھیں ایک عہد ساز شاعر قرار دیا جا سکتا ہے۔

■

Ameer Hasan
Research Scholar, Dept. of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025
Mob.:7503551548
ameerhasan2013@gmail.com

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ و ماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط و تفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

جدیدیت کی فلسفیانہ اساس

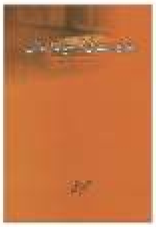

نام مصنف: شمیم حنفی

صفحات: 336، قیمت: 195 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ہند

مبصر: عبدالرحمٰن، اسسٹنٹ پروفیسر، راجندر انگر، چھپرا، بہار

اردو زبان و ادب میں پروفیسر شمیم حنفی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، وہ ایک اعلیٰ درجے کے نقاد، اچھے ڈرامہ نگار اور شاعر تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو میں درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ ان کی تصنیفات میں نئی شعری روایت، تاریخ تہذیب اور تخلیقی حسیت، آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ، غزل کا نیا منظر نامہ، بازار میں نیند، جدیدیت اور نئی شاعری وغیرہ شامل ہیں۔

یہ کتاب پروفیسر شمیم حنفی کے تحقیقی مقالے ''بیسویں صدی کی اردو شاعری میں جدیدیت کی فلسفیانہ اساس'' کے ابتدائی چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب 'جدیدیت کا تاریخی تصور، ہندوستان میں جدید دور کا آغاز اور جدید شاعری کی تحریک' ہے۔ دوسرا باب 'جدیدیت کی فلسفیانہ اساس اور بیسویں صدی کے فکری میلانات کا ایک جائزہ' ہے۔ تیسرے باب میں 'جدیدیت اور سائنسی عقلیت، بیسویں صدی کے تہذیبی مسائل، سائنس اور ٹکنالوجی' کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ چوتھا باب 'جدیدیت اور اشتراکی حقیقت نگاری، مارکسزم اور ادبی تصور کی حیثیت سے ترقی پسند تحریک کی بنیادیں' ہے۔

پہلے باب میں مصنف کتاب نے جدیدیت کے محرکات اور اسباب و علل کو اختصار و جامعیت کے ساتھ اس ہنرمندی سے بیان کیا ہے کہ 'ہندوستان میں جدید دور' کا پس منظر قاری کے سامنے فلیش بیک کی طرح ابھر آتا ہے۔ اس ضمن میں اسپنگلر، ارسطو اور چیخوف جیسے مفکرین کے خیالات کی روشنی میں: فرانس اور جرمنی کی جنگ، ہندوستان میں مغلوں کی شکست اور انگریزوں کی حکمرانی اور اس کے نتیجے میں ملک میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا جو منظرنامہ پیش کیا گیا ہے اس کی وجہ سے 'جدیدیت کی تفہیم' آسان تر ہوگئی ہے۔

دوسرے باب میں مذاہب عالم اور خصوصی طور پر مغربی مفکرین (برٹرینڈ رسل، یاسپرس، ڈارون، مارکس، لینن، ناگارجن، کارل باتھ کا ڈویل، میکس ملر، ہائیڈیگر، بوبر، مرلوپونتی، گوئٹے، فرائڈ، یونگ، ایڈلر، تکنسٹائن، ہیوم، نیوارتھ، ایئر اور مور وغیرہ) کے افکار و نظریات کی روشنی میں 'جدیدیت کی فلسفیانہ اساس' کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس (جدیدیت کی فلسفیانہ اساس) کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ 'زندگی کی خواہش اور زندگی سے بیزاری کا احساس، بے چارگی اور نامرادی کے حوصلہ شکن تجربے اور علم کی پیاس بجھانے کے لیے کائنات کی تسخیر کے منصوبے، دنیا سے دوری کا خیال اور ایک نئی دنیا کی تعمیر کا خواب، حال سے پابستگی اور ماضی کی بازید کا جذبہ اور مستقبل کے امکانات کی جستجو، تھکن اور لاحاصلی کا کرب اور اَن دیکھی منزلوں کی تلاش، فطرت کے ہر بھید کو تعقل کی روشنی سے بے حجاب کرنے کی ہوس اور یک گونہ بے خودی کا شوق؛ بیسویں صدی کے فلسفیانہ افکار و میلانات کی دیواریں انھیں تضادات کی بنیادوں پر استوار ہوئی ہیں۔' یعنی اس باب میں زندگی کی اس کشمکش کو بنیاد بنایا گیا ہے جس سے انسان کسی نہ کسی طرح نبرد آزما ہوتا ہے۔

تیسرا باب 'جدیدیت اور سائنسی عقلیت: بیسویں صدی کے تہذیبی مسائل سائنس اور ٹکنالوجی' ہے۔ اس باب میں چند سوالات کو بنیاد بنا کر استدلالی طور پر جدیدیت اور سائنس کے مابین ایک رشتہ قائم کرتے ہوئے جدیدیت اور سائنس کے درمیان پیدا شدہ خلا کو بھرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ سائنس کی ایجادات جدید تو ہیں لیکن وہ ان معنوں میں جدیدیت سے مختلف ہیں جہاں جدیدیت مسائل کا حل موت میں نہیں ڈھونڈھتی بلکہ زندگی کی بساط پر الجھنوں کو سلجھانا چاہتی ہے۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ 'سماجی اور تمدنی سطح پر تعقل سے قربت ہی بظاہر جدید انسان کا پیمانہ ہے۔ پھر جدیدیت عقل کے تسلط

سے انکار کیوں کرتی ہے؟ سائنس تہذیب جدید کی کامرانیوں کا نشان بھی ہے اور اس کی قوت بھی۔ اس کے باوجود روح عصر کے ترجمان اور روح عصر پر اثر انداز ہونے والے بیشتر مفکر سائنس یا سائنسی طریق کار سے گریزاں کیوں ہیں؟ ان سوالات کی روشنی میں انھوں نے جدیدیت پر مبسوط اور مربوط گفتگو کی ہے۔

چوتھا باب 'جدیدیت اور اشتراکی حقیقت نگاری، مارکسزم اور ادبی تصور کی حیثیت سے ترقی پسند تحریک کی بنیادیں' ہے۔ اس باب میں جدیدیت اور ترقی پسندی کے حوالے سے استدلالی بحث کرتے ہوئے ثابت کیا گیا ہے کہ ترقی پسندی ایک جدید نظریہ تو ہے لیکن کسی ایک نپے تلے اصول کا پابند ہونے کی وجہ سے اسے جدید کہنا درست نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں 'مارکسزم اشتراکی حقیقت نگاری کی بنیاد ہے اور اشتراکی حقیقت نگاری بین الاقوامی سطح ادب میں ترقی پسند تحریک کا سرچشمۂ فیض۔ ترقی پسندی کو کبھی جدیدیت کی ضد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی صالح جدیدیت کے نام سے۔ مارکس نے انسانی تاریخ کے حالیہ ادوار پر جو گہرے اور دور رس اثرات مرتب کیے ہیں اس کی حیثیت ایک مسلم الثبوت واقعہ کی ہے۔ مارکس نے تاریخ کے ایک نئے شعور، حقائق کی ایک نئی آگہی اور انسانی مسائل کی تفہیم و تجزیے کے لیے ایک نئی بصیرت کی داغ بیل ڈالی۔ انسان کے اقتصادی رشتوں اور طبقاتی جدوجہد کی بنیاد پر تاریخ کو ایک نیا تناظر بخشا۔ اس نے تہذیب کو ایک نئے معنی ہی سے آراستہ نہیں کیا، اپنے افکار کی بنیاد پر تہذیب کے سفر کی نئی راہیں بھی روشن کیں، لیکن ان تمام خصائص کے باوجود سماجی نظریے کی طرح انسان کے ہر مسئلے کا حل فراہم کرنے سے قاصر ہے۔' اس لیے ترقی پسندوں کا 'جدید صالح' واہمہ جدیدیت سے الگ ہے۔

جدیدیت کی اساسی تفہیم میں اس کتاب کی جگہ مسلم ہے۔ مصنف کتاب اس بات کے خود قائل ہیں کہ 'جو مسائل ان کتابوں میں زیر بحث آئے ہیں ان کی شبیہیں اب پہلے جیسی نہیں رہیں۔ دنیا بدلی تو لوگ بھی بدلے۔ خود میری اپنی ترجیحات میں، گرد و پیش کی دنیا کے عمل اور ردعمل کی نوعیتوں میں، دیکھے اَن دیکھے بہت سے فرق پیدا ہو گئے۔ اپنی روایت اور فکری میلانات، بالخصوص انیسویں صدی کی عقلیت اور بیسویں صدی کی ترقی پسندی، جدیدیت (اور مابعد جدیدیت) کے بارے میں میرے سوچ بچار کا سلسلہ متذکرہ کتابوں کی تکمیل کے ساتھ ختم نہیں ہوا۔ اپنی روایت کے ساتھ ساتھ اپنی فکر اور اپنے موقف پر نئی حقیقتوں اور نئی شخصی اور اجتماعی صورت حال کے سیاق میں نظر ثانی کی کوششوں سے میں دست بردار بھی نہیں ہوا۔' اس لیے ممکن ہے کہ اس کتاب میں موجود کچھ قضیے حسب حال درست نہ معلوم ہوتے ہوں لیکن یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ جدیدیت کے حوالے سے یہ کتاب ذہن کو بالیدگی اور سوچنے کا ایک معیار عطا کرتی ہے۔ یہ کتاب ایک سنجیدہ قاری کو جدیدیت کی روح اور اس کی جڑ تک پہنچنے میں معاون ہے۔ امید کرتا ہوں کہ اردو زبان و ادب کے طلبہ اس کتاب سے استفادہ کریں گے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی ۔ 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہوپاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

تحقیق و تنقید

اردو تنقید نقوش و نشانات

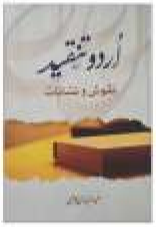

مصنف: ڈاکٹرعبدالباری قاسمی

صفحات: 224، قیمت: 300 روپے، اشاعت: 2024

ناشر: مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹرمفتی اشتیاق احمد قاسمی، کمرہ نمبر 4

شیخ الاسلام منزل، دارالعلوم دیوبند۔ 247554 (یوپی)

’تنقید‘ معیار بندی اور معرفتِ مقام ومرتبہ سے عبارت ہے، اردو زبان میں لفظ تنقید تنقیص اور عیب جوئی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، مگر اردو ادب میں خاص اصطلاح مراد لی جاتی ہے، اس کے لیے ’نقد‘ بھی استعمال ہوتا ہے۔ نقد کے معنی پرکھنے کے ہیں، یعنی زبان کی خوبی اور خرابی اس کے ذریعے پرکھی جاتی ہے۔ (القاموس الوحید) تنقید سے زبان کی فنی، فکری، جمالیاتی اور دوسرے پہلو اجاگر ہوتے ہیں، ہر زبان میں تنقید کی روایت ملتی ہے، اردو زبان میں بھی تنقید نے ایک مضبوط فکری اور نظریاتی بنیاد قائم کر لی ہے، بہت سے دبستان وجود میں آگئے ہیں۔

اردو ادب کے تنقیدی منظر نامے کو اگر دیکھا جائے تو اس میں مختلف نظریاتی رجحانات پائے جاتے ہیں، مثلاً ’ساختیات‘، ’مابعد ساختیات‘، ’نسائی تنقید‘، مابعد نوآبادیاتی تنقید وغیرہ اس میں شامل ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ دوسری زبان کی طرح اردو تنقید میں بھی زیادہ تر تنقید کا مطمحِ نظر ’شاعری‘ رہی ہے، شاعری کے محاسن اور معائب اس میں بیان ہوئے ہیں۔

حالی کی ’مقدمہ شعروشاعری‘ کو اردو تنقید میں خشتِ اول کی حیثیت حاصل ہے۔

’ترقی پسند تحریک‘ کے ذریعے سجاد ظہیر، علی سردار جعفری اور اختر حسین رائے پوری جیسے نقاد سامنے آئے، ’جدیدیت‘ اور ’مابعد جدیدیت‘ کے ذریعے داخلی جذبات، انفرادی تجربات اور فنی جمالیات کے تناظر میں بھی اردو کو پرکھا گیا۔

ڈاکٹر عبدالباری قاسمی کی کتاب ’اردو تنقید نقوش ونشانات‘ میں تنقید کی روایت، تاریخ، نظریے، رجحانات اور تصورات پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ نمونے پیش کیے گئے ہیں، مصنف نے ’مغربی تنقید‘، ’مشرقی تنقید‘ اصول تنقید وغیرہ پر گفتگو کی ہے، مشرقی زبانوں میں ’چینی، جاپانی، سنسکرت‘ اور دوسری زبانیں آتی ہیں، موصوف نے ان سب زبانوں میں تنقید کے نقوش تلاش کیے ہیں، عربی زبان کی تنقیدی تاریخ کو بیان کرتے ہوئے زمانۂ جاہلیت میں تنقید کی روایت اور طریق کار کو واضح کیا ہے، ’اسلامی دور اموی اور اور عباسی دور‘ کے ناقدین اور ان ادوار کے نظریات پر بھی خامہ فرسائی کی ہے، ’فارسی روایت تنقید‘ میں قومی اور بین قومی شعرا کے تذکرے کیے ہیں، اردو زبان چونکہ فارسی زبان سے نکلی ہے، علامہ شبلی نے فارسی زبان کو اردو زبان کی ماں کہا ہے، اردو میں عربی افعال، اسماء، مفردات، مرکبات اور مادے خوب استعمال ہوئے ہیں، بنابریں اردو شاعری کی تنقید کو بیان کرتے ہوئے عربی اور فارسی اصول نقد کو چھوڑنا مناسب نہیں تھا، اس لیے ان اصول وضوابط کو بھی مصنف نے رقم کیا ہے، اس ضمن میں ’علمِ بلاغت‘ کے تینوں ابواب یعنی ’علمِ معانی، علمِ بیان اور علمِ بدیع‘ سے اصول تنقید اخذ کیے ہیں، اس لیے کہ ان کے بغیر اردو میں تنقید مشکل ہے، چنانچہ صنائع لفظی اور صنائع معنوی، حقیقت، مجاز، تشبیہ، کنایہ وغیرہ کے قابلِ توجہ مواد کو نقل کیا ہے، اس کے بغیر اردو تنقید نگار کامیابی کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھا سکتا، انھوں نے ’علمِ عَروض وقوافی‘ کے کچھ اصول وضوابط سے بھی استفادہ کیا ہے، ان کے بغیر شاعری کی تنقید مشکل ہے۔

کتاب میں مشہور نقاد وصحافی حقانی القاسمی کا مقدمہ نہایت عمدہ ہے، اس نے کتاب کی رونق میں اضافہ کر دیا ہے، حقانی القاسمی چونکہ عربی زبان میں بھی اچھی خاصی دسترس رکھتے ہیں، اس کی باریکیوں سے خوب واقف ہیں اور فارسی زبان سے بھی کافی مانوس ہیں، اس لیے انھوں نے جو مقدمہ لکھا ہے اور تجزیہ کرتے ہوئے جو اپنی تنقیدی رائے لکھی ہے، وہ بالکل درست اور برمحل ہے، نظریات وتصورات کو بیان کرتے ہوئے جن کتابوں کے حوالے دیے ہیں اور جس جامعیت کے ساتھ لکھا ہے، یہ بس انھی کا حصہ ہے، کتاب کے مواد کی وسعت، گہرائی وگیرائی سے اندازہ ہوا کہ عزیز القدر عبدالباری قاسمی نے کافی محنت کی ہے، یہ کتاب طلبا اور اساتذہ دونوں کے لیے مفید ہے۔

ترتیب

منظر کلیم :فن اور شخصیت

مرتب: ڈاکٹر اختر آزاد

صفحات: 240، قیمت: 400 روپے

ناشر: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس

زیر اہتمام: کوکن سہارا، ویلکم، بھیونڈی

مبصر: فرحان حنیف وارثی، پوسٹ باکس نمبر: 4546

ممبئی سینٹرل پوسٹ آفس، ممبئی۔ 400008 (مہاراشٹر)

ڈاکٹر اختر آزاد کی مرتب کردہ کتاب ’منظر کلیم :فن اور شخصیت‘ کو چار ابواب منظر کلیم :فن اور شخصیت، منظر کلیم کے مضامین (فکشن)، منظر کلیم کے مضامین (شاعری) اور ’منظر کلیم کے دیگر مضامین‘ پر محیط ہے۔

انھوں نے اپنے ’پیش لفظ‘ بعنوان ’منظر کلیم کی شخصیت کے نشیب وفراز‘ میں لکھا ہے: ’منظر کلیم نے اپنی زندگی میں بہت سارے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں، جس کی اہم وجہ ذریعۂ معاش ہے۔ اسکول میں پڑھایا۔ لیڈیز کارنر کھولا، کالجوں اور اسکولوں میں ضروری اشیا کی سپلائی کی۔ اردو کمپوزنگ میں بھی ہاتھ آزمایا۔ لیکن پیسے کی تنگی سے ہمیشہ جوجھتے رہے۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ رہی کہ ان کی اکلوتی اولاد کو اپنی زندگی سے لڑنے کے لیے ہر روز انسولین لینا پڑتا تھا۔ افسوس صد افسوس کہ ان کا وہ بیٹا بھی سال بھر انجکشن لیتے لیتے زندگی سے ہار کر ان سے جا ملا۔ لیکن منظر کلیم زندگی سے ہارنے والے انسان نہیں تھے۔‘

’منظر کلیم :فن اور شخصیت‘ نامی باب میں ڈاکٹر حسن امام ملک، ہاجرہ بیگم، جے نندن (ہندی کتھاکار)، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، پروفیسر احمد بدر، ڈاکٹر افسر کاظمی، انور امام، تنویر اختر رومانی، ممتاز شارق اور نیاز اختر کے مضامین ہیں۔ ’منظر کلیم کے مضامین (فکشن)‘ نامی باب میں 13، ’منظر کلیم کے مضامین (شاعری)‘ نامی باب

میں 6 اور 'منظر کلیم کے دیگر مضامین' نامی باب میں 3 مضامین ہیں۔

منظر کلیم (مرحوم) کی اہلیہ ہاجرہ بیگم اپنے مضمون 'میرے شوہر' میں لکھتی ہیں: 'میرے شوہر مرحوم کلیم اللہ خان کئی شخصیت کے مالک تھے۔ان کی تعلیم میری تعلیم سے کہیں زیادہ تھی۔لیکن تعلیم کا فرق ہماری زندگی کو اثر انداز نہیں کر سکا۔حالانکہ وہ صرف بی اے تھے لیکن ایم اے اور پی ایچ ڈی والوں کی رہنمائی بھی کیا کرتے تھے۔ ریسرچ اسکالر ہمیشہ ان سے ملنے آیا کرتے تھے اور وہ کسی نہ کسی صورت میں ان کی مدد کیا کرتے تھے۔'

ہاجرہ بیگم نے ایک جگہ لکھا ہے: 'میرے شوہر کے مزاج میں سختی کچھ زیادہ تھی۔ یہ شاید انھیں اپنے دادا سے وراثت میں ملی تھی۔دادا کی صحبت میں بالکل نہیں رہے۔ وہ تو پاکستان میں تھے۔لیکن خط و کتابت سے مزاج کی سختی کا موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ ویسے ان کی شخصیت میں مرحوم پروفیسر منظر کاظمی اور پروفیسر سید احمد شمیم کا بھی کافی اثر رہا ہے۔'ہاجرہ بیگم کا مضمون مختصر مگر جامع ہے۔

ڈاکٹر افسر کاظمی نے اپنے مضمون 'منظر کلیم اور میں' میں مرحوم سے اپنی قربت کا تذکرہ کیا ہے۔انھوں نے لکھا ہے: 'میرے ساتھ ان کا رویہ ہمیشہ شفقت بھرا رہا۔میں بھی ان کو اپنا بڑا بھائی مانتا تھا۔جمشید پور میں 'اردو قبیلہ' کے کئی پروگرام میں نے آرگنائز کیے، جس میں 'منظر کاظمی ایوارڈ' کسی ایسے ادیب کو دیا جاتا تھا جو منظر کاظمی کے بعد کی نسل سے تعلق رکھتا ہو۔اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں منظر کلیم بھائی کا بھرپور تعاون شامل رہا ہے۔'

ہندی کتھا کار جے نندن اپنے مضمون 'اصلی اور نقلی رچناؤں کے پارکھ' میں لکھتے ہیں: 'منظر کلیم پرتاپ گڑھ، اتر پردیش کے مول نواسی تھے اور ان کی برادری پٹھان تھی، لیکن کہاوتوں میں جو پٹھانوں کی آن بان شان اور اکڑ ہوتی ہے، اسے کبھی انھوں نے خود میں اجاگر ہونے نہیں دیا۔یہاں تک کہ اپنے نام میں خان تک لگانا انھوں نے مناسب نہیں سمجھا۔دنیا کی آبادی کتنی بھی بڑی ہو جائے، ایسے شائستہ اور ذہین لوگ کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔وہ میری یادوں کے گلیارے میں ہمیشہ دستک دیتے رہیں گے۔'

منظر کلیم (مرحوم) جے نندن ہی نہیں، اپنے سبھی ملنے جلنے والوں کی یادوں کے گلیارے میں دستک دے رہے ہیں۔وہ ایسی شخصیت تھے کہ انھیں کوئی بھول نہیں سکتا ہے۔ مذکورہ کتاب میں شامل مضامین سے مرحوم منظر کلیم کے فن اور شخصیت کے مخفی پہلو روشن ہوتے ہیں۔ایک ایسا ہی مضمون ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کا ہے۔ 'منظر کلیم کی داستان، درد کا بیان' نامی اس مضمون کے مطالعے سے مرحوم منظر کلیم کے درد کا پتا چلتا ہے۔ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کے مطابق: منظر کلیم ہر محفل اور سمینار میں اپنا الگ زاویہ نظر رکھتے تھے۔وہ بھری محفل میں کوئی بھی بات کہہ دیتے۔انھیں اس بات کا کوئی خیال نہیں ہوتا کہ کوئی برا مانے۔وہ تخلیق کے مرکزی خیال تک جلد پہنچ جاتے تھے۔وہ افسانے کے بہترین ناقد تھے۔افسانوی نشست میں ان کی رائے کی بہت اہمیت ہوتی تھی۔ان کے مضامین بھی کئی معتبر رسائل میں شائع ہوئے۔مجری ادب پر ان کی خاص نظر تھی۔'

پیش نظر کتاب میں منظر کلیم صاحب کے چند مضامین بھی ہیں، جن کی قرأت سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں مضمون نویسی کے فن پر عبور حاصل تھا۔ان کے تین چار مضامین میں نے یہاں وہاں سے پڑھے۔ایک ایسا ہی مضمون 'اختر آزاد کی افسانوی پیش رفت' بھی ہے۔

انھوں نے لکھا ہے: 'اختر آزاد کے افسانے حالات حاضرہ کے اہم موضوعات پر مبنی ہوتے ہیں اور موضوع کا انتخاب ہی ان کی انفرادیت ہے۔ایک باخبر انسان کی طرح اپنے گرد و پیش کے مسائل اور وقوعے پر نظر رکھتے ہیں اور فنکاری کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔موضوعات ملکی ہوں یا بین الاقوامی آفات قدرتی ہوں یا انسان کی پیدا کردہ، دکھ ذاتی ہو یا اجتماعی، پیچیدگی جنسی ہو یا نفسیاتی، یہی سب کچھ ان کے افسانوں کے موضوع ہوتے ہیں۔ان کے افسانوں کو پڑھتے وقت یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ یہ واقعہ یا سانحہ کہیں ہوا ہے۔' مذکورہ کتاب کی ورق گردانی سے مرحوم کی فنی اور شخصی خوبیوں کا پتہ چلتا ہے۔

'منظر کلیم: فن اور شخصیت' نامی مذکورہ کتاب 'صائمہ ایڈورٹائزرس' (بھیونڈی) اور 'کوکن سہارا ویکلی' (بھیونڈی) کے زیر اہتمام ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔

صحافت

اردو صحافت کا آغاز و ارتقا

مصنف: ذاکر حسین ذاکر
صفحات: 732، قیمت: 999 روپے، سنہ اشاعت: 2024
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی
مبصر: ایم نصر اللہ نصر، شالیمار اپارٹمنٹ'
3/A ستین بوس روڈ بلاک سی با کولتا' ہاوڑہ کولکاتا

معروف ادیب ذاکر حسین ذاکر کی کتاب 'اردو صحافت کا آغاز و ارتقا' صرف صحافت کی تاریخ بیان نہیں کرتی بلکہ صحافت کے دوسو سالہ ارتقائی منازل سے بھی بحث کرتی ہے۔ہندوستان میں ابتدا سے لے کر اب تک جتنے موقر اخبارات و رسائل منظر عام پر آئے ہیں ان کی مکمل تفصیل اس کی زینت ہے۔نیز ان تمام ادبی اداروں اور اکادمیوں کے تذکرے بھی شامل ہیں جو اردو کی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ صحافت پر ایسا نہیں کہ کام نہیں ہوا ہے، ہوا ہے، بڑی اور ضخیم تاریخی و تحقیقی کتابیں بھی منظر عام پر آئی ہیں مگر کہیں نہ کہیں ان میں تشنگی کا احساس باقی رہ گیا ہے۔ایسا نہیں ہے کہ اردو صحافت پر یہ کتاب مکمل ہے۔نہیں اس میں بھی کسی کو کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ کمی کا احساس ضرور ہوگا۔اس کے باوجود یہ اپنے آپ میں کافی اہم، معلوماتی اور صحافتی لحاظ سے تشفی بخش ہے۔

اس میں کل باب ساٹھ ہیں اور ہر باب میں کئی کئی مضامین شامل ہیں، کل ملا کر ڈھائی سو کے قریب عنوانات قائم کیے گئے ہیں اور ان کی تفصیل درج ہے جیسے: پہلے باب میں پچیس عنوانات کے تحت گفتگو کی گئی ہے: صحافت کیا ہے، صحافت کا ابتدائی پس منظر، ایسٹ انڈیا کمپنی، ہندوستان میں صحافت کا پس منظر، بنگال ایشیاٹک سو سائٹی اور مسٹر ولیم جونس، کچھ دیگر اخبارات، اخباروں کے لیے پہلا قانون، فورٹ ولیم کالج، کلکتہ جرنل اور بکنگھم، مراۃ الاخبار اور راجہ رام موہن رائے، اردو کا پہلا اخبار جام جہاں نما اور ہری ہر دت، فارسی کا پہلا اخبار کون، 1935 کا نیا پریس ایکٹ،

دہلی اردو اخبار اور مولوی محمد باقر عنوانات کے تحت 1850 کے دو اخباروں ویکن ٹرائبر کا انگریزی اخبار دہلی گزٹ اور مولوی محمد باقر کا اخبار دہلی اخبار کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے جو انتہائی معلوماتی اور دلچسپ ہے۔ اس کے علاوہ عظیم بغاوت کے اسباب، عظیم بغاوت میں مولوی محمد باقر کا رول، اعلان جہاد کے بعد عظیم بغاوت کا کمزور ہونا، کرامتوں کا انتظار، دہلی کی تباہی، صلح و آشتی کی کوششیں، مولوی محمد باقر، مولوی محمد باقر کی گرفتاری اور سزائے موت، صحافت کے فروغ میں دہلی کالج کا رول۔ مولوی محمد باقر کی زندگی، نیز ان کی صحافتی زندگی کی عکاسی کافی معلوماتی ہے۔ خصوصی طور پر ان کی قید اور قتل کا واقعہ تو اور دلچسپ اور جاں گسل ہے۔ 1830 سے 1857 کے درمیان شائع ہونے والے کچھ اہم اخبارات کی تفصیل کے علاوہ ممبئی، مدراس و پنجاب اور کلکتہ کے اہم اخبارات کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ میڈیا کیا ہے؟ اور اس کی موجودہ صورت حال کیا ہے۔ اس کے علاوہ سوشل میڈیا کے تعلق سے بھی اچھی گفتگو کی گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موصوف نے جس عنوان پر خامہ فرسائی کی ہے، بھرپور کی ہے۔ ایسے ایسے حقائق کا انکشاف کیا ہے، جن کے بارے میں کم ہی لوگ جانتے ہوں گے۔ جو بھی لکھا ہے تحقیق اور تصدیق کے بعد ہی لکھا ہے۔ ثبوت کے طور پر کافی حوالے اور کوٹس بھی دیے گئے ہیں۔ ان کی تحریر میں اس قدر دلچسپی اور معلومات کے خزانے یکجا کیے گئے ہیں کہ دامن مطالعہ لبریز ہونے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر آزاد ہند: عبدالرزاق ملیح آبادی اور احمد سعید ملیح آبادی کے باب میں دونوں کے سوانحی خاکے، ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ آزاد ہند اخبار کا آغاز کیسے ہوا۔ اس سے پہلے عبدالرزاق صاحب کس کس اخبار سے منسلک رہے۔ ان سے علاحدگی کے بعد کیسے ہفتہ وار اجالا سے نئی صحافتی زندگی کا آغاز کیا، پھر روزنامہ آزاد ہند نکالا، اس کا سلسلہ کب تک جاری رہا اور کیوں، کیسے سیاست نے مدیروں کی صحافتی زندگی کو برباد کی اور وہ بے دام ہو گئے۔ کیسے موقر اخبارات مالی کمی کے باعث بند ہوتے چلے گئے، کیسے احمد سعید ملیح آبادی کے ایم۔ پی بنتے ہی آزاد ہند کی نیو گرنے لگی۔ کیسے وہ سارد ھا گروپ کے ہاتھوں فروخت ہو گیا اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ یہ ایک تلخ تاریخی حقیقت ہے جس کو ذاکر صاحب نے کافی چھان پھٹک کر اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

تمام اخبارات کی حیات اور ناپید ہونے کی پوری پوری تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ چاہے الہلال ہو یا البلاغ ہو، کامریڈ، ملاپ، روزنامہ انقلاب، قومی آواز، ہند سماچار، سیاست، نئی دنیا، اردو ٹائمز، نشیمن، یا راشٹریہ سہارا۔ سبھی کے تعلق سے تشفی بخش بحث اس کتاب میں موجود ہے۔ ممبئی سے شائع ہونے والا صابر دت کا ششماہی رسالہ فن اور شخصیت پر نادر معلومات کے علاوہ ہمیں ماہنامہ شاعر، ماہنامہ شگوفہ اور ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد پر تفصیلی معلومات فراہم کی گئی ہے۔ پہلے انھوں نے سوانحی اور تاریخی کوائف بیان کیے ہیں پھر مختلف شہروں کے اخبارات کا پھر ہفتہ وار، پندرہ روزہ اخبارات کا پھر ماہانہ رسائل کا۔ ساتھ ہی ملک کی بڑی لائبریریوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ادبی ادارے اور انجمنوں کا محاسبہ بھی کافی معلوماتی ہے۔ سرکاری اکادمیوں اور ان کی کارکردگی کا بھی حوالہ موجود ہے۔ ان کی سرپرستی میں نکلنے والے ماہانہ اور سہ ماہی رسائل کا بھی جائزہ خوب لیا گیا ہے۔ اردو صحافت میں دلچسپی رکھنے والے قارئین اور صحافت پر کام کرنے والے محققین، نقاد اور ریسرچ اسکالرز کے لیے یہ کتاب بیش قیمت معلومات کا خزانہ ہے۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب نئی نسل اور صحافت پر تحقیق کرنے والوں کے لیے کافی معاون و مددگار ہے نیز قارئین کے لیے معلومات کا خزانہ ہے۔ اس کتاب کی تحقیق و تصنیف میں مصنف نے بہت محنت کی ہے، عرق ریزی کی ہے تب کہیں جا کر یہ مایہ ناز سرمایہ افتخار ہمارے سامنے منظر عام پر آسکا ہے۔ ذاکر حسین ذاکر کا یہ کارنامہ قابل ستائش ہے۔

فکشن

احساس کی زمیں (افسانوی مجموعہ)

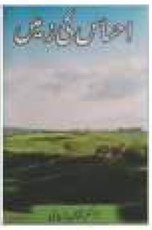

مصنف: ڈاکٹر نشاں زیدی، دہلی

صفحات: 128، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: کتابی دنیا، ترجمان گیٹ، دہلی

مبصر: ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں

غوث منزل، تالاب ملا ارم، رام پور 244901 (یوپی)

اس مجموعے کا پہلا افسانہ 'معاہدہ' ہے۔ یہ افسانہ سروگیسی کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔ آج یہ مسئلہ شہری زندگی سے ہوتے ہوئے عالمی سطح کو چھونے لگا ہے۔ وہ عورت جس نے کسی بھی صورت سے ایک بچے کو جنم دیا ہے اس کی محبت اس بچے کے ساتھ ہونا فطری بات ہے۔ یہ افسانہ عورت کے انھی فطری جذبوں کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ افسانے میں جذبات نگاری دل کو چھو لینے والی ہے۔

دوسری کہانی 'بونس' مالک اور مزدوروں کی کہانی ہے۔ مزدور کن امیدوں میں جیتا ہے اور مالک اس سے بونس دینے کے بہانے کتنے وعدے کرتا ہے اور پھر ان کو وعدے کے مطابق ان کا حق نہیں دیتا۔ غریبوں اور مزدوروں اور نوکری کرنے والی خواتین کے مسائل کو اس افسانے میں اجاگر کیا گیا ہے۔

انسانی زندگی کتنے نشیب و فراز اور دکھ و آلام سے گزرتی ہے اور اس کو کن آزمائشوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ یہ افسانہ 'انش' میں دکھایا گیا ہے۔ قربانی کوئی بھی کسی کے لیے بھی دے سکتا ہے۔ راجیش جس کی کڈنی خراب ہو گئی تھی اس کو ایک ایسی عورت نے اپنی کڈنی دان کی جو خود اسپتال میں ایک بستر پر پڑی ہوئی ہے۔ اس طرح یہ کہانی انسان کے پاکیزہ جذبوں کی رہنمائی اور عکاسی کرتی ہے اور یہ درس بھی دیتی ہے کہ ہمیں انسانی خدمات کے لیے ہر وقت اور ہر حالت میں تیار رہنا چاہیے۔

'نئی راہ' بچپن کی پروان چڑھتی محبت کی ایک کہانی ہے جس میں لڑکی کے بڑھتے قدموں کو روکنے کے لیے والد نے کسی دوسرے شہر میں اپنا ٹرانسفر کرا لیا ہے۔ لڑکی کو ڈانٹنے، مارنے پیٹنے کے بجائے والد نے ایک شائستہ قدم اٹھایا اور لڑکی سے کچھ نہیں کہا بلکہ خاموشی سے اپنا کام کر لیا۔ کہانی کی زبان شائستہ اور مہذب ہے۔

'آخری سفر' رشیدہ کے چار بچے ہیں، دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ بیٹے امریکہ چلے گئے اور ان کی شادیاں بھی ہو گئیں۔ دونوں بیٹیوں کی بھی شادی ہو گئی۔ دونوں بھائی ماں کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے راضی نہیں تھے۔ چھوٹی بیٹی صائمہ جس کی ابھی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ میں، ماں کو اپنے گھر لے جاؤں۔ اس فیصلے سے سب خوش ہوتے ہیں اور چاروں بہن بھائی ماں کے کمرے میں جاتے ہیں لیکن وہاں

مکمل سناٹا تھا کیونکہ ماں آخری سفر پر روانہ ہو چکی تھیں۔انسانی زندگی ان ہی چھوٹی بڑی خوشیوں اور دکھوں سے دوچار ہے۔ماں باپ جو ہزار جتن کے ساتھ اپنے بچوں کو پالتے ہیں، ان کی خوشیوں کی دعائیں کرتے ہیں۔آخری وقت میں وہی ماں باپ اولادوں کو مسئلہ نظر آنے لگتے ہیں۔افسانے میں جذبات نگاری عروج پر ہے۔نشاں زیدی اپنے افسانوں میں تجسس کو بھی آخری سطر تک برقرار رکھتی ہیں۔

'تصویر کا دوسرا رخ' افسانے میں خواتین کے مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔دراصل آج کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مرد سے زیادہ ایک عورت دوسری عورت پر مظالم ڈھاتی ہے۔ساس بہو کا جھگڑا اور قضیہ تو ایک ازلی جھگڑا ہے۔اس کے مختلف روپ اور اس کی متعدد شکلیں ہیں۔افسانہ نگار نے نہایت خوبی اور ایک اچھے پلاٹ کے ساتھ اس افسانہ کو انجام تک پہنچایا ہے۔

موبائل کی دنیا بھی اپنے اندر جہاں ہزاروں رنگینیاں لے کر آتی ہے وہیں افسانہ نگاروں نے اس کو موضوع بنا کر سیکڑوں افسانے بھی لکھ ڈالے ہیں اکثر کھودا پہاڑ نکلا چوہا والا محاورہ سامنے آتا ہے۔'قدرت کا فیصلہ' افسانہ میں جو لڑکی کسی کو میسج کر رہی ہوتی ہے وہ لڑکی عمر دراز عورت ہوتی ہے یا کوئی لڑکا کسی لڑکی سے چیٹنگ کر رہا ہوتا ہے تو وہ دراصل ایک عمر دراز شخص ہوتا ہے۔

'احساس کی زمین' انسانی نفسیات کی ایک دلکش کہانی ہے۔جو خواتین گھریلو ذمے داریوں کے ساتھ نوکری بھی کرتی ہیں ان کے سامنے بہت سے مسائل بھی آتے ہیں۔یہ مسائل گھریلو بھی ہوتے ہیں اور آفس کے بھی۔یہ افسانہ بھی اگرچہ مناسب ہے لیکن اختتامیہ کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑتا۔

کسی بھی وجہ سے یا اپنی کسی غلطی کی بنا پر جو لوگ سرحد پار کر کے پڑوس کے کسی ملک میں چلے جاتے ہیں، ان کو کن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کے گھر والے کس ذہنی الجھن اور پریشانی اور مصیبت کا سامنا کرتے ہیں اس افسانے کا مرکزی خیال انہی باتوں کو رکھا گیا ہے اور اس افسانے کا نام بھی 'سرحد' ہے۔افسانہ انسانی جذبات کی عکاسی کرتا ہے اور ان حالات میں لوگ کس دکھ سے دوچار ہوتے ہیں اس کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔

'فنکار' کوڑا جمع کرنے اور ان میں سے کام کی چیزیں تلاش کرنے والے ایک شخص اور ایک مستری کی کہانی ہے۔کہانی کے تانے بانے کورونا وائرس اور لاک ڈاؤن سے جوڑے گئے ہیں۔لاک ڈاؤن میں لوگوں نے کیسی پریشانیاں اٹھائی ہیں اس کی بھی عکاسی اس کہانی میں کی گئی ہے۔

لاک ڈاؤن میں لوگوں نے کیسی کیسی مصیبتیں اٹھائی ہیں اور دوسروں سے امداد لے کر کس طرح اپنی انا کو مجروح اور زخمی کیا ہے اس کا بیان افسانے میں ملتا ہے۔اس افسانے کا عنوان 'لاک ڈاؤن' ہے اور یہ ایک اچھا افسانہ ہے اور قاری کو چونکاتا ہے کہ ان لوگوں سے کوئی امداد نہ لو جو کچھ دینے کے بدلے فوٹو کھنچ کر اور اپنا نام کمانے کی خاطر اسے سرخی بنا کر اخباروں میں چھپواتے ہیں۔افسانہ بہت متاثر کن ہے اور ایک اچھے پلاٹ اور اسلوب کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

'قدرت کا کھیل' افسانہ بھی کورونا وائرس اور لاک ڈاؤن کی پابندیوں اور مصیبتوں کو اجاگر کرتا ہے۔جہاں اس میں ہزاروں لاکھوں لوگوں کی موت ہوئی وہیں بہت سے دیگر دلچسپ واقعات بھی رونما ہوئے جیسے مقررہ اور طے شدہ تاریخوں سے پہلے ہی لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیاں کر دی گئیں۔اس طرح وہ شادیاں محض نکاح تک محدود رہ گئیں جن میں لاکھوں روپے خرچ کرنے کے انتظامات کیے گئے تھے۔افسانہ دلچسپ بھی ہے اور لاک ڈاؤن سے فائدہ اٹھانے والوں کی روداد بھی بیان کرتا ہے۔

قلم کار کہیں سے بھی کہانی اٹھا سکتا ہے۔ایک واقعہ، ایک جملہ یا کبھی کوئی ایک لفظ بھی کہانی لکھنے کا سبب بن جاتا ہے۔ایسے ہی ایک معمولی سے واقعہ کو لے کر 'بھکارن' افسانہ لکھا گیا ہے۔غربت کہاں اور کس طرح مجبوریوں سے دوچار کرتی ہے، یہ افسانہ پڑھ کر اندازہ ہو جاتا ہے۔

'نئی صبح' افسانہ پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کا جنسی تلذذ عمر کے کسی دور میں بھی ختم نہیں ہوتا۔افسانے کو ایک اچھے پلاٹ کے ساتھ لکھا گیا ہے۔زبان سادہ لیکن پُر اثر اور پُر وقار ہے۔کہانی کا اختتامیہ اور کلائمکس اچھا ہے۔

'خدشہ' افسانے میں ایک اچھا موضوع اٹھایا گیا ہے۔والدین کو بچے کے رجحان کے مطابق اسکول کالج میں مضامین دلانے چاہئیں۔اس کی دلچسپی جس سبجیکٹ میں ہو وہی اس کو دلانا مناسب رہتا ہے اور امتحان میں کم نمبر آنے پر بچے کو ڈانٹنا، مارنا، شرمندہ کرنا یہ سب کام نامناسب ہیں کیونکہ اس طرح بچے انتہائی قدم اٹھا لیتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر لوگوں کو اولاد سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔اچھے پلاٹ کے ساتھ اس افسانے کو لکھا گیا ہے جو پُر تاثیر بھی ہے اور ایک درسِ عمل بھی دیتا ہے جس پر عمل پیرا ہو کر کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔

'گاؤں کا لڑکا' اس کتاب کا آخری اور اچھا افسانہ ہے۔ایک بے روزگار نوجوان کو جب کہیں نوکری نہیں ملتی ہے تو اس کے والد اپنے چچازاد بھائی کے پاس اس کو بمبئی بھیج دیتے ہیں جو کروڑپتی آدمی ہے لیکن جب یہ لڑکا وہاں پہنچتا ہے تو پہلے تو دربان اس کو بنگلے کے اندر جانے ہی نہیں دیتا۔بالآخر بدقت تمام وہ وہاں پہنچتا ہے تو اس کے چچا اس کو پہچان کر بھی نظریں پھیر لیتے ہیں۔دوستوں کے پوچھنے پر وہ بتاتے ہیں کہ یہ میرے گاؤں کا لڑکا ہے۔اس افسانے کے اندر جو حالات بیان کیے گئے ہیں وہ آج کے سماج کی سچی تصویر پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر نشاں زیدی کے افسانے صاف ستھرے ہیں۔ان کی زبان اچھی ہے۔

شاعری

دریچے کی دھوپ

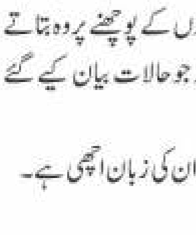

شاعر/مصنف: زبیر الحسن غافل

صفحات: 125، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ساجد عبید، الف 149/1، چوتھی منزل

شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی 11025

'دریچے کی دھوپ' زبیر الحسن غافل کی تخلیق ہے جو 125 صفحات پر مشتمل ہے۔یہ ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔پہلا شعری مجموعہ 'اجنبی شہر' تھا۔اس مجموعہ کا اہم اور قابل ذکر پہلو اس کا تنوع ہے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی غزلوں کو ان کے فرزند اسلم حسن نے ترتیب دیا ہے۔پروفیسر شہاب ظفر اعظمی نے زبیر الحسن غافل کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

غافل کی شاعری سے گزرتے ہوئے یہ حقیقت پہلی نظر میں سامنے آتی ہے کہ ایک زندہ توانا اور متحرک شاعر جس کی قوت متخیلہ نامیاتی، زرخیز اور کائنات گرد ہے، ان کا خالق ہے۔ غافل خوشبو، خوبصورتی اور روشنی کے متلاشی ایک بے چین و بے قرار شاعر ہیں۔ یہ بے چینی اور بے قراری شاید اس لیے ہے کہ متعفن فضا نے خوشبوؤں کو جلاوطن کر دیا ہے۔ بدصورت کرداروں نے خوب صورتی کو کال کوٹھری میں بند کر رکھا ہے۔ تاریکی نے روشنی کو مقفل کر دیا ہے۔ شاعر بے چین اور بے قرار ہے۔ خوشبو، خوبصورتی، روشنی اور رنگ و آہنگ کے متلاشی غافل کے غموں، تنہائیوں، اشکوں، ویرانیوں، جدائیوں، دہشتوں اور تمناؤں کے معانی اسی تناظر میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ بہتر دنیا، بہتر ماحول اور بہتر زندگی کی جستجو غافل کے آؤٹ لُک کا خصوصی خاکہ ہے۔

حقانی القاسمی شاعر کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

''درون ذات کھڑکیاں کھلی ہوئی ہوں تو تجربات، محسوسات، مشاہدات، واردات اور وقوعات تخلیقی وجود میں تحلیل ہوکر احساس و اظہار کو متحرک توانائی اور تابندگی عطا کرتے ہیں۔ کوئی بھی حساس، باشعور بیدار ذہن ایک ہی موسم اور منظر میں منجمد اور محصور نہیں رہتا۔ بدلتے موسموں اور منظروں کی کیفیات اور کہانیاں اس کی تخلیق کا حصہ بن جاتی ہیں۔ زبیر الحسن غافل بھی ایک رنگ میں قید نہیں رہے، ان کے یہاں وہ سب رنگ ہیں جو حیات و کائنات کے حریم میں ہیں۔ ان کے یہاں شوخی بھی ہے، سنجیدگی بھی، تمازت ہے اور تمکنت بھی، تلاطم ہے اور سکون بھی، باہر کی دنیا سے بھی ربط ہے اور اندر ایک اور ہی دنیا آباد ہے جس میں اداسیاں، محرومیاں، تنہائیاں ہیں اور شادمانیاں بھی۔ کرب ذات سے لے کر آشوب عصر تک ان کی شاعری کا حصہ ہے، نہ ان کا احساس محدود ہے اور نہ اظہار، ہر صنف میں ان کی طبیعت رواں ہے۔ نظم، قطعہ، رباعی ہو یا غزل اظہار میں پختگی ہے اور بیان میں لطافت۔ کلاسیکیت سے ذہنی قربت ہے، اس لیے مقتل، قفس، مجنوں، محمل، جام و میکدہ جیسے استعارے اور علائم بھی ہیں، خوش آہنگ الفاظ اور خوبصورت تراکیب بھی۔ زبیر الحسن غافل نے زمانے کے مدوجزر اور نشیب و فراز کو بہت قریب سے دیکھا ہے، اس لیے ان کے مشاہدات اور تجربات کا رقبہ بہت وسیع ہے۔ ان کی شاعری میں علاقائی نہیں آفاقی تناظر ہے۔ زبیر الحسن غافل کے شعری تخیل میں ایسی قوت ہے کہ کوچہ قاتل کو کوئے جاناں، صحرا کو گلزار اور بیاباں کو گلستاں میں بدل دیتی ہے۔ ان کے تخیل اور انداز بیاں نے ان کی شاعری کو جو رنگ بخشا ہے، اس میں ان کا کوئی سہیم و شریک نہیں۔ زبیر الحسن غافل نے اپنی آرزوؤں، تمناؤں، خوابوں اور خواہشوں کو شعری زبان دی ہے، یہ ان کے اندر آباد دنیا کی آواز ہے، اس میں دیگر آوازوں کا شعور شامل نہیں ہے۔ یہ حدیث دوستاں نہیں حکایت دل ہے۔''

پروفیسر شہاب ظفر اعظمی اور حقانی القاسمی کے تاثرات سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ہی حضرات نے غافل کی شاعری کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ درج ذیل اشعار ان نظریات کے عکاس ہیں، ملاحظہ کیجیے۔

زور طوفان کا تھم تو جانے دو — پھر چراغوں میں روشنی ہوگی
مانند قفس قید ہوں پتھر کے مکاں میں — میں اب حصار ذات سے باہر نہیں آتا
بکھر کے راہوں میں گرد سفر نہ ہو جاؤں — مرے سفر کا الٰہی یہ اختتام نہ ہو

یہ آنچل تو نشان عظمت و تقدیس عورت ہے — اسے آنچل ہی لکھوں گا کبھی پرچم نہ لکھوں گا
تجھ سے رہ کر دور میں زندہ رہوں ممکن نہیں — اس سے بہتر ہے کہیں مرجانا تیرے شہر میں
یاد ہے مجھ کو جدائی کا وہ منظر اب تک — زلف صحرا کی طرح آنکھ کا دریا ہونا

ان کی نظم میرا وجود کا ایک بند دیکھیے۔

یہ میرا جو وجود ہے — یہ ہست ہے کہ بود ہے
رواں بھی یہ جمود بھی — یہ شور بھی سکوت بھی
اسے خاک ہونے کا شوق بھی — اسے آرزوئے نمود بھی

مزاحیہ وطنزیہ قطعات دیکھیے۔

رخ پہ نقاب اُس کے تھا مکر و فریب کا — جو شخص صاف گو تھا بڑا باضمیر تھا
قاتل سے ہاتھ اس نے بھی آخر ملا لیا — پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

کل ملا کر زبیر الحسن غافل کا مجموعہ 'دریچے کی دھوپ' رنگا رنگ پھولوں سے سجا گلدستہ معلوم ہوتا ہے، اس میں ذات اور کائنات کے موضوعات پر طنز و ظرافت کی روشنی میں شاعر نے سب کچھ کہہ کر انھیں شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ وہ اپنے خلوص، ان تھک جدوجہد اور لگن سے مسلسل کامیابی کی منزلیں طے کرتے آرہے ہیں۔

بیاض دل

شاعر: ڈاکٹر محمد عارف حسن

صفحات: 136، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: صغریٰ میموریل پبلک لائبریری۔ سیوان۔ 841226

مبصر: سعدیہ پروین، استاذ اردو

دکھی رام انٹر کالج، کدوا، ضلع کٹیہار، بہار، 855105

ڈاکٹر محمد عارف حسن نے اپنی عملی زندگی کی شروعات طبابت سے کی۔ لیکن ان کی زندگی کے ابتدائی دور میں شاعری کا جو چسکا لگا اسے سینے سے لگائے رکھا جس کا رنگ آخری وقت میں اور گہرا ہوتا گیا۔ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود موصوف جستہ جستہ اشعار کہتے رہے۔ اب ان کا پہلا شعری مجموعہ 'بیاض دل' زیور طبع سے آراستہ ہوکر قارئین کے ہاتھوں میں آیا ہے۔ یہ ان کی غزلوں کا خوبصورت گلدستہ ہے۔

ڈاکٹر محمد عارف حسن کو شاعری ورثے میں ملی۔ ان کے والد بزرگوار اصغر حسن مجیبی مستند و معتبر شاعر کی حیثیت سے معروف تھے۔ ان کا مزاج قلندرانہ تھا۔ انھوں نے اشاعت کلام پر توجہ نہیں دی۔ بعد از مرگ ڈاکٹر شکیل دسنوی نے ان کی تخلیقات کو مرتب کر کے 'وجدان' کے نام سے شائع کرایا۔ ڈاکٹر عارف حسن کے ساتھ بھی تقریباً یہی صورت حال ہے۔ انھوں نے نہ ہی اپنے کلام کی اشاعت کرائی اور نہ ہی ادبی محفلوں میں شاعر ہونے کا دعویٰ کیا۔ فرض منصبی کی تکمیل میں وہ مشاعروں سے بھی دور رہے۔ پٹنہ میں مقیم ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کو علم تھا کہ موصوف پختہ کار شاعر ہیں اور غزلوں کا وافر سرمایہ موجود ہے۔ انہی کی تحریک و ترغیب پر بیاض دل کی اشاعت ممکن ہوسکی۔ ڈاکٹر محمد عارف حسن پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''دوست و احباب کلام کی اشاعت پر زور دیتے رہے اور میں خاموشی سے سنتا رہا۔ جب یہ اصرار بڑھا تو میں اس شرط پر آمادہ ہوا کہ وہ میرے کلام پر اظہار خیال کریں۔ میں سمجھ رہا تھا کہ بات آئی گئی ہو جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس عمل میں

پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر مصلح الدین، پروفیسر ڈاکٹر محمد مظاہر الحق، شفیع مشہدی اور خورشید سمیع کے اسما قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات نے اپنی تحریروں سے نوازا۔''

(بیاض دل، ص 11)

بیاض دل کے ابتدائی صفحات پر مذکورہ بالا حضرات کے مضامین ہیں جن میں ڈاکٹر محمد عارف حسن کی شاعری کے امتیاز و انفراد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ مضامین بھلے ہی مختصر ہیں لیکن جامع ہیں۔ ان کا انداز معروضی ہے۔ بے جا طول نہیں ہے اور لفاظی سے اعراض کیا گیا ہے۔ بیاض دل میں کل 101 غزلیں ہیں۔ جیسا کہ پیش لفظ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ غزلیں ان کی زیست کے طویل سفر کا حاصل ہیں۔ ان میں ڈاکٹر محمد عارف حسن نے اپنے ٹھوس تجربات اور لطیف جذبات کو اشعار کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ان کی غزلوں کے مضامین روایتی نہیں ہیں یعنی انھوں نے گل و بلبل، غازہ و رخسار، ناز و ادا، معشوق کی گریہ وزاری اور وصل و فراق جیسے روایتی اور از کار رفتہ مضامین سے گریز کیا ہے اور ویسے موضوعات پر اشعار کہے ہیں جو زندگی کے تلخ حقائق اور انسان کے سامنے درپیش مسائل کو بیان کرتے ہیں۔ ان میں چند اشعار ناصحانہ بھی ہیں لیکن ان کا انداز تخاطب مولویانہ نہیں بلکہ شاعرانہ ہے اور ان میں فلسفے کی چاشنی بھی ہے۔

ڈاکٹر محمد عارف کی غزلوں میں سلاست بھی ہے اور بلاغت بھی۔ مرصع سازی بھی ہے اور لفظوں کی کاری گری بھی۔ نئے اسلوب کا تجربہ بھی ہے اور روایت شکن ہونے کا جذبہ بھی۔ بیاض دل میں چند غزلیں مطلع کے بغیر ہیں۔ یہ بالکل نیا تجربہ ہے اور روایت شکن ہونے کی دلیل ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں عام فہم زبان اور آسان تراکیب کا استعمال کیا ہے۔

انھوں نے اپنی بیشتر غزلوں کے لیے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جن کا تعلق ہمارے معاشرتی نظام سے ہے۔ ان میں انسان کے دلوں کی دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے۔ انھوں نے انسان کی بے حسی، انسانی بے راہ روی، سماجی ناانصافی، انسان کی ناقدری، تہذیبی زوال، معاشرے کی بدحالی، اور احباب کی بے رخی جیسے موضوعات پر پراثر اور پرلطف اشعار خلق کیے ہیں۔ اشعار دیکھیں۔

میں دشمن کو اپنا بنانے چلا ہوں
کلیجے سے اس کو لگانے چلا ہوں

عارف نے چوٹ کھائی، دیکھا نہیں کسی نے
سمجھے تھے جن کو اپنا بیگانے بن گئے

اجاڑ کر مجھے کہتا ہے گھر بسانے کو
نہیں ہے تاب و تواں اب تو مسکرانے کو

یہاں عابد تو ملتے ہیں مگر انسان نہیں ملتا
یہ کیسے لوگ ہیں ظلمات کی تعلیم دیتے ہیں

ڈاکٹر محمد عارف حسن غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں خود احتسابی اور احساس دروں کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ وہ زمانے کے تغیر و تبدل پر نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے غزل کی نزاکت اور مزاج کا خیال رکھتے ہوئے کلاسیکی رچاؤ اور تہذیبی حسن سے معمور اشعار کہے ہیں، جن کا لب و لہجہ جدید ہے، نادر افکار و خیالات ہیں اور جن میں ہمارے جسم اور روح کو دیر تک معطر رکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ انھوں نے لفظوں کی آرائش و زیبائش، روانی و فراوانی کا خاص خیال رکھا ہے جن سے غزل کا حسن برقرار رہتا ہے اور ان میں تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں میں قارئین کو متاثر کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اگرچہ انھوں نے کم کہا ہے لیکن خوب کہا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کریں۔

جزا کیا، سزا کا طلبگار ہوں میں
خدایا! بہت ہی خطا کار ہوں میں

تم تو آئے ہو زمانے میں مسیحا بن کر
غم زدہ لوگوں کو سینے سے لگانے کے لیے

تڑپتے مچلتے فسانے بہت ہیں
جدھر دیکھیے غم کے مارے ملیں گے

مذکورہ بالا اشعار کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ روایت اور جدت کے حسن امتزاج سے ان کی شاعری اور نکھر گئی ہے۔ بیاض دل اردو ادب کے قارئین کے لیے ایک حسین تحفہ ہے۔

حیات گل

مصنف: تبسم یاسمین

صفحات: 112، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر و ملنے کا پتہ: S-10/14A، جوگابائی ایکسٹینشن

بٹلہ ہاؤس، اوکھلا نئی دہلی۔ 25

مبصر: عبدالباسط ندوی، جوگابائی ایکسٹینشن جامعہ نگر اوکھلا نئی دہلی، 25

محترمہ تبسم یاسمین صاحبہ کا یہ پہلا شعری کا مجموعہ ہے جو حیات گل کے نام سے شائع ہوا ہے۔

تبسم یاسمین نے اپنی شاعری میں زندگی کے نشیب و فراز، روزمرہ کے تجربات، انسانی نفسیات و احساسات، عشق کے سوز و گداز، بچوں کے لیے سبق آموز واقعات، نسائی احساسات، متاثر کن شخصیات اور ماحولیات کو موضوع سخن بنا کر انھوں نے انتہائی خوبصورت اشعار کے ذریعے قاری کو متاثر اور اس کے دل میں جگہ بنانے کا کام کیا ہے۔ جس طرح تبسم یاسمین صاحبہ کے موضوعات خوبصورت اور دلکش ہیں اسی طرح ان موضوعات کے تحت کہے گئے اشعار بھی قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتے۔ موصوفہ اگرچہ سائنس کی استاذ ہیں اور ان کا موضوع سائنس ہے مگر ان کی طبیعت میں موزونیت ہے اور جب وہ شعر کہتی ہیں تو موضوع کی مناسبت سے اپنی طبیعت کو بھی اسی رنگ و آہنگ میں ڈھال لیتی ہیں۔

بلاشبہ بچوں کے لیے کہا گیا کلام نہ صرف عمدہ ہے بلکہ ادب اطفال میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ آج کے بچے موبائل اور سوشل میڈیا کی چکاچوند میں گم ہو چکے ہیں ایسی نظمیں ایک بامقصد طرز زندگی کے لیے نہ صرف بچوں کو ابھارتی ہیں بلکہ انھیں زندگی کی حقیقت اور اخلاقی قدروں سے بھی روبرو کراتی ہیں۔ ڈاکٹر شبانہ نذیر نے بلاشبہ صحیح مشورہ دیا ہے کہ انھیں بچوں کی نظموں کے حوالے سے مزید کام کرنا چاہیے، یہ ایک بڑا اور نمایاں کام ہوگا۔

گوشہ غزل میں کئی اشعار ایسے ملیں گے جو قاری کی نظر کو تھام لیں گے اور ان اشعار کو بار بار پڑھنے پر مجبور کریں گے، ایسے اشعار بھی نظروں سے گزریں گے جن میں زندگی کے تلخ و شیریں تجربات، سبق آموز رمز و کنایات سے کام لیا گیا ہے اور ایسے اشعار بھی جن میں رموز عشق اور نکات عاشقی کی گرہ کشائی کی گئی ہے، کئی مقامات ایسے آئیں گے جہاں عشق مجازی کے الفاظ میں عشق حقیقی کی منظر کشی کی گئی ہے۔

تصورات کے منظر سجائے بیٹھے ہیں
تیرے خیال کی شمع جلائے بیٹھے ہیں

نہ جانے کب اسے پھر گھر کی یاد آ جائے
ہم انتظار میں پلکیں بچھائے بیٹھے ہیں

ذرا سنبھل کے لگانا گلے سے اپنوں کو
وہ آستین میں خنجر چھپائے بیٹھے ہیں

تبسم یاسمین صاحبہ کی شاعری کا مجھے سب سے عمدہ حصہ وہ لگا جو انھوں نے عورتوں کے بارے میں کی ہے، ان اشعار میں نسائی جذبات کے اظہار کے ساتھ ساتھ خواتین کو صرف عشق و عاشقی، نرم و نازک اور بے چارگی کی علامت، ستم رسیدہ اور صنفِ مظلوم سمجھ کر طبع آزمائی نہیں کی گئی ہے بلکہ وقت کے چیلنجوں کے مقابلے کی تیاری کے ساتھ ساتھ اس کے حوصلے کو مہمیز کیا گیا ہے اور اسے بلند حوصلگی و اولوالعزمی کا درس دیا گیا ہے۔

اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

میں صبح کے ماتھے پہ شفق دیکھ رہی ہوں ۔۔۔ بے باک ارادوں کی رمق دیکھ رہی ہوں
ہیں درج جہاں تیری شجاعت کے فسانے ۔۔۔ تاریخ کے زریں وہ ورق دیکھ رہی ہوں
وہ ماں بھی ہے بیٹی بھی ہے بیوی بھی بہن بھی ۔۔۔ ہر اک کا ادا کرتی ہے حق دیکھ رہی ہوں
ماتھے کا جو آنچل ہے وہ پرچم بھی بنے گا ۔۔۔ سیکھا ہے نیا اس نے سبق دیکھ رہی ہوں

رسائل و جرائد

ماہنامہ **اردو آنگن** ممبئی (خصوصی شمارہ ڈاکٹر محمود شیخ)

مدیر: مشیر احمد انصاری
مدیر اعزازی: فیروز کمال (جبل پور)
صفحات: 88، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: ستمبر 2024
مبصر: تنویر رضا برکاتی، حبیب منزل ہاؤس نمبر 58
وارڈ نمبر 31/حریر پورہ برہان پور 450331

کسی خاص شخصیت کے کارنامے، ادبی، سماجی و تعلیمی خدمات سے زمانے کو روشناس کرانے کی غرض سے رسائل و جرائد کے خصوصی شمارے شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ اردو رسائل و جرائد کی تاریخ میں قدیم روایت ہے جو فی زمانہ بھی جاری و ساری ہے اور باقاعدہ اس کے مثبت نتائج و فوائد دیکھنے کو ملتے ہیں۔

زیر نظر رسالہ ماہنامہ اردو آنگن ممبئی کا ڈاکٹر محمود شیخ صاحب پر خصوصی شمارہ ہے۔ یہ ماہنامہ گذشتہ 8 برسوں سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ اردو آنگن نے گذشتہ دنوں کچھ خاص نمبرات بھی شائع کیے ہیں، اب معروف محقق، تنقید نگار، ڈاکٹر محمود شیخ صاحب پر خصوصی شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

کسی رسالے کی مسلسل اشاعت میں مدیر کا انتہائی اہم رول ہوتا ہے اس بات کا وہی لوگ صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں جو اس پل صراط سے گزر رہے ہوں۔ اردو آنگن کے مدیر محترم مشیر احمد انصاری اور ان کی پوری ادارتی ٹیم مبارکباد کی مستحق ہے کہ وہ اس صارفی دور میں اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اور کیوں نہ وہ اس کام کو کارِ خیر سمجھ کر انجام دیں کہ ان کے اس سفر میں محترم القام فیروز کمال صاحب جیسے بے لوث خادمِ اردو شانہ بہ شانہ شریک ہیں۔ موصوف اس خصوصی شمارے کے مدیر اعزازی ہیں۔ آپ ہی کی تحریک و جدوجہد اور مالی تعاون سے اردو آنگن نے جبل پور کا عصری ادب نمبر 2023، مدھیہ پردیش کا عصری ادب نمبر 2024 اور اب ڈاکٹر محمود شیخ نمبر 2024 قارئین کو پیش کر رہے ہیں۔ اللہ آنگن گروپ، مشیر احمد انصاری اور فیروز کمال صاحبان کو صحت و سلامتی سے رکھے تاکہ یہ سلسلہ تادیر جاری و ساری رہ سکے اور تشنگانِ زبان و ادب سیراب ہوتے رہیں۔

اداریے میں مشیر احمد انصاری نے اس خصوصی شمارے کی اشاعت کے پروگرام کی روداد بیان کی ہے نیز فیروز کمال صاحب (کمال پبلی کیشن، جبل پور) کی جانب سے ہونے والے عملی تعاون پر تشکر پیش کیا ہے۔ ادارتی نوٹ میں فیروز کمال نے ڈاکٹر محمود شیخ صاحب سے ان کے قلبی لگاؤ، دوستانہ تعلق کو پُر تاثر انداز میں تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر محمود شیخ کے انتقال سے نہ صرف اردو زبان و ادب کا خاصا نقصان ہوا بلکہ فیروز صاحب نے اپنا ایک مخلص و مربی، مشفق و مہربان دوست بھی کھویا ہے۔ مرحوم کی پہلی برسی پر اس خصوصی شمارے کے ذریعے انھیں خراج عقیدت پیش کیا جانا یقیناً بہترین دوستی کا اعلامیہ ہے۔

برصغیر کی اہم شخصیات جیسے چندر بھان خیال، ڈاکٹر خالد محمود، ڈاکٹر سیفی سرونجی، انتظار نعیم، ڈاکٹر نصرت مہدی، محمد ماہر ایڈوکیٹ، ڈاکٹر قمر علی شاہ، مسرور شاہجہاں پوری، ڈاکٹر شعیب حسن، غلام غوث انصاری صاحبان نے مختصر تعزیتی پیغامات و تاثرات تحریر کیے ہیں۔

ڈاکٹر افسر خان المشرقی کا مضمون 'علامہ ڈاکٹر محمود شیخ کی وفات پر' عنوان سے ص 21 پر درج ہے۔ یہ مضمون بڑا عمدہ ہے جس میں ڈاکٹر محمود شیخ صاحب کو مضمون نگار نے اکثر جگہوں پر لفظِ علامہ سے مخاطب کیا ہے۔ پورا مضمون مکالماتی انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمود شیخ کے علاج کے لیے گھر سے نکلنے سے لے کر وفات تک کے معاملات، نیز ان کے گھریلو تعلقات کو مکالمے کی شکل دی گئی ہے۔ بیچ بیچ میں موقع کی مناسبت سے فارسی اشعار کا استعمال بھی کیا گیا ہے، جو پڑھنے کے لائق ہے۔

صفحہ 26 پر ڈاکٹر محمود شیخ کی وفات پر کوثر صدیقی (بھوپال) کی مختصر نظم شائع کی گئی ہے۔ اسے فہرست میں جگہ نہیں دی گئی ہے شاید کسی وجہ سے شامل ہونے سے رہ گئی ہو۔ اس نظم میں کوثر صاحب نے بہترین انداز میں موصوف کی خدمتِ عالیہ میں خراج پیش کیا ہے، ملاحظہ کریں۔

شیخ محمود اک ادیبِ بے مثال ۔۔۔ ایک عالم اک معلم باکمال
اس کا تخلیقی و تحقیقی ادب ۔۔۔ عالمِ اردو میں لازوال

ص 55 سے صفحہ 72 تک ڈاکٹر محمود شیخ کے چار افسانے دھواں دھواں آدمی، تین مورتی، ماسٹر جی، شعور بیچنے والا مداری'' شامل ہیں۔ شیخ صاحب کے افسانوں میں بیشتر جگہ متوسط طبقے کے خانگی معاملات، عام زندگی کے مسائل وغیرہ خوب نظر آتے ہیں۔

زیر نظر رسالے میں ڈاکٹر محمود شیخ صاحب کے تنقیدی و تحقیقی مضامین مصنوعی ذہانت کا ادبی شعور، ادب اور ادیب عصر حاضر کے چیلنج، اخلاقی شعور ادب، ادبی کردار و عمل کا نفسیاتی شعور انتہائی اہم مضامین ہیں۔ اندازِ تحریر روایت سے ہٹ کر تہذیبی و اخلاقی اقدار کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

ڈاکٹر محمود شیخ یقیناً اردو زبان و ادب کے اہم نثر نگار کے طور پر جانے جاتے تھے۔ ان کی تنقید اور افسانہ نگاری پر باقاعدہ عصری جامعات میں تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔ صرف ایک رسالے کے ذریعے ہم ان کی جملہ ادبی خدمات کا حق ادا نہیں کر سکتے ہیں۔

■

ماہنامہ اردو دنیا' کے خبرنامہ میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی وثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان و ادب کی سمت و رفتار کا بھی۔
یہ خبرنامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

جو اپنی مادری زبان بھول گیا وہ گویا مر چکا ہے: ڈاکٹر شمس اقبال

نئی دھلی : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیراہتمام انڈیا انٹرنیشنل سینٹر نئی دہلی میں مشہور تمل شاعر، مصنف، صحافی اور مجاہد آزادی سبرامنیا بھارتی کے یوم پیدائش کے موقعے پر بھارتیہ بھاشا اُتسو کی مناسبت سے 'ہندوستان کے لسانی تنوع میں مادری زبان کی اہمیت' پر مذاکرے کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ جو اپنی مادری زبان بھول گیا وہ گویا مر چکا ہے۔ مادری زبان ہمیں اپنی تہذیب و تاریخ اور

افکار واقدار سے جوڑے رکھتی ہے۔ انھوں نے اس موقعے پر مہاکوی سبرامنیا بھارتی اور بھارتیہ بھاشا اُتسو کے حوالے سے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ سبرامنیا بھارتی ہندوستانی تہذیب وثقافت کی ایک روشن علامت تھے اور انھوں نے تمل زبان کو بہت سے شاہکار دیے جن میں 'بھگوت گیتا' کا تمل ترجمہ بھی شامل ہے۔ بیشتر مقررین نے اس خیال کا اظہار کیا کہ آج کی کثیر لسانی دنیا میں بھی اپنے تہذیبی وثقافتی اقدار کے تحفظ اور زمینی جڑوں سے وابستگی کے لیے مادری زبان ضروری ہے۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر انیس الرحمٰن نے کہا کہ زبانیں مرتی نہیں بلکہ تبدیل ہوجاتی ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مادری زبان کی بہت سی سطحیں ہوتی ہیں اور زبان کا تعلق تجربے سے بھی ہے۔ پروفیسر دھننجے سنگھ نے کہا کہ مادری زبان ہم سیکھتے نہیں اس زبان میں ہم پلتے ہیں۔ کچھ زبانیں ہوتی ہیں جن کو بنا بولے بول لیتے ہیں اور سن لیتے ہیں۔ پروفیسر روی پرکاش ٹیک چندانی نے کہا کہ بھارت کی مٹی کی بھاشاؤں میں ایک طرح کا بہناپا ہے اور ہمیں تمام بھاشاؤں کی کھڑکیاں کھولنی چاہئیں اور ان کا آنند لینا چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اسیم بھاشا کا کوئی چھیتر نہیں ہوتا، کوئی علاقہ نہیں ہوتا اور اسیم زبانیں ہی زندہ رہتی ہیں۔ پروفیسر خالد جاوید نے کہا کہ مادری زبان روح کی زبان ہوتی ہے، اگر ایک ہی زبان ہوتی تو سارا حسن ختم ہوجاتا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ تخلیقی زبان جو کہتی نہیں وہ بھی ڈسپلے کردیتی ہے اور یہ مادری زبان ہی ہے جس میں ہم خواب دیکھتے ہیں۔ پروفیسر اخلاق احمد آہن نے ہندوستانی زبانوں کے حوالے سے کہا کہ بیشتر زبانیں بولیوں سے زبان کی سطح پر آئی ہیں اور کچھ زبانیں برطانوی استعماریت کا شکار بھی ہوئی ہیں۔ اس موقعے پر تمام مہمانان کا گلدستے سے استقبال کیا گیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر عبدالباری نے کی۔ اس مذاکرے میں کونسل کے عملے کے علاوہ دہلی کی معزز شخصیات نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 11 دسمبر 2024

’موجودہ صورت حال میں اخوت کی اہمیت‘ کے موضوع پر مذاکرہ

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں ’موجودہ صورت حال میں اخوت کی اہمیت‘ کے عنوان سے پینل ڈسکشن (Panel Discussion) کا انعقاد کیا گیا، افتتاحی تقریر کرتے ہوئے قومی کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ آئین ہمارے قانونی نظام کو سمجھنے کا سب سے بہترین ذریعہ ہے۔ یوم آئین اس لیے منایا جاتا ہے تاکہ ہم جان سکیں کہ ہمارے حقوق کیا کیا ہیں، آج کے اس

پینل ڈسکشن کا مقصد یہ ہے کہ ہم لوگ قانون اور آئین سے زیادہ سے زیادہ واقف ہوسکیں۔ خواجہ عبدالمنتقم نے کہا کہ ہمارا بھارت ایک ایسا وسیع وعریض ملک ہے جہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے اور الگ الگ زبانیں بولنے والے صدیوں سے مل جل کر رہتے آئے ہیں، انھوں نے کہا کہ جہاں تک Fraternity یعنی اخوت/ بھائی چارہ یا برادرانہ تعلقات کی بات ہے اس کی ضرورت کل بھی تھی، آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی، یہ تو ہماری ہزار سالہ ثقافت کا حصہ رہی ہے، اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اسے ہمارے ملک کے آئین کی تمہید یعنی Preamble میں بھی شامل کیا گیا ہے، انھوں نے مزید کہا کہ فریٹرنٹی کا تصور ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں، ہمارا آئین ملک کے شہریوں کے الگ الگ رنگ وروپ کو تسلیم کرتا ہے لیکن ان کی جداگانہ حیثیت کے باوجود انھیں مساوی حیثیت دیتا ہے۔ پروفیسر نزہت پروین خان ڈپارٹمنٹ آف لیگل اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنی گفتگو میں کہا کہ Preamble کانسٹی ٹیوشن کی روح ہے، اس کا ایک ایک لفظ ہمارے لیے رہنما کی حیثیت رکھتا ہے، انھوں نے کہا کہ Fraternity ہندوستان میں ایک آئینی قدر ہے، جس کا مقصد آزادی اور مساوات کے ساتھ ہم آہنگی اور اتحاد قائم کرنا ہے حالانکہ بھائی چارے کا اصول جیسا کہ ہندوستان کے آئین کی تمہید میں درج ہے اکثر انصاف، آزادی اور مساوات کی بنیادی اقدار میں سب سے کم زیر بحث لایا جاتا ہے، حالانکہ Fraternity کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر بھی اسی طرح بات کی جائے جس طرح دوسری اہم چیزوں پر بات کی جاتی ہے۔ پروفیسر ظفر محفوظ نعمانی ڈپارٹمنٹ آف لا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کانسٹی ٹیوشن کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے آج کے موضوع پر بے حد اہم گفتگو کی، انھوں نے کہا کہ کانسٹی ٹیوشن بنانے والے حضرات بڑے فقیہ تھے اور انھوں نے پوری کوشش کی کہ ہندوستان کے لیے ایک ایسا جامع قانون تیار کیا جائے جس میں سب کے لیے یکساں مواقع ہوں، اس کے لیے ان حضرات نے دنیا کے تمام آئین کا بغور مطالعہ کیا اور جو چیز اچھی لگی اسے ہندوستان کے کانسٹی ٹیوشن میں شامل کیا۔ اس پروگرام کا انعقاد یوم آئین کے موقعے پر کیا گیا۔ ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) نے مہمانان کا تعارف کرایا اور شکریے کی رسم ادا کی، اس پروگرام میں کونسل کا پورا عملہ موجود رہا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 26 نومبر 2024

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام لکھنؤ بک فیسٹول میں مذاکرہ اور مشاعرہ

لکھنؤ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام گومتی ریور فرنٹ پارک لکھنؤ کے گومتی بک فیسٹیول/گومتی بک مہوتسو میں مذاکرہ اور مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ مذاکرہ میں محسن خان، پروفیسر صابرہ حبیب اور ڈاکٹر صبیحہ انور نے شرکت کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عشرت ناہید نے انجام دیے۔ اس موقع پر محسن خان نے کہا کہ کہانی میں اسلوب وفکر بہت اہمیت کے حامل ہیں، انھوں نے کہا کہ میں نے ایک

ایسے دور میں لکھنا شروع کیا جب ادب اور زبان کا تابناک دور تھا اور بڑوں سے لکھنے کی تحریک ملتی تھی، میری کہانی کے محرک کرشن چندر، منٹو اور غلام عباس تھے، انھوں نے مزید کہا کہ جو لوگوں کو انسپائر نہ کرے ایسی تخلیق کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ڈاکٹر صبیحہ انور نے کہا کہ فکشن دوسرے اصناف کے مقابلہ میں زندگی سے زیادہ قریب ہے، میں نے اپنے قلم اور ذہن سے زندگی کی مختلف پرتوں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ عورت کے ذہن اور قلم سے لکھنا اور توازن قائم رکھنا بہت مشکل امر ہے۔ پروفیسر صابرہ حبیب نے کہا کہ ہر زبان کی اپنی خوبصورتی ہوتی ہے، اردو زبان میں بہت خوبصورتی ہے اور اس کو محبت کا دوسرا نام دیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر عشرت ناہید نے مذاکرہ میں شامل قلم کاروں سے ان کے ادبی سفر اور تخلیقی تجربات کے بارے میں بہت پرمغز گفتگو کی۔ مذاکرہ کے بعد مشاعرہ کا انعقاد ہوا جس میں صدارتی خطاب میں ڈاکٹر عمار رضوی نے کہا کہ اردو زبان وادب کے فروغ میں قومی اردو کونسل قابل ستائش کام کر رہا ہے اور اردو کونسل نے آئین ہند کے حوالے سے جو کتابیں شائع کی ہیں وہ ہمارے ملک کے عوام اور معاشرے کے لیے بہت مفید ہیں۔ اس موقع پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے تمام شعرا کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ اس مشاعرے میں لکھنؤ کے بڑے اہم شعرا شامل ہیں، یہ ہمارے کلچرل ڈسکورس کا اہم حصہ ہے۔ قومی کونسل مختلف علاقوں میں ثقافتی تقریبات کے ذریعے اردو زبان کی ترقی کے لیے نہ صرف یہ کہ کوشش کر رہی ہے بلکہ معاشرے سے ایک صحت مند اور مثبت مکالمہ کی راہ بھی ہموار کر رہی ہے۔ مشاعرہ میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر عمار رضوی نے شرکت کی۔ جبکہ چرن سنگھ بشر، منیش شکلا، حسن کاظمی، زبیر انصاری، شاہد کمال، پپلو لکھنوی اور اسد نصیر آبادی بحیثیت شاعر شریک ہوئے، مشاعرہ میں نظامت کے فرائض ڈاکٹر طارق قمر نے بحسن وخوبی انجام دیے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام گومتی ریور فرنٹ پارک لکھنؤ میں مظفر علی سے ملاقات اور شام غزل/صوفیانہ کلام کے نام سے پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر مشہور فلم ساز مظفر علی نے کہا کہ اودھ کی جو پہچان گم ہوتی جا رہی تھی ہم نے اس کی پہچان بحال کرنے کی کوشش کی، ادب اور فلم کا مقصد احساس کو جگائے رکھنا ہے، ہمیں اپنے آپ کو آنے والے کل کا باشندہ بنانا چاہیے، فنکار کو احترام سے دیکھنا چاہیے انھوں نے مزید کہا کہ کلا کے لیے ریسرچ سب سے بڑی چیز ہے، پینٹنگ میری غذا ہے، فرس نامہ میرا شوق ہے، ویژیول لنگویج سے ہم دور نہیں ہو سکتے، انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہر وقت میرے ذہن میں فلم گھومتی رہتی ہے،

میں آوازیں اور چہرے تلاش کرتا رہتا ہوں، کہ چہرے میں بڑی طاقت ہوتی ہے، میرے نزدیک فلم سازی بہت اہم سفر ہے فلم بنانا ترک نہیں کرنا چاہیے، ہر کلا کار میرے لیے بہت بڑا فنکار ہے، اس موقع پر ڈاکٹر شمس اقبال ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے خیر مقدمی کلمات کہے اور مظفر علی کے فنکارانہ شخصیت اور فلمی سفر پر بھی روشنی ڈالی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر منتظر قائمی نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ اس کے بعد شام غزل/صوفیانہ کلام کا اہتمام کیا گیا جس میں مشہور غزل اور صوفی سنگر محترمہ اندرا نائک نے اپنی گائیکی سے سامعین کو محظوظ کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 15،16 نومبر 2024

کٹوارہ میں قومی اردو کونسل کا دوروزہ کیلی گرافی ورکشاپ اور کتابوں کی نمائش

لکھیم پور / نئی دہلی: لکھیم پور مہوتسو 2024 کے تحت کٹوارہ کیلی گرافی ورکشاپ میں قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے بھی شرکت کی۔ کٹوارہ میں دوروزہ کیلی گرافی ورکشاپ کا انعقاد 25 تا26 نومبر 2024 ہوا۔اس

ورکشاپ میں قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان کے ذریعے چلائے جارہے دوسالہ کیلی گرافی اورگرافک ڈیزائن سینٹر کے اساتذہ محمد اسلم رضابارہ بنکی، عبدالرحمٰن لکھنؤ، طعوف خان لکھنؤ، مشتاق احمد، زبیر احمد دہلی اورعرشی کوہ نور فیروز آباد وغیرہ نے ورکشاپ میں شامل طالبات کو کیلی گرافی اورگرافک ڈیزائن کی تربیت دی، اس موقعے پر محترمہ شیمم قریشی ممبئی نے بھی طالبات کو کیلی گرافی کے متعلق اہم معلومات فراہم کی۔26 نومبر کونمائش کا افتتاح مشہور فلم ساز مظفرعلی، امن گیری ایم ایل اے گولہ کھیری نے کیا۔ اس مہوتسو میں محترمہ درگاشکتی ناگ پال، ڈی ایم جناب ونود

کمار، ایس ڈی ایم گولہ سکویر سنگھ تحصیلدار گولہ اور قومی اردو کونسل کے ریسرچ آفیسر انتخاب احمد بھی موجود تھے۔ لکھیم پور مہوتسو 2024 میں قومی اردو کونسل کی طرف سے نمائش کتب(Book Exhibition) کا بھی اہتمام کیا گیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل،27 نومبر 2024

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

240 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................................. بتاریخ.............................. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/240 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:　　　　دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

داراشکوہ ثقافتی تکثیریت اور مذہبی ہم آہنگی

نئی دھلی: داراشکوہ ایک صوفی منش انسان تھا جس نے صوفی اور سنتوں کی سرزمین ہندوستان میں رہ کر قوموں کے درمیان باہمی مکالمے کی روایت کو زندہ کیا۔

وہ تمام ادیان کے مابین یکسانیت کا متلاشی اور قوموں کے درمیان ہم آہنگی کے قیام کا قائل تھا، یہ باتیں شیخ الجامعہ پروفیسر مظہر آصف نے نیلسن منڈیلا سینٹر فار پیس اینڈ کنفلکٹ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام اور سینٹر فار پرشین اینڈ سینٹرا سٹڈیز جے این یو اور داراشکوہ ریسرچ فاؤنڈیشن کے اشتراک سے منعقد دو روزہ بین الاقوامی کانفرنس میں افتتاحی خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ کانفرنس کا موضوع داراشکوہ ثقافتی تکثیریت اور مذہبی ہم آہنگی تھا۔ شیخ الجامعہ کے بعد رجسٹرار پروفیسر مہتاب عالم رضوی نے کانفرنس کا تعارف پیش کیا اور کانفرنس کے اغراض و مقاصد کے ساتھ ساتھ موجودہ دور میں اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ مہمان اعزازی کی حیثیت سے سفیر جمہوریہ اسلامی ایران ایرج الٰہی نے کانفرنس میں شرکت کی اور داراشکوہ کو سلوک وعرفان کا پیامبر اور باہمی بقا کے درمیان اتحاد کا حامل قرار دیا۔ اس کانفرنس کے خطیب پروفیسر اخلاق آہن جے این یو نے اپنے کلیدی خطبے میں فلسفہ وحدت کا اعادہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ فلسفہ بہت پہلے سے موجود تھا لیکن دارا شکوہ نے اسے دوبارہ روشناس کرایا۔ انھوں نے مزید کہا کہ دارا نے اپنشد کا ترجمہ کرا کے اسے عالمی سطح پر متعارف کرایا۔ این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے اپنے خطاب میں کہا کہ دارا نے تصوف اور ویدانت کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور سرو دھرم سمبھاؤ کا تصور اسی نے پیش کیا تھا۔ اس موقعے پر داراشکوہ ریسرچ فاؤنڈیشن کی اولین جرنل 'دارادرپن' کی رونمائی اور ویب سائٹ کا افتتاح بھی عمل میں آیا، اور ڈاکٹر قرۃ العین اور ڈاکٹر شہباز عامل کی تصنیف 'اردو اور ازبیک زبان' کے مشترک الفاظ کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

دو روزہ بین الاقوامی کانفرنس کے دوسرے دن اختتامی تقریب میں خطاب کرتے ہوئے شیخ الجامعہ پروفیسر مظہر آصف نے کہا کہ ہندوستان نے مشترکہ تہذیب کا درس پوری دنیا کو دیا ہے، انھوں نے آگے کہا کہ عشق کے ذریعہ ہی دنیا کو فتح کیا جا سکتا ہے۔

اختتامی پروگرام میں تاجکستان کے کونسلر ڈاکٹر حبیب اللہ مرزا زودا اور تاجکستان کے سیکنڈ سکریٹری ڈاکٹر منیزہ رحیمی اور ایران کلچر ہاؤس نئی دہلی کے کلچرل کاؤنسلر ڈاکٹر فرید فرید الدین فرید نے شرکت کی جبکہ چیف گیسٹ کی حیثیت سے رضا لائبریری رامپور کے ڈائریکٹر ڈاکٹر پشکر مشرا بھی موجود تھے۔ انھوں نے دارا کے فلسفہ زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس کا فلسفہ آفاقی تھا اور اس نے قوموں کے درمیان باہمی رواداری پر زور دیا۔ مہمان اعزازی قومی اقلیتی کمیشن حکومت ہند کے چیئر پرسن جناب اقبال سنگھ لال پورا جی نے کہا کہ دارا کی مشہور کتاب مجمع البحرین اسلام اور ہندوازم کے مابین یکسانیت تلاش کرنے کی جستجو کا ایک شاندار نمونہ ہے۔ اس موقعے پر پرشین ریسرچ سینٹر ایران کلچر ہاؤس نئی دہلی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر قہرمان سلیمانی بھی موجود تھے۔ دوسرے دن کانفرنس میں کل پانچ اکیڈمک سیشن ہوئے پہلے سیشن میں کل دس مقالے پیش کیے گئے۔ اس سیشن کی صدارت نرگس جابری اور ڈاکٹر جاوید عالم نے فرمائی اسی طرح دوسرے سیشن میں نو مقالے پڑھے گئے اس کی صدارت پروفیسر چندر شیکھر، جناب روی کانت مشرا اور پروفیسر اختر مہدی نے کی۔ تیسرے چوتھے اور پانچویں سیشن میں بالترتیب دس، آٹھ اور گیارہ مقالات پڑھے گئے۔ اس موقعے پر داراشکوہ کی معرکۃ الآرا تصنیف مجمع البحرین کے ہندی ترجمے کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس کتاب کے مترجمین ڈاکٹر عبدالواسع اور ڈاکٹر شہباز عامل ہیں۔ آخر میں دارا شکوہ ریسرچ فاؤنڈیشن کے ٹرسٹی ڈاکٹر محسن علی نے تمام مہمانان و حاضرین کانفرنس کا شکریہ ادا کیا۔ اس پروگرام کی نظامت ریسرچ اسکالر صدام حسین نے کی۔

روزنامہ 'صحافت'، دہلی، 30 نومبر 2024

غالب شناسی: عہد حاضر کے آئینے میں

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے زیر اہتمام بہ تعاون کالی کٹ یونیورسٹی (کیرالا) میں دو روزہ قومی سمینار کے افتتاحی تقریب میں پروفیسر سید سجاد حسین نے کہا کہ غالب اردو کا ایسا شاعر ہے کہ جہاں کسی کی نظر نہیں جاتی وہاں ان کا ذہن پہنچ جاتا ہے۔ 'غالب شناسی: عہد حاضر کے آئینے میں' کا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے انھوں نے مزید کہا کہ غالب کسی مخصوص وقت یا دور کے شاعر نہیں ہیں، ان کی شاعری ہر زمانے پر حاوی ہے۔ سمینار کا افتتاح کالی کٹ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر پی رویندرن نے ای ایم ایس سمینار ہال، کالی کٹ یونیورسٹی میں کیا۔ افتتاحی تقریر میں انھوں نے کہا کہ غالب کی شاعری کا جادو صرف

'غالب شناسی: عہد حاضر کے آئینے میں' کے موضوع پر منعقدہ سمینار کا منظر

اردو تک محدود نہیں، ہر میدان کے افراد ان سے کسی نہ کسی طور پر متاثر نظر آتے ہیں، چاہے وہ فلمی دنیا ہو یا سیاست داں افراد۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت صدر شعبۂ اردو کالی کٹ یونیورسٹی پروفیسر نگولن کے وی نے کی۔ انھوں نے کہا کہ شعبۂ اردو کالی کٹ یونیورسٹی زیادہ پرانا نہیں ہے، لیکن اس کم مدت میں بھی ہماری سرگرمیاں قابل لحاظ ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے استقبالیہ تقریر میں کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ سال میں دوبار دہلی سے باہر غالب سمینار منعقد کرتا ہے اور ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ان جگہوں کا انتخاب کیا جائے جہاں اردو سے متعلق سمینار کم ہوتے ہیں۔ مہمان خصوصی پروفیسر صفیہ بی نے کہا کہ بہت سے اچھے شاعر ہیں جن کا کلام ہمیں متاثر کرتا ہے لیکن آپ ان کو دو چار بار سے زیادہ نہیں پڑھ سکتے لیکن غالب کو جتنی مرتبہ پڑھیں ایک نئی دنیا سامنے آتی ہے۔ اظہار تشکر کرتے ہوئے پروفیسر محمد امان اے کے نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ اردو کا سب سے فعال ادارہ ہے ہمیں بے حد خوشی ہوئی کہ اس ادارے نے کیرالہ جیسی دور افتادہ جگہ کا انتخاب کیا جہاں واقعی اس قسم کے سمیناروں کی ضرورت ہے۔ اس اجلاس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد رضوان اور اپرنا ایم ایس نے یانجام دیے۔ افتتاحی اجلاس کے بعد شام غزل کا اہتمام کیا گیا جس میں معروف غزل سنگر سراج عمل اور ساریکا گریش نے غالب اور دیگر شعرا کا کلام پیش کیا۔

سمینار کے دوسرے دن چار ادبی اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر پی۔ کے ابوبکر نے کی۔ صدارتی تقریر میں انھوں نے کہا کہ غالب کی عصری معنویت کا سبب یہ ہے کہ ہمارے عہد کے بیشتر مسائل وہی ہیں جن کو غالب نے اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔ اس اجلاس میں پروفیسر سید ثناء اللہ، ڈاکٹر محمد امان اے۔ کے، ڈاکٹر عائشہ صدیقہ جے، جناب عارف این اور محترمہ رشیدہ ایم نے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت کا فریضہ محترمہ فاطمہ منہا نے انجام دیا۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر سید ثناء اللہ نے کی۔ انھوں نے کہا کہ غالب شناسی ایک پھیلا ہوا موضوع ہے۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ یہاں ہر شخص نے اسے ایک نئے زاویے سے دیکھا اور نئی بات کہنے کی کوشش کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر محمد سلیم۔ پی، پروفیسر قاضی حبیب احمد، محترمہ ممتاز سی۔ ایچ '، جناب وی ایم ابراہیم، ڈاکٹر ثمینہ بی کے، ڈاکٹر قمرالنسا۔ کے اور محترمہ خیرالنساء این۔ پی۔ نے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت محترمہ شمناس نے کی۔ تیسرے اور آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر قاضی حبیب احمد نے کی۔ اپنی تقریر میں انھوں نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے جنوبی ہند میں سمینار کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ یہ خطہ بہت زرخیز ہے اگر توجہ کی جائے تو یہاں سے اردو کے حق میں بہت دوررس نتائج برآمد ہوں گے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر محمد رضوان انصاری نے ڈاکٹر شمس الدین کے، ڈاکٹر شیخ افسر پاشا، پروفیسر کے ایم شریف اور ڈاکٹر محی الدین کٹی نے مقالات پیش کیے۔ سمینار کے بعد کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر سید سجاد حسین ظہیر اور ڈاکٹر این محی الدین کٹی نے کی اور نظامت کا فریضہ جناب صدام حسین پرواز نے ادا کیا۔ پروفیسر سید سجاد حسین ظہیر، ڈاکٹر محی الدین کٹی مخروم، جناب حمید کے، جناب فیصل وفا، جناب این عبدالصمد، جناب انیس سی، جناب منیر پی، جناب علی تلوار اور جناب صدام حسین پرواز نے اپنا کلام پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 نومبر و پریس ریلیز غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی 2024

یومِ ذوق

نئی دهلی: انجمن ترقی اردو دلی شاخ اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام 'یوم ذوق' کا انعقاد کیا گیا جس کی مناسبت سے ایوان غالب میں سمینار، مشاعرہ اور شام غزل کا اہتمام کیا گیا۔ اس سے قبل غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے مزار ذوق پر پہنچ کر گل پوشی اور فاتحہ خوانی کی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ انجمن ترقی اردو دلی شاخ کے ذمے داران قابل مبارکباد ہیں کہ وہ پابندی سے 'یوم ذوق' کا اہتمام کرتے ہیں۔ ذوق یقیناً ان بڑے شاعروں میں ہیں جن کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ پروفیسر چندر شیکھر نے کہا کہ یہ ہماری خوبصورت روایت ہے کہ ہم اپنے بزرگوں خصوصاً ادبا کو ان کے یوم ولادت اور یوم وفات پر یاد کرتے ہیں اور اس کے ذریعے ان کی خدمات موضوع گفتگو بنتی ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ غالب کے معاصرین میں ذوق کا نام کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ دونوں ہی بادشاہ کے استاد تھے لیکن غالب کے حصے میں یہ سعادت ذوق کے انتقال کے بعد آئی۔ اس موقعے پر مشاعرے کا بھی اہتمام کیا گیا جس کی صدارت وقار مانوی اور نظامت معین شاداب نے کی۔

شعرا میں ظفر مراد آبادی، اقبال فردوسی، اسد رضا، صہیب احمد فاروقی، چشمہ فاروقی، شاہد انجم، آشکارا خانم کشف، اختر اعظمی اور اقبال مسعودی ہنر نے طرحی کلام پیش کیا۔ مشاعرے کے بعد شام غزل کا اہتمام کیا گیا جس میں استاد عبدالرحمٰن نے ذوق اور دوسرے شعرا کی غزلیں پیش کیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 نومبر 2024

ڈاکٹر نیلوفر خود جائیوا کا توسیعی لیکچر

نئی دهلی: ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو

یونیورسٹی، نئی دہلی کی طرف سے ایک توسیعی لیکچر کا اہتمام کیا گیا جس میں ڈاکٹر نیلوفر خود جائیوا، صدر ہائر اسکول

آف ساؤتھ ایشین لینگویجز، تاشقند اسٹیٹ یونیورسٹی آف اورینٹل لینگویجز، تاشقند ازبکستان نے ترجمے کا بین ثقافتی رشتہ، ہندوستانی اور ازبکستانی زبانوں کے موضوع پر تفصیلی خطاب کیا۔ خطاب سے قبل پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جے این یو میں ازبکستان سے آئے ہوئے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور سی آئی ایل کی طرف سے گولڈن جبلی تقریبات میں خصوصی خطاب کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا۔ واضح ہو کہ سی آئی ایل کی بنیاد جے این یو میں پچاس برس پہلے ڈالی گئی تھی۔ خصوصی خطاب کا یہ سلسلہ اسی گولڈن جبلی تقریبات کی ایک اہم کڑی ہے۔ ڈاکٹر نیلوفر خود جائیوا نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہندوستان اور ازبکستان کے درمیان ثقافتی تعلقات کی تاریخ کئی صدیوں پر محیط ہے، اور حالیہ برسوں میں دونوں ممالک کے بیچ ترجمے کے میدان میں ایک نئی جہت نے جنم لیا ہے۔ ہندوستانی اور ازبک زبانوں کے درمیان ترجمے کا عمل نہ صرف زبانوں کے تبادلے کا وسیلہ بن رہا ہے بلکہ یہ دونوں تہذیبوں کے مابین ایک مضبوط بین ثقافتی رشتے کو بھی جنم دے رہا ہے۔ ازبکستان کی ثقافت، ادبیات، اور تاریخ کو ہندوستانی قارئین تک پہنچانا، اور اسی طرح ہندوستانی ادب اور فنون کو ازبک عوام تک پہنچانا، دونوں قوموں کے درمیان روابط کو مزید مستحکم کرتا ہے۔

اس پروگرام کی صدارت پروفیسر پروفیسر نوین کمار، پرفیسر بندنا جھا اور پروفیسر دیوندر کمار نے کی۔ کنوینر ڈاکٹر نصیب علی نے مہمانِ خصوصی، اساتذہ، طلبا وطالبات کا شکریہ ادا کیا اور ڈاکٹر ملکھان سنگھ نے اس کی نظامت کی۔ اس خصوصی خطاب میں سی آئی ایل اساتذہ کے علاوہ بڑی تعداد میں ریسرچ اسکالرس اور طلبا وطالبات نے شرکت کی۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 29 نومبر 2024

عرفی شیرازی کی غزل گوئی

نئی دهلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فارسی میں 'عرفی شیرازی کی غزل گوئی' پر توسیعی خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ اس خطبے کے مقرر خاص پروفیسر احمد محفوظ صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ تھے۔ ایران کی دانش گاہ یزد کے مشہور استاد ڈاکٹر کاظم کہدوئی اور دانش گاہ آزاد اسلامی ایران تہران کی استاد ڈاکٹر نرگس جابری نسب نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ ڈاکٹر سید کلیم اصغر صدر شعبۂ فارسی نے صدارت اور نظامت ڈاکٹر زہرا خاتون نے کی۔ پروفیسر احمد محفوظ نے اپنے خطبہ میں عرفی کی غزلیات کی خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اگرچہ عرفی نے بہت کم عمر پائی لیکن سبک ہندی میں ان کا مقام بہت بلند ہے اور انھیں ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ عرفی کے زورِ کلام، قدرتِ بیان اور تخیل کی بلندی پر انھوں نے پر مغز بحث کی اور کہا کہ غالب اور میر کے کلام میں بھی ان کی اثر پذیری دیکھی جاسکتی ہے۔ ایران سے آئے مہمان ڈاکٹر کاظم کہدوئی نے عرفی کی قصیدہ گوئی کو اپنی تقریر کا موضوع بنایا جب کہ ڈاکٹر نرگس جابری نسب نے عرفی کی مثنوی نگاری کے ساتھ ساتھ دوسری اصناف سخن میں ان کی مہارت کا جائزہ پیش کیا۔ آخر میں اکٹر سید کلیم اصغر نے صدارتی کلمات کے ساتھ ساتھ مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 4 دسمبر 2024

علامہ محمود زمخشری کا علم نحو کے ارتقا میں کردار

نئی دهلی: جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات میں آج ایک خصوصی لیکچر کا انعقاد ہوا، جس میں بڑی تعداد میں اساتذہ، طلبہ، اور اسکالرز نے شرکت کی۔ سمینار کا موضوع 'علامہ محمود زمخشری کا علم نحو کے ارتقا میں کردار' تھا۔ مہمانِ خصوصی تاشقند یونیورسٹی ازبکستان کے معروف پروفیسر مرزیاؤت سقراط میکیاشی نے موضوع پر تفصیلی گفتگو کی اور زمخشری کی علمی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔ پروفیسر میکیاشی نے اپنے لیکچر میں کہا کہ زمخشری نے عربی زبان و ادب کی دنیا میں انقلابی خدمات انجام دی ہیں اور ان کے نظریات آج بھی مستند سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی تصانیف 'مفردات' اور 'اتقان' کو خاص اہمیت دی گئی ہے، جنھیں عربی ادب اور نحو کی تعلیم میں سنگِ میل تصور کیا جاتا ہے۔

لیکچر کا آغاز شعبۂ عربی کے صدر پروفیسر مجیب الرحمٰن کے استقبالیہ کلمات سے ہوا، جنھوں نے مہمانِ خصوصی کا خیر مقدم کیا اور ایسی علمی تقریبات کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ لیکچر کے دوران سوالات و جوابات کا ایک سیشن بھی ہوا، جس میں شرکا نے ازبکستان میں عربی زبان کے فروغ اور اس کے اثرات پر سوالات کیے۔ پروفیسر میکیاشی نے ان سوالات کے جوابات تفصیل سے دیے اور عربی زبان کی موجودہ حیثیت اور اس کے ارتقا پر روشنی ڈالی۔ لیکچر کی نظامت اور شرکا کا شکریہ پروفیسر رضوان الرحمٰن نے ادا کیا۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 28 نومبر 2024

جامعہ میں تاشقند اسٹیٹ یونیورسٹی آف اورینٹل اسٹڈیز کے نائب ریکٹر کا توسیعی لیکچر

نئی دهلی: شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ڈاکٹر عبدالحلیم لائبریری میں تاشقند اسٹیٹ یونیورسٹی آف اورینٹل اسٹڈیز کے نائب ریکٹر ڈاکٹر میرزیاتوف

شہرت نے توسیعی خطبہ پیش کیا۔ پروگرام کی کوآرڈینیٹر ڈاکٹر ہیفا شاکری نے مہمان کا استقبال کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مختصر تعارف پیش کیا نیز مہمان کی شخصیت سے سامعین کو متعارف کرایا۔ بعدازاں، فاضل خطیب نے اپنے خطاب میں عربی زبان میں القاب و آداب کے طریقۂ استعمال پر روشنی ڈالی، نیز انھوں نے کہا ازبکستان کا عربی زبان سے گہرا رشتہ ہے، کیونکہ یہ وہ علاقہ ہے جسے اسلامی عہد میں ماوراء النہر کا علاقہ کہتے تھے اور جس نے اسلامی تاریخ میں جلیل القدر علما، فقہا، محدثین اور فلاسفر دیے جن میں امام بخاری، امام ترمذی، زمخشری اور البیرونی کا نام سرفہرست ہے، عربی زبان سے اسی گہرے رشتے کی وجہ سے ازبک زبان میں عربی زبان کے تقریباً پچاس فیصد الفاظ ہیں۔ انھوں نے اپنے خطبے میں تاشقند اسٹیٹ یونیورسٹی آف اورینٹل اسٹڈیز کا تعارف بھی پیش کیا اور ہندوستانی یونیورسٹیز اور اس یونیورسٹی کے درمیان تعلیمی تعاون کے امکانات پر بھی روشنی ڈالی۔ خطبے کے بعد طلبہ و اساتذہ نے فاضل خطیب سے ازبکستان اور ازبکستان میں عربی زبان کے تعلیمی مواقع سے متعلق سوالات کیے۔

روز نامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 30 نومبر 2024

ادبِ اطفال میں 'کہانی کی اہمیت' پر مذاکرہ

نئی دہلی: ادبِ اطفال میں کہانی کی اہمیت پر جنوبی دہلی کے جہاں پناہ علاقے میں واقع ٹی ایچ ایس اردو سینٹر میں بچوں کے ساتھ قلمکاروں کے مذاکرے

کا انعقاد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی کے طور پر این سی ای آر ٹی سے وابستہ ڈاکٹر امیر حمزہ نے شرکت کی۔ اس موقعے پر بچوں کے ادب میں دلچسپی رکھنے والے دیگر قلمکار بھی شامل ہوئے، جن میں حبیب سیفی، نزاکت امروہوی، مشہود سونو باقی، شگفتہ پروین، عالیہ، عافیہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ادبِ اطفال پر مبنی مذاکرے کی تقریب کے مہمان خصوصی ڈاکٹر امیر حمزہ نے کہا کہ گذشتہ دس برس سے ادبِ اطفال کی قرأت میں مایوسی کا شکار رہا، لیکن جب میری نظر اچانک اس خبر پر پڑی جس میں قومی اردو کونسل کے سہ روزہ بچوں کے ادب پر مبنی ورکشاپ کے دوسرے دن کے ایک سیشن کی صدارت عافیہ سیفی نے کی تو چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ ادبِ اطفال پر ورکشاپ میں ثانیہ عرفان راہی، اور عالیہ بنت حبیب سیفی نے بھی حصہ لیا تھا۔ اسی وقت سے میری خواہش تھی کہ عافیہ نامی بچی سے مل کر کہانی کی قرأت اور کہانی تخلیق کے بارے میں ضرور بات کروں گا اور آج وہ موقع مل گیا۔ حبیب سیفی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ پہلے کے مقابلے آج کے بچوں میں اعتماد اور بیباکی کہیں زیادہ ہے۔ بچے کیسی کہانیاں پڑھنا پسند کرتے ہیں، یہ بچے بہتر جانتے اور سمجھتے ہیں۔ بچوں کی نفسیات اور ان کے شعور و ادراک کی سطح کیا ہے یہ مذاکرے میں شریک بچوں کی باتوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ بچوں کی دنیا ہو کہ بچوں کا ماہنامہ امنگ دہلی یا پھر بچوں کا ڈائجسٹ صلاحکار نئی دہلی اس میں شامل قلمکاروں کی تخلیقات سے نئے لکھنے والے ترغیب پاسکتے ہیں۔ پروگرام کے اختتام پر طارق نے شرکا کا اظہار تشکر ادا کیا۔

پریس ریلیز: حبیب سیفی، دہلی، 30 نومبر 2024

مصری شاعرہ ولا جمال العسیلی کو استقبالیہ

نئی دہلی: عربی النسل اردو شاعرہ ڈاکٹر ولا جمال العسیلی کی دہلی آمد پر جامعہ نگر میں انھیں استقبالیہ دیا گیا۔ اس موقعے پر ایک شعری نشست آراستہ کی گئی۔ ابوالفضل انکلیو واقع ہوٹل ریورویو میں منعقد اس ادبی تقریب کا اہتمام اشاعتی ادارے عبارت پبلی کیشن نے کیا تھا۔ سبکدوش اسسٹنٹ کمشنر کمرشیل ٹیکس رئیس اعظم خاں رئیس مظفرنگری نے تقریب کی صدارت کی۔ معروف سیاسی وسماجی شخصیت کلیم الحفیظ مہمان خصوصی کے طور پر

موجود تھے۔ عبارت پبلی کیشن کے بانی سلام خاں نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ نظامت شاعر اور صحافی معین شاداب نے کی۔ معین شاداب نے مہمان شاعرہ کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ قاہرہ کی عین شمس یونیورسٹی میں اردو کی ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر ولا جمال العسیلی دنیائے عرب کی اولین صاحب دیوان اردو شاعرہ ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے 'سمندر ہے درمیاں' اور 'دخترِ نیل' طبع ہوچکے ہیں۔ اس کے علاوہ عربی میں ان کی کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے نغمہ نگار اور معروف شاعر جاوید اختر کی نظموں کا عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ مہمان خصوصی کلیم الحفیظ نے اپنی تقریر میں اردو شعر و ادب کی اہمیت اور قوت پر روشنی ڈالی۔ اس سے پہلے ڈاکٹر ولا جمال العسیلی نے مخصوص انداز میں اپنی غزلیں پیش کیں، جنھیں سامعین نے خوب سراہا۔ شعری نشست میں جن لوگوں نے کلام سنایا ان میں رئیس مظفرنگری، منیر ہمدم، اعجاز انصاری، شکیل جمالی، شاہد انجم، معین شاداب، ارشد ندیم، رحمان مصور، علینا عترت، سالم سلیم، فرمان چودھری، خالد اخلاق، انس فیضی، شاکر دہلوی، ابھیشیک تیواری اور شارقہ ملک کے نام شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 نومبر 2024

انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں خطاطی ونمائش ورکشاپ

نئی دہلی: ایران کلچر ہاؤس نئی دہلی، انجمن خطاطان ہند کے باہمی اشتراک سے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں نمائش خطاطی اور ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا جس میں ایران سے آئے سہ نفری وفد پر مشتمل خواتین خطاط نے شرکت کی۔ اس ورکشاپ میں عالمی شہرت یافتہ ایرانی فنکاروں نے طلبہ کو فن خطاطی کے رموز و اوقاف سے آشنا کرایا۔ ورکشاپ میں خطاطی سے منسلک صوفیہ انجمن کے طلبہ و طالبات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، صوفیہ انجمن سے خطاطی کی استاد محترمہ شاہین صاحبہ نے ایرانی فنکار اساتذہ سے خطاطی کی فن کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور ان کا شکریہ ادا کیا۔ محترمہ شاہین نے کہا کہ ہمیں ایرانی خطاط سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ اس ورکشاپ میں ہم ایک منفرد اور دلکش انداز میں فن خطاطی سے آشنا ہوئے۔ ایران کلچر ہاؤس کے کلچرل کاؤنسلر ڈاکٹر فریدالدین فرید عصر نے ورکشاپ میں تمام فنکار اور اساتذہ اور فن خطاطی سے دلچسپی رکھنے والے سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ فن خطاطی کا یہ فن دنیا کے ہر گوشے اور ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔ اسلامی خطاطی دراصل دستی تحریر ہوتی ہے اور خطاطی کو فنکارانہ انداز سے پیش کرنے کا نام فن خطاطی ہے۔ شام جوں جوں ڈھل رہی تھی پروگرام کی جانب شائقین کے قدم بڑھتے چلے آرہے تھے۔ شائقین میں طلبہ و جوانان کے علاوہ کئی شائقین 50 اور 60 سال کی عمر کے مرد و خواتین نے اس فن سے متعلق دلچسپی دکھائی دی جب کہ دہلی کے مختلف علاقوں میں خطاطی سے متعلق چلنے والے مراکز کے طلبہ و طالبات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 16 نومبر 2024

غالب اکیڈمی کی ماہانہ نثری نشست

نئی دہلی: غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں گزشتہ روز ماہانہ نثری نشست کا اہتمام کیا گیا، جس کی صدارت مشہور افسانہ نگار خورشید حیات نے کی۔ انھوں نے کہا کہ آج کے افسانے مسائل حیات کا آئینہ ہیں۔ بنات کی صدر ڈاکٹر نگار عظیم نے کہا کہ کہانی نے نئے راستے تلاش کر لیے ہیں۔ پہلے کہانی سنائی جاتی ہے۔ اب افسانہ لکھا جاتا ہے۔ اس موقعے پر اردو اور ہندی ادیبوں نے کہانیاں اور مضامین پیش کیے۔ سید وجاہت مظہر نے اپنے مضمون 'یادوں کا جشن' میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی متنوع شخصیت پر روشنی ڈالی۔ عزہ معین نے

ایک افسانہ 'پچھتاوا' کے عنوان سے پیش کیا۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر این سی ای آر ٹی ڈاکٹر مصطفیٰ علی نے اپنا افسانہ 'منتقلی' پیش کیا۔ ڈاکٹر شاہد حبیب نے اپنے مضمون 'رفعت سروش اردو کا ایک روشن دماغ' میں رفعت سروش کی شخصیت کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی۔ ہندی کے ادیب این سی کھنڈیل وال نے 'بات اس رات کی جب میں مرگیا تھا' کے عنوان سے کہانی پیش کی۔ اس میں انھوں نے بتانے کی کوشش کی کہ مرنے کے بعد دوسروں کے ساتھ کی گئی بھلائی ہی کام آتی ہے۔ ڈاکٹر شہلا احمد نے ایک طویل کہانی پیش کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر وسیم راشد نے دہلی کے محاوروں اور کہاوتوں پر ایک مضمون پڑھا جس میں انھوں نے اپنی والدہ سے سنے محاوروں، کہاوتوں اور اس کے استعمال پر روشنی ڈالی۔ جیسے یہ منھ اور مسور کی دال، نون نمک، ہاتھ نہ مٹھی ہڑبڑا کے اٹھی وغیرہ۔ اس موقعے پر متین امروہوی نے صریر خامہ کے عنوان سے ایک مضمون پیش کیا۔ ہندی کے ادیب پروین ویاس نے کہانیوں پر اظہار خیال کیا اور ایک کہانی پیش کی۔ عاشق الفاظ نے 'ہرفن مولا' کے عنوان سے ایک مختصر افسانہ پیش کیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی ہندی کے مشہور ادیب وویک کویشور نے ایک تمثیلی کہانی پڑھی جس میں انھوں نے پھولوں کو مجسم کردار بنا کر پیش کیا۔ اس موقعے پر شوکت محمد کی نئی کتاب نیرنگ خیال کا تعارف کتاب کے مؤلف ارشد ندیم نے پیش کیا۔ آخر میں سکریٹری نے شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا کہ اگلی نشست 14 دسمبر 2024 کو ہوگی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 3 دسمبر 2024

اترپردیش

فراق گورکھپوری: حیات اور ادبی خدمات

وارانسی: شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کے زیر اہتمام بہ تعاون اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ، دو روزہ قومی سمینار (13-14 نومبر 2024) بعنوان 'فراق گورکھپوری: حیات اور ادبی خدمات' کا انعقاد کیا گیا جس کا افتتاحی اجلاس یونیورسٹی کے آر کے ہال میں منعقد ہوا۔ اجلاس کی صدارت ڈین فیکلٹی آف آرٹس اور انگریزی کے ممتاز اسکالر پروفیسر مایا شنکر پانڈے نے کی۔ افتتاحی خطاب میں انھوں نے کہا کہ یہ اردو زبان کی خوش نصیبی ہے کہ اس نے فراق جیسا عظیم شاعر اس ملک کو عطا کیا۔ فراق انگریزی زبان کے ماہر تھے انگریزی زبان کے لیے ان کی گرانقدر خدمات ہیں لیکن اردو نے انھیں شہرت دوام بخشی۔ ہندی کے ممتاز ادیب پروفیسر اودھیش پردھان نے فراق کی عظمت اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو زبان ہماری مشترکہ تہذیب کی علامت ہے اور فرق اس خوبصورت زبان کے عظیم شاعر ہیں ان کی شاعری ہندی اردو دونوں میں مشترک ہے وہ تاعمر شعر وادب کی آبیاری کرتے رہے۔ معروف اردو ادیب پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ فراق نے شاعری اور نثر دونوں کے ذریعے زبان وادب کو مال مال کیا اور شاعری کے ڈکشن کو ہندوستانیت سے جوڑا ہے۔ اپنے کلیدی خطبے میں اردو کے ممتاز ادیب شمیم طارق نے فراق کی غزلوں، نظموں اور رباعیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ فراق جدید غزل کے معمار ہیں۔ وہ شاعری میں نت نئے تجربے کرتے رہے اسی لیے ان کی شاعری میں تنوع ہے۔ ان کی شخصیت اور فن دونوں نے پورے ہندوستانی ادب کو متاثر کیا ہے۔ صدر شعبہ اردو پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ فراق نے زبان وادب کے ساتھ ملک کی مشترکہ تہذیب اور انسانی اقدار کو اپنے شعر وادب کے ذریعے فروغ دینے کی بھرپور کوشش کی۔ دو روزہ قومی سمینار کا افتتاحی اجلاس یونیورسٹی کے بانی مہامنا پنڈت مدن موہن مالویہ کے مجسمے کی گل پوشی سے ہوا۔ نظامت کے فرائض شعبہ کے استاد ڈاکٹر مشرف علی اور شکریہ کی رسم ڈاکٹر احسان حسن نے انجام

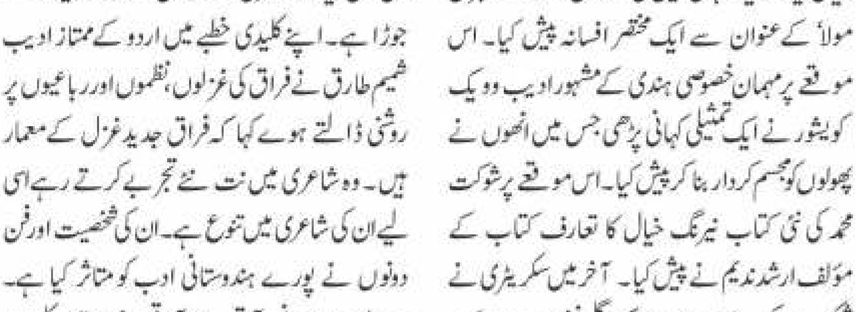

دیے۔ افتتاحی اجلاس کے بعد فراق کی یاد میں مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس میں اردو ہندی کے اہم شعرا بالخصوص شمیم طارق، اشہد کریم الفت، محمد عقیل، عالم بنارسی، ثمر غازی پوری، احمد اعظمی، ضیا احسنی، شمیم غازی پوری، عبدالرحمٰن، ظفر مہدی اور اسجد رضا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ مشاعرے کی صدارت ممتاز ہندی شاعر وادیب پروفیسر وششٹھ انوپ نے کی اور نظامت کے فرائض سرور ساجد نے انجام دیے۔

متذکرہ دو روزہ قومی سمینار کے دو تکنیکی سیشن یونیورسٹی کے آر کے ہال میں منعقد ہوئے جس کی صدارت شعبہ اردو، کاشی ودیا پیٹھ سابق صدر پروفیسر شاہینہ رضوی اور شعبۂ ہندی بنارس ہندو یونیورسٹی کے استاد پروفیسر کرشنا موہن نے کی۔ ان دو اجلاس میں مختلف کالجز اور یونیورسٹیوں کے اسکالرز نے فراق گورکھپوری کی زندگی اور ان کی شعری وادبی خدمات کے تعلق سے اپنے تحقیقی مقالے پیش کیے جن میں ڈاکٹر قاسم خورشید، ڈاکٹر سورج دیو سنگھ، ڈاکٹر عبدالحئی، پروفیسر رضی الرحمٰن، ڈاکٹر اشد کریم، ڈاکٹر دبیر احمد، ڈاکٹر رشی کمار شرما، ڈاکٹر مجاہد اسلام، ڈاکٹر سرور ساجد، ڈاکٹر احسان حسن، ڈاکٹر محمد قاسم انصاری، امام الدین، شبنم انصاری، محمد عامر وغیرہ شامل ہیں۔ ظہرانے کے بعد اختتامی سیشن منعقد کیا گیا جس کی صدارت معروف اور ممتاز نقاد اور دانشور جناب شمیم طارق نے کی اور کہا کہ آفتاب احمد آفاقی اس طرح کے سمینار منعقد کرتے ہیں جو وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مولانا آزاد کالج کولکاتا کے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر دبیر احمد نے بھی اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے سمینار کے کامیاب انعقاد پر مبارکباد پیش کی اور کہا کہ یہ سمینار علمی میدان میں ایک مینار ثابت ہوگا۔ تکنیکی اجلاس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد قاسم انصاری، ڈاکٹر رقیہ بانو نے اور اختتامی اجلاس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر عبدالسمیع نے انجام دیے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر عبدالسمیع، بی ایچ یو، وارانسی، 3 دسمبر 2024

عندلیب شادانی کی ادبی خدمات

رامپور: گورنمنٹ گرلز گریجویٹ کالج میں اترپردیش اردو اکادمی کے زیر اہتمام یک روزہ قومی سمینار بعنوان ڈاکٹر عندلیب شادانی کی ادبی خدمات کے موضوع پر

ہوا۔ پروگرام کی صدارت سنیتا جیسوال پرنسپل کالج ہٰذا اور نظامت خوبصورت انداز میں ڈاکٹر رضیہ پروین نے کی۔ پرگرام میں مہمان خصوصی کے طور پر شفیع الزماں شفیق سابق ڈپٹی ڈائرکٹر نہرو یوا کینسر سنگٹھن اترپردیش رہے۔ مہمان اعزازی کے طور پر معروف افسانہ نگار ایس فضیلت معروف شاعر اظہر عنایتی پروفیسر محمد ارشد رضوی موجود رہے۔ کلیدی کلمات میں ڈاکٹر رضیہ پروین نے بتایا کہ عندلیب شادانی نے اردو ادب میں تخلیق و تنقید شاعری پر زبردست کام کیا ہے۔ کئی کتابیں ان کی کافی مقبول ہوئی ہیں جن میں نشاط رفتہ (شعری مجموعہ)، نقش بدیع (تحقیق کی روشنی میں)، نوش و نیش، سچی کہانیاں (افسانے)، شرح رباعیات، بابا طاہر اور دور حاضر اردو غزل گوئی پیام اقبال (تحقیق کی روشنی میں)، چھوٹا خدا (ڈرامہ)، ربع شکست (مجموعہ کلام) قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ خبر عامہ رسالے کی انھوں نے ادارت بھی کی۔ سمینار میں ڈاکٹر موصوف احمد ڈاکٹر سنجی کمار ڈاکٹر حنا آفرین، ڈاکٹر بشریٰ خاتون، اطہر مسعود خاں، رباب انجم، یعقوب حسین نے مقالات پیش کیے۔ دوسرے سیشن کی صدارت ماسٹر اسرار احمد نے کی۔ آخر میں ڈاکٹر افتخار احمد قادری نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 1 دسمبر 2024

پروین شاکر پر سمینار و مشاعرہ

لکھنؤ: لوح و قلم کے زیر اہتمام نہرو یوا کیندر (نزد رومی گیٹ) میں ایک عالمی سمینار اور مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں ادارۂ لوح و قلم کی دعوت پر ملک و بیرون ملک کے اکابرین اور دانشوروں نے پروین شاکر کی شاعری کے مختلف جہات و ابعاد پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کو عہد ساز شاعرہ قرار دیا۔ سمینار کے افتتاحی اجلاس کی مہمان خصوصی حکومت اترپردیش کی خواتین کمیشن کی نائب صدر چارو چودھری نے کہا کہ جب لوح و قلم کے چیئرمین ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق نے اس سمینار کے لیے مدعو کیا تو میں نے اس کے بعد پروین شاکر کی شاعری کو سنجیدگی سے پڑھا اور محسوس کیا کہ وہ ہمارے عہد کی نہ صرف اہم شاعرہ ہیں بلکہ عظیم شاعرہ ہیں۔

اترپردیش کے سابق کارگزار وزیر اعلیٰ ڈاکٹر عمار رضوی نے افتتاحی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ خوشبوؤں کی شاعرہ پروین شاکر کی شاعری نے اپنی خوشبو سے ساری دنیا کو اپنے حصار میں لے لیا ہے، انھوں نے جس خوش اسلوبی سے خواتین کی نفسیات کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے اس طرح ان کے معاصرین میں کسی نے نہیں کیا۔ برطانیہ سے تشریف لائے عالمی شہرت یافتہ شاعر روزنامہ 'صحافت' برمنگھم کے ایڈیٹر امیر مہدی نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پروین شاکر کی شاعری مشرقی اقدار سے ہم آہنگ ہے اور مشرقی تہذیب کی سچی ترجمانی کرتی ہے۔ کناڈا سے تشریف لائے مشہور زمانہ اردو اسکالر نامور محقق ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے کلیدی خطبے میں اردو شاعری میں استعارے کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے پروین شاکر کے ماقبل اور مابعد کے ان شعرا کا ذکر کیا جنھوں نے خوشبو کو اپنی شاعری میں استعارہ بنا کر پیش۔ دہلی سپریم کورٹ کے معروف وکیل خلیل الرحمٰن ایڈوکیٹ نے پروین شاکر کی شاعری کے ان مخفی پہلوؤں پر گفتگو کی جو اب تک پردہ خفا میں تھے۔ لوح و قلم کے چیئرمین ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق نے سمینار منعقد کرنے کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے ملک و بیرون ملک کے صاحبان قلم کو اس سمینار کے ذریعے پروین شاکر کی شاعری پر مقالات لکھنے کی دعوت اس لیے دی ہے تاکہ پروین شاکر کی شاعری کے وہ اسرار و رموز جو ابھی تک پوشیدہ ہیں ان پر بھی سیر حاصل مکالمہ ہوسکے۔

افتتاحی اجلاس کے علاوہ سمینار کو تین اجلاس میں تقسیم کیا گیا تھا، پہلا اجلاس ڈاکٹر تقی عابدی (کناڈا) کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں پروفیسر ارتکاز افضل اورنگ آباد مہاراشٹر، ڈاکٹر زیبا ناز مراد آباد، ڈاکٹر شجاعت علی ناندیڑ (مہاراشٹر)، جلیل نظامی (حیدرآباد)، ڈاکٹر حنا افشاں (کانپور) نے اپنے گراں قدر مقالات پیش کیے۔ پہلے اجلاس کے نظامت کے فرائض ڈاکٹر ذیشان حیدر نے انجام دیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر انور پاشا (دہلی) اور پروفیسر محمد کاظم (دہلی) نے مشترکہ طور پر کی۔ جس میں خلیل الرحمٰن ایڈوکیٹ دہلی، ڈاکٹر عشرت ناہید (لکھنؤ)، ڈاکٹر آفتاب عالم (علی گڑھ)، ڈاکٹر جاںنثار عالم (لکھنؤ)، ڈاکٹر مجاہد الاسلام (لکھنؤ)، مجاہد سید (لکھنؤ) نے اپنے فکر انگیز مقالات پیش کیے۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر ارتکاز افضل (اورنگ آباد)، خلیل الرحمٰن ایڈوکیٹ (دہلی) اور پروفیسر صالحہ رشید (الہ آباد) نے مشترکہ طور پر کی، جس میں ڈاکٹر تقی عابدی (کناڈا)، امیر مہدی (برطانیہ)، پروفیسر محمد کاظم (دہلی)، ڈاکٹر سبط حسن نقوی (لکھنؤ)، ڈاکٹر منور حسین (لکھنؤ) نے مقالات پیش کیے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق نے انجام دیے۔

اسی سمینار ہال میں عالمی مشاعرے کا انعقاد کیا جس کی صدارت کناڈا سے تشریف لائے اردو کے نامور اسکالر ڈاکٹر تقی عابدی نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق نے بحسن و خوبی انجام دیے۔ مشاعرے میں امیر مہدی (برطانیہ)، عمر فاروق (آسٹریلیا)، خلیل الرحمٰن (دہلی)، پروفیسر ارتکاز افضل (اورنگ آباد)، پروفیسر فخر عالم (لکھنؤ)، جلیل نظامی (حیدرآباد)، حسن کاظمی (لکھنؤ)، ڈاکٹر طارق قمر (لکھنؤ)، منیش شکلا (لکھنؤ)، جگمیت نوربو خیال (لداخ)، ڈاکٹر شیوا ترپاٹھی سرس (بستی)، ڈاکٹر سرلا آسماں (لکھنؤ)، روبینہ ایاز (لکھنؤ) نے اپنا خوبصورت کلام سنا کر سامعین کو محسور کردیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 20 نومبر 2024

شبلی ڈے

اعظم گڑھ: شبلی نیشنل کالج میں کالج کے بانی، عظیم مفکر اور ماہر تعلیم علامہ شبلی نعمانی کی یاد میں 'شبلی ڈے' کا انعقاد کیا گیا جس کا بنیادی مقصد علامہ شبلی کے نظریات کو تعلیم، معاشرہ اور قوم کی تعمیر کے حوالے سے آگے بڑھانا تھا۔ اس موقعے پر خاص طور پر کالج کے طلبا کو علامہ شبلی نعمانی کے افکار سے روشناس کرایا گیا اور تعلیم کے حوالے سے علامہ کے وژن کو آگے بڑھانے کی ترغیب دی گئی۔ اس موقعے پر مہاراجہ سہیل دیو یونیورسٹی، اعظم گڑھ کے وائس چانسلر پروفیسر پردیپ کمار شرما نے مہمان خصوصی کے طور پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ علامہ شبلی کے افکار کی سنجیدگی کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ انھوں نے محض 26 سال کی عمر میں اتنا عظیم ادارہ قائم کیا اور ان کی حب الوطنی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اس ادارے کے نام سے قبل 'نیشنل' کا لفظ استعمال کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لوگ نیشنل لفظ کا استعمال کرنے سے خوف کھاتے تھے۔ کالج کی انتظامی کمیٹی 'دی اعظم گڑھ مسلم ایجوکیشن سوسائٹی' کے صدر ڈاکٹر شوکت علی نے اپنے صدارتی خطاب کے دوران کالج انتظامیہ کی کامیابیوں اور مستقبل کے منصوبوں پر روشنی

ڈالی۔ اس موقعے پر اعظم گڑھ مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کی نمائندگی کرتے ہوئے سوسائٹی کے جوائنٹ سکریٹری انوار احمد نے علامہ شبلی نعمانی کے مقاصد بیان کیے۔ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کی نمائندگی کرتے ہوئے مولانا عمیرالصدیق ندوی نے قوم کی تعلیمی ترقی میں شبلی کے تعاون کو پیش کیا، جب کہ پروفیسر ڈاکٹر محمد علی نے شبلی کے مقاصد کو بیان کیا۔ شعبہ تاریخ کے صدر پروفیسر علاؤ الدین خان نے علامہ شبلی کے سیاسی افکار، سیاسی میدان میں ان کی خدمات اور مذہبی ہم آہنگی پر روشنی ڈالی۔ ٹیچرس ایسوسی ایشن کی نمائندگی کرتے ہوئے پروفیسر محمد طاہر نے تعلیم کے شعبے میں شبلی کی خدمات کو سراہا۔ شعبہ انگریزی کے پروفیسر ڈاکٹر سرفراز نواز نے شبلی کی شاعری اور ڈاکٹر ارم الماس نے موجودہ دور میں شبلی کی معنویت پر خیالات کا اظہار کیا۔ اس دوران ثقافتی پروگراموں کے علاوہ مقابلہ جاتی پروگراموں کا انعقاد کیا گیا۔ ان پروگراموں میں خاص طور پر تقریر و مباحثہ، مضمون نویسی، خطاطی، مصوری اور مہندی کے مقابلے شامل تھے۔ ان مقابلوں کے جیتنے والوں کو یوم شبلی کے موقعے پر ایوارڈ اور انعامات سے نوازا گیا۔ آخر میں کالج کے پرنسپل پروفیسر افسر علی نے تمام مہمانوں اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کا اختتام قومی ترانے کے ساتھ ہوا۔ پروگرام کی نظامت پروفیسر محمد خالد نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 نومبر 2024

نظیر اکبرآبادی کا عہد اور ان کا آدمی نامہ

لکھنؤ: نربل ورگ سیوا سمیتی کے زیر اہتمام وفخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے مالی تعاون سے انصار انٹر کالج مراد آباد میں نذیر اکبرآبادی کا عہد اور ان کا آدمی نامہ کے موضوع پر ایک قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت عالمی شہرت یافتہ شاعر اور مشہور زمانہ ناظم مشاعرہ منصور عثمانی نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر اسلم جمشید پوری نے چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہوئے۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ نذیر عام لوگوں کے شاعر تھے۔ انھوں نے عام زندگی، موسموں، تہواروں، پھلوں، سبزیوں وغیرہ کے موضوعات پر لکھا۔ وہ سیکولرازم کی روشن مثال ہیں۔ اگر ہم نظیر کی شاعری کو گہرائی سے سمجھیں اور پرکھیں تو ہم کو ان کی پوری شاعری میں، امن وامان اور اتحاد بین المذاہب کا درس ملتا ہے۔ نظیر نے اپنی پوری زندگی آگرہ میں گزاری جو اس وقت اکبرآباد کے نام سے مشہور تھا۔ اس سمینار میں شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر شاکر حسین اصلاحی، ڈاکٹر معراج الحسن، ڈاکٹر ارشاد، ڈاکٹر شفیع ایوب، ڈاکٹر رباب انجم، ڈاکٹر مجاہد فراز وغیرہ نے اپنے تحقیقی مقالے پیش کیے۔ سمینار کی نظامت ڈاکٹر محمد آصف نے کی۔ سمینار کے اختتام پر کمیٹی کے رکن فیاض احمد نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 18 نومبر 2024

فاروق ارگلی اور اے رحمٰن کو استقبالیہ

میرٹھ: ادب زندگی کا ترجمان ہوتا ہے۔ میری آپ سبھی طلبہ سے گزارش ہے کہ خوب محنت اور لگن سے اپنے نصاب کے ساتھ ساتھ قدرے خارجی مطالعے کا بھی شوق پیدا کریں اور خوب فکشن کا مطالعہ کریں۔ مطالعہ جتنا وسیع ہوگا اتنی ہی آپ کے اندر تحریری صلاحیت پیدا ہوگی۔ ان خیالات کا اظہار معروف ادیب و ناقد فاروق ارگلی نے شعبۂ اردو میں منعقدہ استقبالیہ پروگرام میں کیا۔ صدارت معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کی۔ تعارفی کلمات ڈاکٹر ارشاد سیانوی، استقبالیہ کلمات ڈاکٹر آصف علی، نظامت ڈاکٹر شاداب علیم اور شکریے کی رسم ڈاکٹر الکا وششٹھ نے ادا کیا۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج ہمارے شعبے میں اردو کی دو عظیم ہستیاں فاروق ارگلی اور عبدالرحمٰن موجود ہیں۔ اردو ادب کے لیے ان دونوں کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ 'عالمی جائزہ' کے مدیر عبدالرحمٰن نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میں آکر ہمیشہ خوشی کا احساس ہوتا ہے جس کی وجہ نہ صرف یہاں کا خالص ادبی و علمی ماحول اور فضا ہے بلکہ صدر شعبہ پروفیسر اسلم جمشید پوری کی دوستانہ شفقت اور مہمان نوازی بھی ہے۔ ہر مرتبہ نئے موضوعات پر گفتگو اور نئی کتب کا تعارف وتحفہ تو ایسی نعمتیں ہیں جن کا لالچ کسی نہ کسی بہانے سے یہاں آنے کا سبب ہوتا ہے۔ ہم نے حال ہی میں صادقین نمبر نکالا ہے اور جلد ہی ابن صفی پر ایک بڑا کام منظر عام پر آئے گا۔ اس موقعے پر کثیر تعداد میں طلبہ وطالبات موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 نومبر 2024

بہار

اردو سیل مونگیر کے زیراہتمام آرٹ گیلری میں فروغ اردو سمینار، مشاعرہ اور ورکشاپ

مونگیر: اردو زبان کے فروغ کے لیے محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، اردو ڈائرکٹریٹ، پٹنہ کے زیر اہتمام فروغ اردو کے تحت ضلع اردو زبان سیل مونگیر کی جانب سے آرٹ گیلری، مونگیر میں ضلع سطح پر ایک ورکشاپ، سمینار اور مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کا افتتاح مونگیر کے ضلع مجسٹریٹ اونیش کمار سنگھ نے رسم شمع افروزی سے کیا۔ اس میں ضلع کے مختلف تعلیمی اداروں سے وابستہ طلبہ وطالبات اور اساتذہ شریک ہوئے۔ افتتاحی خطاب کرتے ہوئے ڈی ایم اونیش کمار سنگھ نے اردو زبان کی اہمیت اور اس کے فروغ کے حوالے سے کہا کہ اس طرح کے پروگرام اردو زبان کی ترویج میں نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو اور ہندی کا رشتہ سگی بہنوں جیسا ہے اور دونوں زبانوں کو ایک دوسرے کی تکمیل میں مددگار تصور کیا جاتا ہے۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے پروفیسر ڈاکٹر شاہد رضا جمال نے اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے گھروں میں اردو کا چلن عام کرنے پر زور دیا۔

پروگرام کی نظامت محمد معراج اردو مترجم کلکٹریٹ مونگیر نے کی۔ مشاعرے میں مختلف معروف شعرا نے شرکت کی جن میں ڈاکٹر جاوید اختر آزاد، اقبال احمد اقبال، رخشاں ہاشمی، امام انیس، محمد حسین، خالد شمس، عبدالشکور، خورشید گوہر، محمد صابر انور، اور محمد احسان انور شامل تھے۔ پروگرام کے اختتام پر انچارج افسر ضلع اردو زبان سیل اور جاوید اختر نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 نومبر 2024

تلنگانہ

ماحولیاتی تنقید اور اردو ادب

حیدرآباد: شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد کے ذریعے منعقدہ سہ روزہ بین الاقوامی سمینار بہ عنوان 'ماحولیاتی تنقید اور اردو ادب' اختتام پذیر ہوا۔ اس سمینار کا افتتاحی اجلاس 12 نومبر 2024 کو اسکول آف ہیومانٹیز کے آڈیٹوریم، یونیورسٹی حیدرآباد میں سہ پہر 3 بجے عمل میں آیا، جس میں ملک و بیرون ملک کے

کئی ماہرین نے شرکت کی۔ افتتاحی اجلاس کے خیر مقدمی کلمات پروفیسر فضل اللہ مکرم، صدر شعبۂ اردو نے جب کہ اغراض و مقاصد سمینار کی کوآرڈینیٹر ڈاکٹر عرشیہ جبین نے پیش کیے۔ بین الاقوامی سمینار کا افتتاحی خطبہ پروفیسر بی جے راؤ، شیخ الجامعہ، یونیورسٹی آف حیدرآباد کو دینا تھا مگر وہ اپنی مصروفیت کے سبب شامل نہ ہو سکے۔ اس سمینار میں مہمان اعزازی کے طور پر پروفیسر محیا عبدالرحمٰن، تاشقند یونیورسٹی، ازبکستان، ڈاکٹر مظہر اقبال مظہر، نیلسن کالج، لندن اور ڈاکٹر مروہ لطفی سباعی ہیکل، عین شمس یونیورسٹی، قاہرہ، مصر سے آن لائن شامل ہوئے جب کہ مہمان خصوصی کے طور پر پروفیسر شہاب الدین ثاقب، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی اور پروفیسر عباس رضا نیر، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ شامل رہے۔ اس بین الاقوامی سہ روزہ سمینار کا کلیدی خطبہ اردو ادب کے نام ور ناقد و محقق پروفیسر ناصر عباس نیر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، پاکستان نے پیش کیا۔ افتتاحی اجلاس میں نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد خوشتر جب کہ اظہار تشکر کے فرائض ڈاکٹر محمد کاشف نے انجام دیے۔

سمینار کا پہلا تکنیکی اجلاس عالمی ادب اور ماحولیاتی تنقید کے عنوان سے تھا، جس کی صدارت پروفیسر عباس رضا نیر اور پروفیسر محمد خواجہ کرام الدین نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر محیا عبدالرحمن تاشقند یونیورسٹی، ازبکستان، ڈاکٹر مظہر اقبال مظہر، نیلسن کالج، لندن، برطانیہ، ڈاکٹر صائمہ نذیر، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ڈاکٹر مروہ لطفی سباعی ہیکل، عین شمس یونیورسٹی، قاہرہ، مصر اور ڈاکٹر اویس احمد بھٹ، شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر سے آن لائن موڈ میں اپنے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس میں کل پانچ مقالے پیش کیے گئے جبکہ دوسرے تکنیکی اجلاس میں، جس کا عنوان بین العلومی ادب اور ماحولیاتی تنقید تھا، اس میں ماحولیاتی تنقید اور تیلگو ادب، اردو اور تیلگو افسانوں کا تقابلی مطالعہ ماحولیاتی تنقید کے تناظر میں، انگریزی ادب اور ماحولیاتی تنقید، ہندی ادب اور ماحولیاتی تنقید، ملیالم ادب اور ماحولیاتی تنقید اور اکیسویں کے ہندی ناولوں میں ماحولیاتی ڈسکورس کے عنوان سے مقالے پیش کیے گئے۔

اس کے علاوہ چھ اور تکنیکی اجلاس ہوئے جن میں کل 55 مقالے پیش کیے گئے۔ اس سمینار کے اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر محمد زماں آزردہ، پروفیسر شوکت حیات اور پروفیسر شہاب الدین ثاقب نے کی جس میں کولکاتا، کشمیر، کیرل، تامل ناڈو، دہلی اور لکھنؤ سے آئے مندوبین نے اپنے اپنے تاثرات پیش کیے اور سمینار کو تاریخی اور بے حد کامیاب بتایا۔

سمینار میں تینوں دن تفریحی اور تہذیبی پروگرام بھی پیش کیے گئے جن میں افتتاحی اجلاس کے بعد دو ڈرامے پیش کیے گئے۔ دوسرے دن تکنیکی اجلاس کے بعد شامِ غزل کا پروگرام رکھا گیا تھا اور آخری دن شام ساڑھے پانچ بجے مشاعرہ رکھا گیا تھا جس میں یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات نے بھرپور طریقے سے شرکت کی اور پورا آڈیٹوریم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر محمد ناظم علی، حیدرآباد، 18 نومبر 2024

عربی زبان وادب میں مستشرقین کی خدمات

حیدرآباد: مستشرقین اور اہل یوروپ نے عربی زبان وادب پر خاصی تحقیق کی اور مشرق و مغرب کے درمیان خلیج کو پاٹنے کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر ثناء اللہ ندوی نے کیا جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے استاد ہیں۔ شعبۂ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی جانب سے منعقدہ اس دو روزہ سمینار کا عنوان 'عربی زبان وادب میں مستشرقین کی خدمات' ہے۔ جس کے افتتاحی اجلاس میں وائس چانسلر پروفیسر سید عین الحسن نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ قبل ازیں سمینار کے آغاز میں صدر شعبۂ عربی پروفیسر علیم اشرف جائسی نے اپنے خیر مقدمی تقریر میں سمینار کے اغراض و مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اسکول آف لینگویجز کی ڈین پروفیسر عزیز بانو نے اس سمینار میں پیش کیے جانے والے مقالات کو کتابی شکل دینے کی روایت کو برقرار رکھنے کے لیے صدر شعبہ اور سمینار کنوینر ڈاکٹر جاوید ندیم ندوی کو مبارکباد دی۔ وائس چانسلر پروفیسر سید عین الحسن نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ عربی زبان و ادب کو دنیا کے مختلف زبانوں کے مقابل ایک خاص مقام حاصل ہے لیکن عربی زبان کے ساتھ یہ زیادتی ہوئی کہ محققین نے اسے اس کا مقام نہیں دیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر عبدالماجد نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ مستشرقین کی تاریخ ایک ہزار سال قدیم ہے۔ مستشرقین کی اس تحریک سے عربی زبان وادب اور مشرقی و اسلامی علوم پر مثبت و منفی دونوں طرح کے اثرات مرتب ہوئے ہیں جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر محمد قطب الدین نے بھی سمینار کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کیا۔ انھوں نے مولانا آزاد کے اس قول کو نقل کیا کہ مسلمانوں نے اپنے قیمتی، تاریخی، تعلیمی سرمائے کو فراموش کردیا اور غفلت برتی۔ ان کے مقابل اہل یوروپ نے اس کی اہمیت کو سمجھا اور محفوظ بھی رکھا۔ شعبۂ عربی کے سینئر استاد ڈاکٹر جاوید ندیم نے سمینار کے افتتاحی اجلاس کی کارروائی چلائی جب کہ اجلاس کے اختتام پر ڈاکٹر سعید بن مخاشن نے ہدیہ تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 6 نومبر 2024

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اسٹڈی سینٹر میں اسناد کی تقسیم

نرمل: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند کا اسٹڈی سینٹر ضلع نرمل

میں الانصار ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام چلایا جارہا ہے۔ جس کے تحت نرمل کے مختلف اسکولوں کے طلبا و طالبات اسٹڈی سینٹر میں اپنا داخلہ لے کر قومی کونسل کا ڈپلومہ حاصل کرتے ہیں۔ شہر نرمل میں گورنمنٹ اسکول اسرا کالونی، نرمل شہر کے نوجوان ماہر تعلیم انصار احمد ساحل کی نگرانی میں ان طلبہ و طالبات نے امتحانات دے کر اپنا سرٹیفکیٹ قومی کونسل کے اسٹڈی سنٹر کے کوآرڈینیٹر محمد افتخار الدین انصاری نظامی سے حاصل کیا۔ اس موقعے پر جناب انصاری نے کہا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو حکومت ہند میں ایک سالہ اردو ڈپلومہ، دو سالہ عربک ڈپلومہ اور ایک سالہ عربی ڈپلومہ کورس کرایا جاتا ہے۔ ہزاروں سینٹرس پورے ہندوستان میں چلائے جاتے ہیں۔ محمد افتخار الدین انصاری سکریٹری الانصار ایجوکیشنل سوسائٹی ضلع نرمل نے کامیاب طلبہ و طالبات کو مبارکباد پیش کی۔ نرمل کے اساتذہ اور اسکولوں

کے انتظامیہ کا انھوں نے شکریہ ادا کیا اور سب سے اپیل کی کہ ماہ جنوری 2025 میں داخلے شروع ہونے والے ہیں۔ اس کے لیے دفتر الانصار ایجوکیشنل سوسائٹی مغل پورہ، نرل پر رابطہ کریں۔

پریس ریلیز: محمد افتخارالدین انصاری، نظامی، ضلع نرل، سکریٹری الانصاری ایجوکیشنل سوسائٹی، اسٹڈی سینٹر، نرل، تلنگانہ، 4 دسمبر 2024

اعزاز و اکرام

اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام جلسہ تقسیم انعامات کتب کا انعقاد

نئی دهلی : اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام ادبی و ثقافتی سرگرمیاں لگاتار دہلی کے مختلف علاقوں میں منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ اکادمی ادبی سرگرمیوں کے علاوہ

ہر سال ادیبوں کو ایوارڈ اور مصنفین کی کتابوں کو انعامات سے بھی نوازتی ہے۔ اردو اکادمی کا یہ بہت ہی اہم پروگرام ہوتا ہے جسے بہت ہی اہتمام سے دہلی سکریٹریٹ کے اندر منعقد کیا جاتا ہے۔ اس سال گزشتہ تین برسوں کے منتخب 44 کتابوں پر مصنفین کو اول دوم اور سوم انعامات کے لیے منتخب کیا گیا۔ جنھوں نے جلسہ میں شریک ہو کر اپنا انعام، اکادمی کا نشان اور سند حاصل کیا۔

پروگرام میں مہمان خصوصی کے طور پر جناب سوربھ بھاردواج وزیر برائے فن، ثقافت والسنہ نے شرکت کی اور مصنفین وحاضرین سے مخاطب ہوتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ بہت ہی خوشی کی بات ہے کہ ہمارے درمیان آپ جیسے عمدہ مصنفین ہیں جن کی کتابوں کو آج کے الیکٹرانک دور میں بھی بڑے شوق سے لوگ پڑھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ جیسے مصنفین کی حوصلہ افزائی کے لیے اردو اکادمی کتابوں پر انعامات دیتی ہے۔ مہمان اعزازی وزیر برائے خوراک ورسد جناب عمران حسین نے مصنفین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے درمیان اچھی کتابیں لکھی جارہی ہیں اور ادبی حلقوں میں وہ بہت ہی زیادہ مقبول بھی ہو رہی ہیں۔ صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے اردو اکادمی کے وائس چیئر مین پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ کتاب کی حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے اور بغیر کتاب پڑھے کام نہیں چلتا ہے۔ ایک کتاب پڑھنے کے بعد آدمی کی شخصیت وہ نہیں رہتی ہے جو کتاب پڑھنے سے پہلے ہوتی ہے۔ استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے سکریٹری اردو اکادمی محمد احسن عابد نے کہا کہ اکادمی جیسے ادارے اسی لیے قائم ہوئے ہیں کہ جو بھی اردو میں اہم خدمات انجام دے رہے ہیں ان کی حوصلہ افزائی کی جائے، آپ تمام مصنفین جن کی کتابیں انعام کے لیے منتخب ہوئی ہیں مبارکباد کے مستحق ہیں۔

جلسہ تقسیم انعامات کتب میں جن مصنفین نے انعامات حاصل کیے ان میں پروفیسر توقیر احمد خاں 'جدید اردو شاعری'، جناب معصوم مرادآبادی 'اردو صحافت: آغاز سے 1857 تک کا ایک مختصر جائزہ'، جناب اسد رضا 'طنزانچے'، ڈاکٹر انا دہلوی 'آبروئے غزل'، ڈاکٹر ذاکر فیضی 'نیا حمام'، ڈاکٹر راشدہ رحمٰن 'ابتدائی دور کی ناول نگار خواتین'، پروفیسر مینو بخشی 'ابرِ کرم'، ڈاکٹر عبدالباری قاسمی 'تفہیم وتعبیر'، ڈاکٹر محمد نعمان خاں 'فلسفۂ تعلیم'، جناب سہیل انجم 'نقشِ برسنگ'، پروفیسر شہزاد انجم 'اردو کے غیر مسلم شعرا اور ادبا'، جناب انتظار نعیم 'اجالوں میں سفر'، جناب معین شاداب 'افکار و اظہار'، ڈاکٹر تسنیم بانو 'تحریک نسواں اور خواتین افسانہ نگار (جلد اول)'، ڈاکٹر زاہد احسن 'اردو شاعری میں حب الوطنی'، ڈاکٹر پرویز شہریار 'راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری'، ڈاکٹر سید فیضان حسن 'ادب وثقافت' ڈاکٹر ابراہیم افسر 'رشید حسن خاں کی ادبی جہات'، ڈاکٹر نوشاد منظر 'غالب ہندی ادیبوں کے درمیان'، ڈاکٹر شمع افروز زیدی 'جنھیں میں نے دیکھا جنھیں میں نے جانا'، محترمہ غزالہ قمر اعجاز 'مجھے بھی'، جناب اختر اعظمی 'دیدہ ور'۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی 'حاصلِ تحقیق'، ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم 'ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ'، پروفیسر کوثر مظہری 'جمیل مظہری فردنامہ'، جناب خورشید اکرم 'رات کی بات'، ڈاکٹر ریاض احمد 'تعلیم وتدریس کے عصری مباحث'، ڈاکٹر امیر حمزہ 'رباعی تحقیق'، جناب شاہد انور 'اشارت'، جناب محمد حیدر علی 'جدید اردو افسانے کا فکری وفنی منظر نامہ'، ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا 'ایک ایسا بھی دور'، جناب طالب رامپوری 'نئی امید کے پھول'، جناب احمد علوی 'عاشق دلباختہ'، محترمہ سیدہ نفیس بانو شمع 'وقت مجھے لکھ رہا ہے'، ڈاکٹر سرفراز جاوید 'دیوانِ آبرو'، ڈاکٹر شاہنواز ہاشمی 'اردو صحافت (حقائق، روایت اور امکانات)'، جناب اشرف علی بستوی 'کارپوریٹ میڈیا: ایک جائزہ' مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی 'نقوشِ خاطر' محترمہ شبنم آرا 'بدلتے معاشرتی اقدار اور عورت'، ڈاکٹر عرفان رضا 'دہلی کے کتب خانوں میں اردو مخطوطات کا اشاریہ' کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 نومبر 2024

غالب انعامات 2024

نئی دهلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کی غالب انعام سب کمیٹی کی میٹنگ جسٹس آفتاب عالم کی صدارت میں ہوئی جس میں کافی غور وخوض کے بعد ممبران نے

مندرجہ ذیل دانشوروں کو غالب انعامات برائے سال 2024 کے لیے منتخب کیا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ ہر سال اردو اور فارسی کے معتبر ادیبوں، دانشوروں کو غالب انعام دیتا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد کی جانب سے جاری کردہ بیان میں کہا گیا ہے کہ اس سال فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے اردو تنقید وتحقیق کے لیے ڈاکٹر الیاس اعظمی (اعظم گڑھ) کو منتخب کیا گیا ہے، فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے فارسی تنقید وتحقیق کے لیے پروفیسر محمد رضا نصیری (ایران) کو اور غالب انعام برائے مجموعی ادبی خدمات کے لیے پروفیسر عبدالرشید (دہلی) کو منتخب کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ یہ انعامات مبلغ 75 ہزار روپے نقد ایک تمغہ اور سند پر مشتمل ہے،

جو 20 دسمبر 2024 کو جشن غالب تقریبات کے افتتاحی جلسے میں پیش کیے جائیں گے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 نومبر 2024

واجد اللہ خان

حیدرآباد: سینئر صحافی واجد اللہ خان کو ستارہ صحافت ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ تفصیلات کے مطابق مولانا

آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے یوم آزاد کی اختتامی تقریب کے موقعے پر صحافت کے شعبے میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں انھیں یہ ایوارڈ دیا گیا۔ وائس چانسلر پروفیسر عین الحسن نے یادگار مومنٹو، سرٹیفیکیٹ پیش کیا۔ انھوں نے ساتھ ہی شال پوشی کی اور تہنیت پیش کی۔ یہ ایوارڈ اردو زبان و ادب سے متعلق دیرینہ ثقافتی اور لسانی خدمات کا اعتراف بھی ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 13 نومبر 2024

پروفیسر شہپر رسول

نئی دہلی: فاؤنڈیشن آف سارک رائٹرس اینڈ لٹریچر کے تحت اکیڈمی آف فائن آرٹس اینڈ لٹریچر کے خوبصورت آڈیٹوریم میں چہار روزہ 'سارک کانفرنس' کا آغاز فاؤنڈیشن کی چیئرپرسن اور پنجابی زبان کی مشہور

ناول نگار اجیت کور کی صدارت میں ہوا، جس میں ہندوستان، بنگلہ دیش، سری لنکا، مالدیپ، نیپال اور بھوٹان کے ڈیلیگیٹس نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اس موقعے پر ہندوستان سے ڈاکٹر تارا گاندھی بھٹا چارجی (مہاتما) گاندھی کی پوتی، پروفیسر شہپر رسول، ڈاکٹر انامکا، ڈاکٹر ونیتا اور اروندھتی سبرامنیم، بنگلہ دیش سے ڈاکٹر وملا گوہا، سری لنکا سے ڈاکٹر تھمیرا منجو اور نیپال سے بندھن آچاریہ کو ادبی خدمات کے لیے ایوارڈ پیش کیے گئے۔ پروفیسر شہپر رسول کو اردو زبان و ادب خصوصاً ان کی شعری خدمات کے لیے ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ سپاس نامے میں ان کی مجموعی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ان کو حاصل ہونے والے دیگر ایوارڈوں کا بھی ذکر کیا گیا۔ اس تقریب میں موجود مختلف زبانوں کے ادیبوں نے پروفیسر شہپر رسول کو مبارکباد پیش کی اور اردو والوں نے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 نومبر 2024

ڈاکٹر نگار عظیم

نئی دہلی: پروفیسر قمر رئیس ایک نابغہ روزگار شخصیت کے مالک تھے۔ اردو تنقید و تحقیق کے میدان میں ان کے کارنامے یادگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان خیالات

کا اظہار اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول نے غالب اکیڈمی میں منعقد راجستھان اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ایک جلسے کی صدارت کرتے ہوئے کیا، جس کا اہتمام معروف ادیبہ نگار عظیم کو پروفیسر قمر رئیس فکشن ایوارڈ کی تفویض کے لیے کیا گیا تھا۔ پروفیسر شہپر رسول نے صدارتی کلمات میں ڈاکٹر نگار عظیم کے فکر و فن پر سیر حاصل گفتگو کی۔ قمر رئیس فکشن ایوارڈ کے تحت ڈاکٹر نگار عظیم کی خدمت میں یادگاری تمغہ، توصیف نامہ شال اور 25 ہزار روپے کا چیک پیش کیا گیا۔ پروفیسر تسنیم فاطمہ نے شال اوڑھائی اور نعیمہ جعفری پاشا نے توصیف نامہ پیش کیا۔ تقریب کے مہمان خصوصی پروفیسر شہزاد انجم نے پروفیسر قمر رئیس، ڈاکٹر نگار عظیم اور راجستھان اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔ نعیمہ جعفری پاشا نے کہا کہ راجستھان اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام پروفیسر فاروق بخشی کی متحرک اور فعال شخصیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مہمان ذی وقار پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ پروفیسر قمر رئیس سائنسی فکر کے حامل تھے اور زندگی اور ادب کے تئیں ان کا رویہ ترقی پسندانہ تھا۔ معروف صحافی منصور آغا نے کہا کہ نگار عظیم ایک نہایت وضع دار، دردمند اور زبان و ادب کے تئیں ایک مخلص خاتون ہیں۔ ڈاکٹر نگار عظیم نے قمر رئیس فکشن ایوارڈ کے لیے ان کا انتخاب کرنے پر راجستھان اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا شکریہ ادا کیا۔ راجستھان اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر فاروق بخشی نے خیر مقدمی کلمات میں بتایا کہ سابقہ دو دہائیوں سے انسٹی ٹیوٹ اردو زبان و ادب اور دیگر ہندوستانی زبانوں سے اردو کے تہذیبی اور ثقافتی روابط کے حوالے سے مذاکروں، مباحثوں، سمیناروں اور مشاعروں کا انعقاد کرتا رہا ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شمع افروز زیدی، عذرا نقوی، تسنیم کوثر، معین شاداب، ڈاکٹر وسیم راشد، ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر سفینہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نگار عظیم کے فرزندان کامران عظیم اور سبحان عظیم نے اپنی والدہ کی خصوصیات کا ذکر کیا۔ نگار عظیم کے دیگر اہل خانہ اور اعزا بھی جلسے میں موجود تھے۔ متین امروہوی نے تہنیتی قطعات پیش کیے۔ اس باوقار تقریب کی نظامت کے فرائض برصغیر کے ممتاز ناظم معین شاداب نے انجام دیے۔ اس جلسے میں مختلف میدانوں سے وابستہ اہم افراد بڑی تعداد میں موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 نومبر 2024

ڈاکٹر عظیم راہی

اورنگ آباد: مرین لائنس ممبئی میں ایک باوقار تقریب میں من جانب اسباق پبلی کیشن پونہ، معروف

افسانہ وافسانچہ نگار ڈاکٹر عظیم راہی کو اُن کی ادبی خدمات کے اعتراف میں مناظر عاشق ہرگانوی قومی ایوارڈ (2023) حافظ ولی احمد خان (پروگرام کنوینر) کے ہاتھوں دیا گیا۔ یہ تقریب خورنگ فاؤنڈیشن اور وریٰ انجینیرس (احمد آباد) کے تعاون سے 2 نومبر 2024 کو منعقد کی گئی تھی۔ ڈاکٹر عظیم راہی کو اس سے قبل کئی انعامات و اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ اب تک اُن کی پندرہ کتابیں چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہیں اور تقریباً بارہ کتابیں زیر ترتیب ہیں۔ اس تقریب میں تعلیم اور ادب دونوں ہی میدانوں میں اعلیٰ پیمانے پر خدمات انجام دے رہی معزز شخصیات کو قومی سطح کے ایوارڈ برائے سال 24-2023 تفویض کیے گئے۔ اس ایوارڈ تقریب کی صدارت محترم فیروز کمال (جبل پور) نے کی۔ اس تقریب میں ڈاکٹر شیخ عبداللہ، محترم قمر صدیقی، محترم رفیق شیخ اور محترم سلیم الواری (ممبئی) بحیثیت مہمانان خصوصی شریک تھے۔ دیگر ادبی ایوارڈ یافتگان میں ڈاکٹر غضنفر اقبال (گلبرگہ)، ڈاکٹر محمد خلیل الدین صدیقی (لاتور)، اشتیاق سعید (ممبئی)، ڈاکٹر سیدہ تبسم منظور ناڈکر (ممبئی)، ادھومہاجن بسمل (پونہ)، ڈاکٹر مہرافروز (دھارواڑ کرناٹک)، ڈاکٹر اشفاق عمر (مالیگاؤں) اور مشیر احمد انصاری (ممبئی) بھی شامل ہیں۔

رپورٹ: محمد تفہیم الدین، اورنگ آباد، 11 نومبر 2024

عالمی یوم اردو پر جلسہ تقسیم ایوارڈ و مذاکرے کا اہتمام

نئی دہلی: شاعر مشرق علامہ اقبال کے یوم پیدائش کی مناسبت سے غالب اکیڈمی میں جلسۂ تقریب ایوارڈز اور مذاکرہ بعنوان 'اردو تعلیم کی اہمیت وافادیت' منعقد ہوا۔ یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا اور اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے زیر اہتمام منعقد تقریب کی صدارت ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق نے کی۔ مہمانان کے دست مبارک سے 'مولانا امداد صابری' کی حیات و خدمات پر مشتمل یادگاری مجلّہ کا اجرا عمل میں آیا۔ پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج ہم علامہ ڈاکٹر اقبال کے یوم پیدائش پر عالمی یوم اردو منا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جس کثرت سے آج اقبال کو پڑھا جاتا ہے کسی دوسرے شاعر کو نہیں پڑھا جاتا۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے صدر ڈاکٹر سید احمد خاں نے کہا کہ آج سے 27 سال قبل ہم نے علامہ اقبال کے یوم پیدائش 9 نومبر کو عالمی یوم اردو منانے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس سے یہ فائدہ ہوا کہ آج پوری دنیا میں جہاں کہیں بھی اردو سے محبت کرنے والے افراد موجود ہیں وہ اپنے اپنے طور پر اردو کی بزم سجاتے ہیں۔ سینئر صحافی معصوم مرادآبادی نے کہا کہ عالمی یوم اردو کی تقریب ہر سال منعقد کی جاتی ہے، اس کے بانی ڈاکٹر سید احمد خاں ہیں جنھوں نے 27 سال پہلے یہ سلسلہ شروع کیا تھا جو بڑھ کر آج پورے ہندوستان میں اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں ہر سال علامہ اقبال کے یوم پیدائش پر یوم اردو کے طور پر منایا جاتا ہے۔

سینئر صحافی سہیل انجم نے کہا کہ اردو زبان مسلمانوں کی زبان نہیں بلکہ یہ خالص ہندوستانی زبان اور تمام مذاہب کے ماننے والوں کی زبان ہے۔ دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول، شاہی عیدگاہ متھرا کی منتظمہ کمیٹی کے صدر ڈاکٹر زید حسن، ڈاکٹر عبیداللہ چودھری، مولانا آزاد جھنڈانگری، عبدالحیٰ خان گیاوی وغیرہ نے بھی اس موقعے پر اظہار خیال کیا۔ اس موقعے پر مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ افراد کو اردو زبان وادب کی خدمت کے اعتراف میں ایوارڈز سے سرفراز کیا گیا۔ جلسہ میں مختلف ریاستوں سے آئے افراد کو اردو کی خدمات کے اعتراف میں سند اعزاز اور مومنٹو سے سرفراز کیا گیا۔ نظامت صحافی محمد احمد نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 نومبر 2024

حلیمہ فردوس کو محبِ اردو کارنامہ حیات ایوارڈ

گلبرگہ: ڈاکٹر حلیمہ فردوس کو محبِ اردو کارنامہ حیات ایوارڈ برائے سال 2024 تفویض کیے جانے کی خوشی میں مشہور ادبی تنظیم محفل نسا شاخ گلبرگہ کی جانب سے

3 نومبر 2024 کو گلبرگہ میں تہنیت پیش کی گئی۔ محترمہ کنیز فاطمہ، ایم ایل اے گلبرگہ (شمال) نے تہنیت پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر حلیمہ فردوس کی گوناگوں خدمات کو سراہا۔ اس تہنیتی جلسے میں محفل نساء شاخ گلبرگہ کی صدر ڈاکٹر شمیم ثریا اور معتمد ڈاکٹر کوثر پروین نے حلیمہ فردوس کی شخصیت اور ادبی کاموں کے بارے میں تفصیل سے اظہار خیال کیا۔ حال ہی میں محبانِ اردو گلبرگہ، تنظیم برائے فروغ اردو زبان وادب نے ڈاکٹر حلیمہ فردوس کی علمی، ادبی، تعلیمی اور تدریسی خدمات کے اعتراف میں انھیں 'محبِ اردو کارنامہ حیات ایوارڈ برائے سال 2024' سے نوازا۔ اس پرمسرت موقعے پر شعبہ تعلیم نسواں، مانو، حیدرآباد کی صدر ڈاکٹر آمنہ تحسین کے ہاتھوں حلیمہ فردوس کے خاکوں کی کتاب 'اجالے یادوں کے' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس کے علاوہ معروف ادیب ڈاکٹر محمد اسد اللہ نے حلیمہ فردوس کے بڑے بھائی، شاعر و نقاد مرحوم خالد سعید کی بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کی کتاب 'تارا تارا نظمیں' کا اجرا انجام دیا۔ ان دونوں جلسوں میں گلبرگہ شہر کے عمائدین، ادیب، شاعر اور صحافیوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

رپورٹ: معتمد محفل نساء شاخ گلبرگہ، 14 نومبر 2024

رسم اجرا

اردو تحقیق وتنقید کے حوالے سے

نئی دہلی: تحقیق کے لیے خون جگر صرف کرنا پڑتا ہے اور ڈاکٹر صفیر اشرف کی تازہ کتاب 'اردو تنقید و تحقیق کے حوالے سے' کا مطالعہ اس بات کو محسوس کراتا ہے کہ ابھی ہمارے یہاں ایسے لوگ موجود ہیں جو تحقیق کے لیے خونِ جگر صرف کر رہے ہیں۔ ان خیالات کا

اظہار ملی ماڈل اسکول، ابوالفضل انکلیو میں منعقد رسم اجرا کی تقریب کی صدارت کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سینئر استاذ پروفیسر ندیم احمد نے کیا۔ معروف ناقد جناب حقانی القاسمی نے تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر صغیر اشرف ہندی اور اردو میں تواتر کے ساتھ لکھنے کی وجہ سے ذولسانی فنکار کی حیثیت سے معروف ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ لسانی تکثیریت کا عہد ہے اور مستقبل کثیر لسانیت کا ہی ہے۔ آج کا عہد ایسا ہے کہ اگر فنکار ایک سے زائد زبانوں کا ماہر نہیں ہے تو ان کا تحقیق وتصنیف کے میدان میں بہت آگے تک نہیں جانا ممکن نہیں۔

تعارفی کلمات ڈاکٹر خان محمد رضوان نے پیش کیا۔ تمام مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے ڈاکٹر خان محمد رضوان نے کہا کہ ڈاکٹر صغیر اشرف کی کتاب کی رسم اجرا کی تقریب میں آپ معززین کی شرکت نہ صرف ہماری حوصلہ افزائی کا باعث ہے بلکہ ہمیں یہ یقین بھی دلاتی ہے کہ کسی نفیس انسان کے کاموں کے تعارف کے لیے جب پیش قدمی کی جاتی ہے تو پڑھے لکھے لوگوں کا تعاون ملنا کوئی مشکل نہیں۔ ڈاکٹر صغیر اشرف اتراکھنڈ کے پہاڑوں میں اردو تحقیق وتنقید کی شمع جلائے ہوئے ہیں، ایسے میں ان کے اکتسابات سے اردو دنیا کو متعارف کرانا ہم سب کی ذمیداری ہے۔ ڈاکٹر محمد ریحان جو فرنچ ایکسپرٹ کی بیٹا میں کام کر رہے ہیں انھوں نے اپنے مقالہ میں کہا کہ ڈاکٹر صغیر اشرف صاحب کا جو بھی تخلیقی سرمایہ ہے وہ فطرت کی آواز کو غور سے سننے کا نتیجہ ہے۔ تخلیقی ذہن ویسے تو خدا دیتا ہے مگر ڈاکٹر صغیر اشرف کی تخلیقیت کو پروان چڑھانے میں اتراکھنڈ کے قدرتی مناظر کا بھی اہم رول رہا ہے۔ ان کی نظم 'شام نینی تال' کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے جو فکری وفنی پختگی کی حامل ہے۔ انھوں نے کتاب کا تنقیدی جائزہ بھی لیا اور کئی مفید مشورے مصنف کو دیئے۔ صدر شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی ڈاکٹر امتیاز وحید نے کہا کہ ڈاکٹر صغیر اشرف کے کاموں سے عرصے سے واقف ہوں، اس بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ صغیر نام سے ہیں لیکن کام سے کبیر ہیں۔ ان کے علاوہ جناب عشرت ظہیر (معروف فکشن تخلیق کار)، سید ریاض حسین (منیجر، سینٹ رومی پبلک اسکول، رام نگر، اتراکھنڈ)، ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا (ہمہ جہت شخصیت اور فکشن تخلیق کار) معروف صحافی ڈاکٹر شکیل اختر (ریڈیو جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے بھی تقریب سے خطاب کیا۔ ڈاکٹر صغیر اشرف نے اپنے تخلیقی وتحقیقی سفر کا تفصیل سے ذکر کیا۔ نظامت کی ذمے داری جناب حامد علی اختر (ایڈیٹر ماہنامہ صلاح کار) نے بحسن وخوبی انجام دیا۔

قندیل آن لائن ڈاٹ کام، 21 نومبر 2024

کوثر مظہری: اسرار و آثار

نئی دہلی: پروفیسر کوثر مظہری سے میرا رشتہ فکر ونظر ہی نہیں بلکہ مٹی کا بھی ہے۔ علم وادب کے آسمان پر ان

کی تابانی اور بلندی سے مجھے فطری خوشی اور فخر کا احساس ہوتا ہے، کیونکہ ان کا تعلق میری مٹی اور میرے گاؤں سے ہے۔ ان خیالات کا اظہار غالب اکیڈمی، نئی دہلی کے زیر اہتمام ڈاکٹر مشتاق صدف کی مرتبہ کتاب 'کوثر مظہری: اسرار وآثار' کی تقریب رسم اجرا میں وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر مظہر آصف نے بحیثیت مہمان خصوصی کیا۔ صدارتی خطاب کرتے ہوئے بزرگ ادیب وشاعر اور سابق وائس چیئرمین دہلی اردو اکادمی پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ ڈاکٹر مشتاق صدف نے پروفیسر کوثر مظہری کی شخصیت اور خدمات پر یہ اہم کتاب مرتب کر کے اردو دنیا اور بالخصوص ہم جامعہ والوں کو ایک بیش قیمت تحفے سے نوازا ہے۔ اس کے لیے ہم ان کے ہمیشہ احسان مند رہیں گے۔ مہمان اعزازی سابق چیئرمین سی آئی ایل، جے این یو اور معروف ادیب پروفیسر انور پاشا نے کہا کہ پروفیسر کوثر مظہری کی شخصیت اقبال کے اس شعر کی مصداق ہے کہ 'آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی/ اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی'۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر کوثر مظہری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ خود بھی اختلاف کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اختلاف کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ سابق صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور مشہور ادیب پروفیسر شہزاد انجم نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر کوثر مظہری کی شخصیت اور تحریر دونوں ہی بے لاگ اور بے باک ہے۔ ان کا دائرہ شاعری، فکشن تحقیق اور تنقید پر محیط ہے۔ عہد حاضر کے ممتاز فکشن نگار پروفیسر خالد جاوید نے پروفیسر کوثر مظہری کو مزاحمت، بغاوت اور صداقت پسندی کا استعارہ قرار دیا۔ صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی اور معروف نقاد پروفیسر ابوبکر عباد نے کہا کہ کوثر مظہری کی تحریر ان کی شخصیت ہی کا آئینہ ہے۔ وہ اپنی تخلیق، تنقید اور تحقیق کو مذہب، اخلاق اور تہذیبی اقدار کے محور سے وابستہ رکھتے ہیں۔ پروفیسر کوثر مظہری کے صاحبزادے نوجوان عالم دین مولانا سعد اللہ احسان ندوی نے پروفیسر کوثر مظہری کی شخصیت اور ان کے طریقۂ تربیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ہمیں مقلد محض بنانے کے بجائے ہمارے علمی وتنقیدی شعور کی افزائش کی ہے۔ بزرگ شاعر متین امروہوی نے اس موقعے پر پروفیسر کوثر مظہری کی خدمت میں تہنیتی قطعہ بھی پیش کیا۔

صاحب کتاب ڈاکٹر مشتاق صف نے کتاب کے مشمولات کا تعارف پیش کرتے ہوئے اس کی ضرورت واہمیت پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر کوثر مظہری نے اپنے اعزاز میں منعقد کی گئی اس تقریب کے لیے اظہار

تشکر کرتے ہوئے اسے اپنی زندگی کا ایک جذباتی، یادگار اور ناقابل فراموش لمحہ قرار دیا۔ بزرگ شاعر متین امروہوی نے اس موقعے پر پروفیسر کوثر مظہری کی خدمات میں تہنیتی قطعہ پیش کیا۔ واضح رہے کہ اس کتاب میں درجنوں موقر ادیبوں کے مفصل مضامین کے ساتھ اس میں کئی مشاہیر کے افکار اور تاثرات بھی موجود ہیں، اس تقریب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، جے این یو اور ڈی یو سمیت دہلی کے معزز ادیب، شعرا اور اسکالرز موجود تھے۔

قندیل آن لائن ڈاٹ کام و روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 نومبر 2024

تشبیہ

بزم اردو دبئی، نیوز ڈیسک: متحدہ عرب امارات کی ریاست شارجہ میں رواں برس منعقد ہونے والے

43 ویں عالمی کتاب میلے میں بزم اردو دبئی کے زیر اہتمام شام ظریفانہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ یہ تقریب دو حصوں پر مشتمل تھی۔ پہلے حصے میں امارات میں مقیم شاعر عدنان منور کے پہلے شعری مجموعہ 'تشبیہ' کا اجرا ہوا۔ کتاب پر بات کرنے کے لیے معروف مزاحیہ شاعر ڈاکٹر خالد مسعود خان، علی زیرک اور سید اعجاز شاہین کو بالخصوص مدعو کیا گیا۔ دوسرے حصے میں ڈاکٹر خالد مسعود اور احمد سعید کی مزاحیہ شاعری کے ساتھ علی زیرک اور عدنان منور نے سنجیدہ شاعری پیش کی۔ تقریب کی نظامت شاداب الفت نے کی۔

روزنامہ 'تاثیر' دہلی، 12 نومبر 2024

آبروئے غزل

نئی دھلی: مشہور شاعرہ ڈاکٹر انا دہلوی کے چھٹے شعری مجموعے 'آبروئے غزل' کا اجرا انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے وسیع ہال میں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر امریکہ کی یونیورسٹی کی طرف سے سرکردہ شخصیات کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری تفویض کی گئی بعد ازاں مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں مشاہیر شعرائے کرام نے اپنے کلام سے سامعین کو مسحور کیا۔ کل ہند مشاعرے میں ڈاکٹر انا دہلوی کے شعری مجموعے 'آبروئے غزل' کا اجرا اردو اکیڈمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول کے ہاتھوں میں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ انا دہلوی کی شاعری دہلوی دبستان کی ترجمان، جدیدیت کی علمبردار اور نسائی لہجے کے لیے اپنی انوکھی انفرادیت کی حامل ہے۔ حاجی مہربان قریشی نے کہا کہ ایسے پروگراموں سے نہ صرف اردو زبان کو فروغ ملتا ہے بلکہ معاشرے میں فاصلے بھی کم ہوتے ہیں۔ سابق چیئرمین دہلی اقلیتی کمیشن ذاکر خان نے کہا کہ انا دہلوی کی شاعری دلوں میں اترتی ہے اور زندگی بھر کے لیے ان کے اشعار یاد رہ جاتے ہیں۔ مشاعرے میں منیر ہمدم، واصف فاروقی، پروفیسر شہپر رسول، فاروق جائسی، ڈاکٹر انا دہلوی، شفیق عابدی، نعیم راشد برہانپوری، سید نظم اقبال، حامد بھساولی، شاہد انجم، رحمان مصور، ارشد ندیم، روشن نظامی، ناصر فراز، رستم الہ آبادی، شریف شہباز، وکاس سہائے ابراہیم جے پوریا، امیر امروہوی، دانش ایوبی وغیرہ نے اپنے کلام پیش کیے۔ اس موقعے پر یو این آئی امریکہ ایگل کی جانب سے امیر امروہوی کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک سرٹیفکیٹ سے بھی نوازا گیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 23 نومبر 2024

آولِ احساس

سرینگر: سمبل باڈی پورہ کے سوناواری حلقے کی ایک سرکردہ ادبی تنظیم کلچر اینڈ سائنس فاؤنڈیشن نے گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول سمبل میں ادیب، شاعر، اور معروف براڈ کاسٹر سید عابد حسین گوہر کے شعری مجموعے 'آولِ احساس' کی رسم رونمائی انجام دی۔ سید عابد حسین گوہر کی تازہ اور تیسری تصنیف 'آولِ احساس' نعت، منقبت، اور نوحہ جیسے منظوم کلام کا مجموعہ ہے۔ کفایت فہیم نے کتاب میں رقم ایک مدح کو اپنی پیاری آواز میں پیش کیا۔ سائنس اینڈ کلچر فاؤنڈیشن کے صدر شہباز ہاکباری نے کتاب کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے اس کی فنی گہرائی، روحانی اہمیت اور ادبی خوبیوں کو اجاگر کیا۔ ایوان صدارت نے مصنف کی ہمہ جہت شخصیت کا اعتراف کرتے ہوئے، ان کی تازہ تصنیف کی ستائش کی۔ اپنے خطاب میں سید عابد حسین گوہر نے تقریب کے انعقاد پر کلچر اینڈ سائنس فاؤنڈیشن کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے 'آول احساس' لکھنے کی تحریک اور شاعری کے ذریعے روحانی روابط کو پروان چڑھانے کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ تقریب میں چند مقالات بھی پڑھے گئے اور آخر میں ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی نظامت سائنس اینڈ کلچر فاؤنڈیشن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر علی محمد نشتر نے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 29 نومبر 2024

ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کی چار کتابوں کا اجرا

نئی دھلی: لودھی روڈ کے آئی آئی ایل ایم میں منعقد ایک پروقار تقریب میں معروف مصنفہ ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کی ایک ساتھ چار کتابوں کا اجرا ممتاز شخصیات کے

ہاتھوں عمل میں آیا۔ تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے سابق چیف الیکشن کمشنر ایس وائی قریشی نے شرکت کی۔ انھوں نے اس امر پر خوشی کا اظہار کیا کہ ان کی ایک ساتھ چار کتابوں کا یہاں اجرا عمل میں آیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج ہم سب کو یہاں سے جانے سے پہلے ایک ریزولیوشن پاس کر کے جانا چاہیے کہ ہم اپنے گھروں میں اردو کا ایک اخبار ضرور لگوائیں گے۔ بتا دیں کہ آج کی اس تقریب میں ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کی جن چار کتابوں کا اجرا عمل میں آیا ان میں لفظوں کے پیچھے چھپی تہذیب، افسانوی مجموعہ اب کے برس اور دیگر افسانے، سفرنامہ، خواب منظر اور بچوں کے لیے لکھے گئے افسانے، پرانے زمانے کی نئی کہانیاں، کتابیں شامل ہیں۔

سپریم کورٹ آف انڈیا کے سابق جج جسٹس آفتاب عالم نے کہا کہ ڈاکٹر نعیمہ کی کتاب لفظوں کے پیچھے چھپی تہذیب میں ایک موضوع زیورات کا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر نعیمہ کے کئی افسانوں کا بھی ذکر کیا اور ان کی تعریف کی۔ پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ یہ بڑی ہمت کی بات ہے کہ آج ڈاکٹر نعیمہ نے چار کتابوں کا

اجرا کروایا ہے۔ ان کی ایک کتاب لفظوں کے پیچھے چھپی تہذیب بڑی اہم کتاب ہے، میں نے آج تک اردو میں ایسی کتاب نہیں دیکھی، اس کے لیے میں ان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ خواجہ محمد شاہد، ندیم شاہ، حسیب احمد اور دیگر مقررین نے بھی نعیمہ جعفری پاشا کی کتابوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھیں ادبی سرمایہ قرار دیا۔ تقریب کے دوران نعیمہ جعفری پاشا کی بیٹی سیمی جعفری پاشا نے کتابوں کے حوالے سے ان کا انٹرویو لیا۔ مہمان مقررین نے اس منفرد انٹرویو کی بھی تعریف کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 دسمبر 2024

شاہد عادل کی دو کتابوں کا اجرا

ارریہ: شاہد عادل کی تصنیف گشت برگشت نیز بام و در کی تقریب اجرا سے خطاب کرتے ہوئے مولانا محمد

شمشاد رحمانی نے کہا کہ مولانا شاہد عادل قاسمی نے مسافت محنت سے طے کی ہے۔ وہ مثبت لکھنے کے عادی ہیں۔ عام طور پہ آج کل منفی تحریر قبول کی جاتی ہے پڑھی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جو انسان سچا ہوتا ہے وہ حق کہنے سے پیچھے نہیں ہٹتا ہے۔ مہمان خصوصی پروفیسر صفدر امام قادری نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہا کہ سیمانچل بطور خاص ارریہ کے بارے میں کسی نے سوچا بھی نہیں کہ یہاں تعلیمی ادارے کھولے جائیں مگر حالات بدلے ہیں، اب ایک نہیں دو کتابوں کا اجرا ہو رہا ہے۔ یہ نئے دور کا اشاریہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا شاہد عادل قاسمی کی تحریر میں روانی ہے۔ انجمن سوشیو لٹریری سوسائٹی ارریہ کے زیر اہتمام منعقدہ تقریب میں خطبہ استقبالیہ مولانا شاہد عادل قاسمی نے پیش کیا جس میں انھوں نے مہمانان کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ میرے لیے فرحت و انبساط کا موقع ہے کہ اس تقریب میں ریاست اور بیرون ریاست سے اہل علم حضرات شریک ہو رہے ہیں۔ انجمن کے سکریٹری اور معروف شاعر رضی احمد تنہا نے بھی مہمانان کا استقبال کیا۔ قبل ازیں مدعوئین خصوصی معروف افسانہ نگار مشتاق احمد نوری، ڈاکٹر نور اسلام علیگ، ڈاکٹر مجاہد حسین، صحافی عارف اقبال، طیب فرقانی، جہانگیر نایاب، مرالزماں، صحافی شہنواز بدر، سابق ایم پی سرفراز عالم، سابق وزیر شہنواز عالم، مرشد عالم، شبیر عالم، مہتاب عالم، نوشاد عالم، مفتی ہمایوں اقبال، مفتی انعام الباری، سینئر صحافی پرویز اعلم، مفتی محمد عتیق اللہ رحمانی، پروفیسر رفیع حیدر انجم، قاری نیاز احمد قاسمی، مولانا جسیم الدین حسامی، شکیب ارسلان، رہبان علی راکیش، رضی احمد، فیصل جاوید اور ڈاکٹر اشتیاق عالم سمیت متعدد ذی علم شخصیات نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور سفرنامہ کی اشاعت پر مصنف کو مبارکباد پیش کی۔ تقریب کی نظامت صحافی عبدالواحد رحمانی اور مشیر عالم نے مشترکہ طور پہ انجام دی مفتی شبیر عالم کے اظہار تشکر پہ تقریب کا اختتام پذیر ہوا۔ اس موقعے پر شہر کے سیاسی اور سماجی شخصیات کثیر تعداد میں موجود تھی۔

پریس ریلیز: عبدالغنی لبیب، ارریہ، 5 دسمبر 2024

وفیات

استاد ذاکر حسین

نئی دہلی: مشہور طبلہ نواز استاد ذاکر حسین کا 15 دسمبر بروز اتوار دل کا دورہ پڑنے سے امریکہ میں انتقال ہوگیا۔ انھیں

سان فرانسسکو کے ایک ہسپتال کے آئی سی یو میں داخل کرایا گیا تھا۔ ان کی موت کی تصدیق ان کے دوست بانسری نواز راکیش چورسیا نے کی۔ مرحوم کے قریبی ذرائع کے مطابق 73 سالہ ذاکر حسین کو بلڈ پریشر کا مسئلہ تھا اور ایک ہفتہ قبل انھیں دل کی تکلیف کی وجہ سے ہسپتال منتقل کیا گیا تھا۔ واضح رہے کہ ذاکر حسین کے والد استاد اللہ رکھا بھی ایک مشہور طبلہ نواز تھے۔ استاد ذاکر حسین 1951 میں مہاراشٹر کے دارالحکومت ممبئی میں پیدا ہوئے۔ ان کا شمار دنیا کے عظیم طبلہ نوازوں میں ہوتا ہے۔ انھیں 1988 میں پدم شری، 2002 میں پدم بھوشن اور 2023 میں پدم وبھوشن سے نوازا گیا۔ 1999 میں انھیں 'یو ایس نیشنل انڈومنٹ فار دی آرٹس' کی جانب سے نیشنل ہیریٹیج فیلوشپ سے بھی نوازا گیا، اس کے بعد انھیں ہندوستانی کلاسیکی کی موسیقی کا عالمی سفیر تسلیم کیا گیا۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ استاد ذاکر حسین پہلے ہندوستانی موسیقار تھے جنھیں امریکہ کے سابق صدر براک اوباما نے وہائٹ ہاؤس میں 'آل- اسٹار گلوبل کنسرٹ' میں شرکت کے لیے مدعو کیا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 دسمبر 2024

قطب اللہ

لکھنؤ/سدھارتھ نگر: سینئر صحافی قطب اللہ کا ایرا میڈیکل کالج میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 73 برس تھی۔ چند دنوں قبل انھیں برین ہیمریج ہونے کے بعد

میکس ہسپتال میں داخل کرایا گیا تھا، بعد میں انھیں ایرا میڈیکل کالج میں داخل کرایا گیا، جہاں انھوں نے آج آخری سانسیں لیں۔ ان کے انتقال کی خبر ملتے ہی شہر لکھنؤ میں سوگ کی لہر دوڑ گئی۔ متعدد شعبۂ حیات سے متعلق شخصیات نے ان کے لیے تعزیت پیش کیا۔ انتقال کے بعد متعلقین ان کو ان کے آبائی وطن موضع دودھونیا ضلع سدھارتھ نگر لے گئے، جہاں دیر شب ان کی تدفین عمل میں آئی، جس میں علاقہ کے اہل علم اور دیگر افراد کے علاوہ شہر لکھنؤ سے بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ مرحوم قطب اللہ کا تعلق سدھارتھ نگر کے علمی و دینی گھرانے سے تھا۔ ان کی پیدائش 23 مارچ 1951 کو ہوئی۔ ان کے والد مولانا محبت اللہ اردو کے صحافی، محقق، مصنف، مترجم، ادیب اور افسانہ نگار تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد لکھنؤ منتقل ہوئے اور دارالعلوم ندوۃ العلما سے 1970 میں

فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد 1974 میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے اور 1976 میں ایم اے اردو کیا۔ مرحوم کی صحافتی زندگی کی شروعات 1974 میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے کرنے کے بعد ہوگئی تھی۔ روزنامہ 'قومی آواز' کے ادارتی ممبران میں شامل کر لیے گئے۔ 1975 میں باضابطہ سب ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ 1998 میں روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' لکھنؤ کے پہلے چیف سب ایڈیٹر منتخب ہوئے۔ سہارا کے دیگر ایڈیشن نکالنے میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا۔ پٹنہ اور کولکاتا میں عرصے تک صحافتی خدمات انجام دیں اور 2012 میں گورکھپور ایڈیشن کے ایڈیٹوریل انچارج رہتے ہوئے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد کئی دیگر اخبارات سے بھی منسلک رہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 دسمبر 2024

گیان چند کیتھ

نئی دہلی: اردو زبان وادب پر فریفتہ و اردو کے عاشق گیان چند کیتھ کا 85 برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ شری گردھاری لال کیتھ کے گھر دہلی میں 3 جون 1939 کو پیدا ہوئے گیان چند کیتھ نے بذریعہ اردو تعلیم پائی اور اردو مضمون سے ہی ایم اے کی سند دہلی یونیورسٹی آف دہلی سے حاصل کی۔

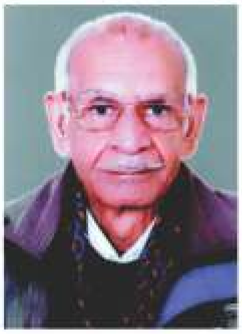

آپ کی تصانیف میں افسانوی مجموعہ 'درد کے سائے' قابل ذکر ہے، جس کی اشاعت حالی پبلشنگ ہاؤس لکشمی نگر دہلی سے ہوئی۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ اور مغربی بنگال اردو اکادمی کا مولانا محمد علی جوہر ایوارڈ برائے سال 2019 ملا۔ للیتا پارک لکشمی نگر دہلی میں رہائش پذیر گیان چند کیتھ کا اردو زبان اوڑھنا بچھونا تھی۔ اقلیتوں اور سماج کے پچھڑے لوگوں میں تعلیم کو فروغ دینے اور اس کے حصول کے لیے خود کو وقف کرنے کے ساتھ ساتھ، فکشن (ادب) صحافت کے ذریعے سماجی شعبوں میں سرگرم عمل رہے۔ گیان چند کیتھ کی دیگر غیر مطبوعہ تصانیف میں برف کے آنسو، موت کی دلہن قابل ذکر ہے۔ پسماندگان میں ایک بیٹا ایک بیٹی اور اہلیہ ہیں۔ گھر میں اردو زبان لکھنے پڑھنے کا چلن چھوڑ کر جانے والے کیتھ کی پوتی اردو زبان کی دلدادہ ہے۔ گیتا کالونی شمشان گھاٹ پر ان کی آخری رسم ادا ہوئی۔

پریس ریلیز: صدائے انصاری، دہلی، 13 نومبر 2024

بلراج بخشی

جموں کشمیر: نامور ادیب، شاعر، محقق اور نقاد بلراج بخشی 29 نومبر 2024 کو اپنے گھر ادھرش کالونی، اُدھم پور میں اس دار فانی سے رخصت ہوگئے۔ وہ چند برسوں سے پھیپھڑے کی بیماری میں مبتلا تھے۔ ان کی پیدائش 10 دسمبر

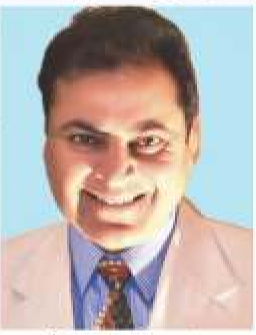

1949 کو ہوئی۔ بلراج بخشی کا اصل نام بلراج کمار بخشی تھا لیکن بلراج بخشی کے قلمی نام سے مشہور ہوئے۔ شاعری، افسانہ نگاری اور تحقیق وتنقید کے علاوہ صحافتی خدمات کے حوالے سے ان کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ شاعری میں وہ جدید رُجحان کے حامل تھے، نِت نئے موضوعات شامل کرنا ان کی شعر گوئی کی خوبی تھی۔ ان کے افسانوی مجموعہ 'ایک بوند زندگی' (2014) میں ایسے کئی افسانے ہیں جن کو بلراج بخشی سے پہلے کسی اور نے نہیں چھوا تھا۔

بنیادی طور پر بلراج بخشی ایک ایسے ادیب تھے جن کی علمی اور ادبی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ انھوں نے 'آسانیات' (2020-2021) کے عنوان سے دو جلدوں میں ایک غیر روایتی لغت بھی لکھی ہے۔ جس میں آج کے زمانے میں استعمال ہونے والے بعض کلیدی الفاظ، تراکیب اور اصطلاحات کی آسان لفظوں میں معنی ومفہوم کے ساتھ وضاحت کی گئی ہے۔

بلراج بخشی عرصہ قبل سے ایک ادبی رسالہ 'زبان وبیان' بھی شائع کر رہے تھے لیکن اپنی بیماری کی وجہ سے وہ یہ رسالہ جاری نہ رکھ سکے۔ ان کا تازہ ترین شعری مجموعہ 'مٹی کے موسم' کے نام سے 2021 میں منظر عام پر آیا۔ ان کے انتقال پر اردو ادب کی مختلف تنظیموں سے خراج خراج عقیدت پیش کیا۔

ڈاکٹر جگ موہن سنگھ، جموں کی تحریر سے ماخوذ

عبدالقدیر

نئی دہلی: معروف خطاط استاد عبدالقدیر کا انتقال ہوگیا۔ ان کی اچانک موت سے انٹرنیشنل نور مائکرو فلم سینٹر، ایران کلچر ہاؤس نے رنج وغم کا اظہار کیا۔ عبدالقدیر 2005 سے انٹرنیشنل نور مائکرو فلم سینٹر کے ساتھ جڑے ہوئے تھے

اور اس سینٹر کی اسلامی آرٹ ورکشاپ میں کتاب 'صحیفہ سجادیہ' کی کتابت اور متعدد نسب نامے لکھے، ان کے دیگر آثار میں 125 مختلف رسم الخط کے ساتھ نادعلی شریف، حضرت علی کے نام سیکڑوں پھولوں اور رسم الخط کی صورت میں، کتبوں پر قرآن مجید کی خط ثلث میں کتابت 500 بسم اللہ اور درود شریف مختلف کوفی رسم الخط کا ذکر کر سکتے ہیں۔

سینٹر کے ڈائرکٹر ڈاکٹر مہدی خواجہ پیری نے استاد الخطاط عبدالقدیر مرحوم کے انتقال پر پسماندگان سے تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ مرحوم نے طویل عرصے تک انٹرنیشنل نور مائکرو فلم سینٹر کی اسلامک آرٹس ورکشاپ میں اپنے خطاطی کے جوہر دکھائے۔ وہ ہندوستانی خطاطوں کی آخری نسل میں سے ایک تھے جنھوں نے فارسی نویسندوں اور قرآن مجید کے کاتبوں سے خطاطی سیکھی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 نومبر 2024

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

کشاف اصطلاحات ادبیات (جلد اول)

مصنف: عتیق اللہ

پہلی اشاعت: 2024

صفحات: 627+26

قیمت: 340 روپے

کشاف اصطلاحات ادبیات (دوم)

مصنف: عتیق اللہ

پہلی اشاعت: 2024

صفحات: 644+23

قیمت: 340 روپے

کشاف اصطلاحات ادبیات (سوم)

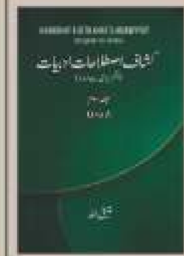

مصنف: عتیق اللہ

پہلی اشاعت: 2024

صفحات: 355+21

قیمت: 235 روپے

باقیات شکیل الرحمٰن (جلد اوّل تا پنجم)

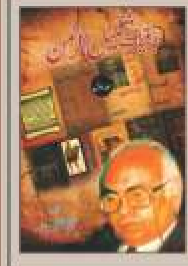

مرتب: شیخ عقیل احمد

پہلی اشاعت: 2024

صفحات: تقریباً 3400

قیمت: 2190 روپے (مکمل سیٹ)

نوم چامسکی

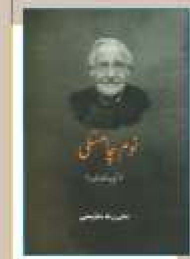

مصنف: علی رفاد فتیحی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 54

قیمت: 70 روپے

حالی کی غزلیں اور قطعات

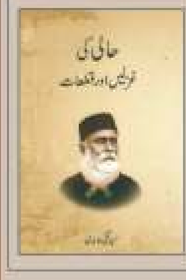

مرتب: سید تقی عابدی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 185+66

قیمت: 150 روپے

حالی کا سیاسی شعور

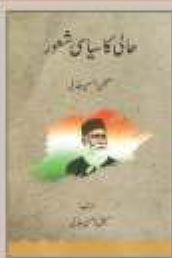

مصنف: معین احسن جذبی

مرتب: سہیل احسن جذبی

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 164، قیمت: 215 روپے

قدیم لکھنؤ کی آخری بہار

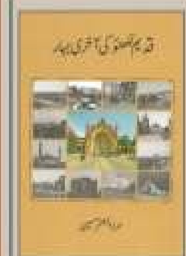

مصنف: مرزا جعفر حسین

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 671

قیمت: 355 روپے

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, जनवरी–2025,वर्ष:27, अंक:01
URDU DUNIYA Monthly, January-2025, Vol.27, Issue:01
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/12/2024
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in، پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at Salasar Imaging Systems, A-97, Sector-58 Noida-201301(UP)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6